خاص نمبر

جلد سوم

1857

36

سہ ماہی

تاریخ

ایڈیٹر: ڈاکٹر مبارک علی

مجلس مشاورت:

- [illegible] احمد
- [illegible]
- [illegible] احمد
- [illegible]
- [illegible] سہگل
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]

تقسیم کار:

سانجھ

Sanjh Publications

دوسری منزل، مفتی بلڈنگ،

17/31 ٹیمپل روڈ، لاہور

فون: 042-7355323

e-mail: sanjhpk@yahoo.com

خط و کتابت (برائے مضامین)

بلاک 1، اپارٹمنٹ ایف۔ برج کالونی، لاہور کینٹ

فون: 042-6665997

ای میل: mubarakali21@yahoo.com

قیمت فی شمارہ غیر مجلد: 130 روپے

قیمت فی شمارہ مجلد: 180 روپے

سرورق: عباس

پرنٹر: شرکت پریس

تاریخ اشاعت: اپریل 2008ء

فہرست

1857 کی تاریخ نویسی: ایک اجمالی جائزہ	ہما غفار	5
1857 کی جنگ آزادی۔ چند نظری پہلو	ڈاکٹر سید جعفر احمد	24
انیسویں صدی کے وسط میں برطانوی صورتِ حال	اشفاق سلیم مرزا	40
ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی اور مارکس	محمد ابوالفضل	47
1857: پاکستان کی درسی کتب میں	روبینہ سہگل	57
ایک تہذیب کی موت	ڈاکٹر مبارک علی	101
1857 کی جنگِ آزادی اور پنجاب	احمد سلیم	108
۱۸۵۷ کی عظیم بغاوت: کچھ افسردہ حقائق	گربچن چندن	129
۱۸۵۷ء کی ادبی اہمیت	محمد حسن	149
اردو ادب: جنگ آزادی 1857 کے سیاق میں	نریش ندیم	164
غالبؔ اور غدر	مسعود حسن شہابؔ	174
مولوی علاء الدین	سید داؤد اشرف	189

مولوی لیاقت علی	لئیق رضوی	195
طرّہ باز خاں	سید امتیاز الدین	201
شہزادہ فیروز شاہ	لطیف حسین ادیب	205
فتویٰ جہاد ۱۸۵۷ء	شاہد حسین خاں	211

خصوصی مقالہ

نوآبادیاتی ہندوستان میں جنگ، ہجرت اور بیگانگی: مظفر احمد کی تشکیل نو	سوچے تا چٹوپادھیا ترجمہ: ڈاکٹر صولت ناگی	214

۱۸۵۷ء کی تاریخ نویسی: ایک اجمالی جائزہ

ہما غفار

اٹھارہ سو ستاون کی بغاوت برصغیر کی تاریخ کا اہم ترین باب ہے اس سال ہونے والی برصغیر کی لوگوں کی بغاوت کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے استعماری ہتھکنڈوں اور غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف شدید احتجاج اور جدوجہد آزادی کی ابتدائی علامت کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ یہ بغاوت ۱۰ مئی کو میرٹھ کے فوجی کیمپ میں ان نئے کارتوسوں کے فوج میں متعارف ہونے پر شروع ہوئی جن کے بارے میں مشہور تھا کہ ان پر گائے یا سور کی چربی چڑھائی گئی ہے۔ یہ چیز مذہبی حوالے سے ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے ناقابل قبول تھی۔ جو بغاوت فوجی کیمپ سے شروع ہوئی وہ جلد ہی برصغیر کے بڑے علاقے میں پھیل گئی اور مختلف حلقے مذہبی، سیاسی، سماجی اور معاشی عوامل کی بناء پر باغیوں کے گروہ میں شامل ہوتے گئے۔ اسباب خواہ کچھ بھی ہوں ۱۹۵۷ء کی بغاوت بہرحال ایسٹ انڈیا کمپنی کے استعماری ہتھکنڈوں اور غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف شدید احتجاج تھی اس کو اگرچہ سپاہیوں کی بغاوت یا غدر کا نام دیا گیا لیکن برصغیر کے لوگوں کے لیے وہ جدوجہد آزادی کا ایک نشان بن گئی۔ آج جبکہ اسے گزرے ہوئے ڈیڑھ سو سال کا عرصہ گزر چکا ہے اس سے متعلق بنیادی مآخذ کی دریافت واستفادہ کا سلسلہ ہنوز جاری ہے اور ساتھ ہی نئے نظریات کی روشنی میں واقعات اور ان کے اسباب وعوامل، بغاوت کے مراکز کی علاقائی نوعیت اور جنگ میں مختلف شخصیات وطبقات اور گروہوں کے کردار کا تجزیہ نئے سرے سے کیا جارہا ہے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے حالات وواقعات اور اسباب وعوامل پر لکھنے کا سلسلہ بغاوت

کے ظہور کے ابتدائی سال میں ہی شروع ہوگیا تھا جو کہ پمفلٹ ، ذاتی ڈائریوں، یادداشتوں، خطوط، پارلیمانی ریکارڈ، سرکاری دستاویزات، اخبارات اور کتابوں کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ اس تاریخی ادب میں وقت کے ساتھ اضافہ ہوتا رہا اور نئے حوالوں سے تحقیق کا سلسلہ ہنوز جاری ہے جس کے نتیجے میں برطانوی استعماریت کے خلاف برصغیر کے لوگوں کی جدوجہد کے نئے پہلو سامنے آرہے ہیں۔ اس مقالہ میں اس وسیع تاریخی ادب سے تاریخ نویسی کے نمائندہ رجحانات کو جاننے کے لیے ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر خصوصیت سے لکھی جانے والی کتابوں سے انتخاب کیا گیا ہے۔ اگرچہ کہ اس بغاوت پر نہ صرف علیحدہ سے مقالات اور کتب لکھی گئیں بلکہ برصغیر کی جدید تاریخ پر لکھی گئی کتابوں میں اسے اہم ذیلی موضوع کی حیثیت حاصل ہے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے متعلق جو اولین تاریخی مواد و ادب سامنے آیا اس کی نوعیت فوری ردعمل کی تھی۔ اس کے لکھنے والے زیادہ تر انگریز فوجی، منتظمین اور وہ انگریز شہری تھے جو بغاوت کی تباہ کاریوں سے براہ راست متاثر ہوئے۔ تاہم ان میں ایک محدود طبقہ ان مقامی لوگوں کا بھی تھا جنہوں نے اپنے افسران کی ایما پر یا پھر ان کی خوشنودی کے لیے یا پھر ذاتی دلچسپی کے باعث ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر قلم اٹھایا۔ اس ادب کے خصوصیت سے دو پہلو تھے، ایک حالات و واقعات کا محققانہ جائزہ کے بجائے یک رخی تصویر پیش کرتا ہے اور ان میں انگریز نسلی برتری کا تصور نمایاں ہے ان تحریروں میں کہیں ہندوستانی باغیوں کے انگریزوں پر ظلم وستم کو مبالغہ آمیزی سے بیان کیا گیا ہے تو کہیں انگریز فوج کی کاروائیوں اور بغاوت کے خاتمے کے لیے کیے گئے انتہا پسندانہ اقدامات کو بڑھا چڑھا کر فخر سے کہ ان کے مطابق اس ناروا سلوک کے ہندوستانی وحشی اور بدمعاش حقدار تھے۔ اول الذکر کے مطالعہ سے برطانوی عوام میں برصغیر کے لوگوں کے بارے میں غم وغصہ، نفرت اور بدلہ کا احساس ابھرا اور موخر الذکر سے اپنی طاقت وقوت کا۔ تاہم چند انگریز فوجی اور منتظمین ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنی قوم کی زیادتیوں کو بھی قلمبند کیا اور اس پر تاسف کا اظہار بھی۔

دوسرا پہلو عکاسی کر رہا تھا اس تناؤ کی جو برطانوی حکومت اور ایسٹ انڈیا کمپنی میں پایا جارہا تھا اور نظریاتی رجحانات کی جو برطانوی طریقہ سیاست اور انتظامی حکمت عملی پر اثر انداز ہورہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں تمام تر نسلی برتری کے رویہ کے ساتھ انہوں نے مقامی لوگوں کو

تنقید کا نشانہ بنایا وہیں بغاوت کے اسباب کا تعین کرنے کی بھی کوشش کی اس ضمن میں مختلف حلقوں نے ایک دوسرے کی پالیسیوں کو موردالزام بھی ٹھہرایا۔ فوری طور پر جو پمفلٹ سامنے آئے ان میں لکھنے والوں کے اپنے مخصوص کلیہ تھے۔ فوج سے متعلقہ اشخاص نے بنگال رجیمنٹ میں پائی جانے والی کمزوریوں کو بنیاد بنایا جبکہ بنگال کے افسر کی رائے بمبئی کے افسر کی آراء سے مختلف تھی۔ انگلیلی (Evangelical) مذہبی حلقہ نے حکومت کے لادینی کردار کو بنیاد بناتے ہوئے بغاوت کی تباہ کاریوں کو خدا کا عذاب قرار دیا۔ کچھ نے حکومت کے حد سے بڑھتے کمرشل ازم کو جبکہ سیاستدانوں نے اس کا سبب حکومت کے Ultra Radical اقدامات کو قرار دیا۔[1] ایرک اسٹوکس (Eric Stokes) اس ضمن میں دو اور عوامل کی نشاندہی کرتا ہے ایک یہ کہ شہری منتظمین نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ذمہ داری فوجی انتظامیہ کی نااہلی پر ڈالی دوسرے یہ کہ کلکتہ کی یورپی مارکنٹائل برادری نے اس کا ذمہ دار وائسرے لارڈ کیننگ (Lord Canning) اور ان کے افسران کو ٹھہرایا جو اس حقیقت کا ادراک نہ کر سکے کہ ایک تباہ کن شہری بغاوت ان کے بہت قریب ہے۔[2] ۱۸۵۸ء میں جس پمفلٹ نے بغاوت کے عوامل پر روشنی ڈالی اور جسے اس وقت بہت مقبولیت حاصل ہوئی وہ Red Pamphlet ہے جسے The Mutiny of the Bengal Army کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہ پمفلٹ بغاوت پر لکھی جانے والے کتابوں کے مصنف جی بی میلسن (G.B. Malleson) نے فرض نام سے لکھا تھا۔ اس میں وائسرائے لارڈ کیننگ اور سابق وائسرے ڈلہوزی (Dalhausie) اور ان کے مشیروں پر کڑی تنقید کی گئی ہے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے حالات و واقعات کو محفوظ کرنے اس کا عمومی جائزہ لینے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے منتظمین پیش پیش تھے جن میں سب سے نمایاں حیثیت کی حامل دو شخصیات تھیں ایک جون ولیم کے (John William Kaye) اور جی بی میلسن۔ انہوں نے سرکاری دستاویزات کا مدد سے بہت تفصیل سے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے حالات و واقعات کو علاقہ تا علاقہ بیان کیا اور اسباب و نتائج پر تنقیدی روشنی ڈالنے کی بھی کوشش کی ہے جون کے کی کتاب The Sepoy War in India 1857-58 History of the (۱۸۷۰-۷۶) تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ اسی طرح میلسن کی کتاب بھی تین جلدوں میں History of the Indian

Mutiny 1857-58(۱۸۸۶ـ۷۹ء) کے عنوان سے شائع ہوئی۔ میلسن کا ایک اہم کام جون کے، کے جمع کردہ مواد کو مرتب کر کے چھ جلدوں میں شائع کرنا ہے یہ کتاب The History of Indian Mutiny (۱۸۸۰ـ۱۸۹۷ء) ہے۔ اسے ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر ایک مستند تاریخی کام سمجھا جاتا ہے۔ تاہم جون کے، کے یہاں نسل پرستانہ اور انگریزوں کی برتری کا تصور نظر آتا ہے۔ وہ واضح طور پر کہتا ہے کہ کوئی بھی بہادری کے کارناموں کو بیان کر کے اتنی خوشی محسوس نہیں کر سکتا جتنا کہ ان کتابوں کا لکھنے والا مصنف (جون کے)۔[۳] تاہم یاد رہے کہ جون کے اور میلسن دونوں کننگ اور دیگر برطانوی منتظمین کی پالیسیوں کو برصغیر کے لوگوں میں پیدا ہونے والی بے چینی اور عدم اطمینان کا باعث سمجھتے تھے یہاں تک کہ جون کے کے یہاں اس ضمن میں کاشتکاروں کے مسائل اور بغاوت میں ان کے کردار کی جانب اشارہ بھی ملتا ہے۔ ایک اور انگریز مورخ ٹی آر ہولمز (T.R. Holmes) نے اپنی کتاب Hitory of the Indian Mutiny(۱۸۸۳ء) میں یہ واضح کرنا چاہا کہ سپاہیوں کی بغاوت کو تعلقہ دار، زمیندار، گوجر اور ہندوستانی بدمعاشوں (ہولمز کے الفاظ میں) نے حکومت کی کمزوری پر محمول کیا اور وہ جگہ جگہ حکومت وقت کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کا مقصد صرف ذاتی مفادات کا حصول تھا۔

جہاں انگریز مصنفین کی تحریروں میں ۱۸۵۷ء کے باغیوں پر کڑی تنقید نظر آتی ہے اور انہیں جابر، ظالم اور لٹیروں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے وہاں چند مستثنیات بھی ہیں جس میں سب سے نمایاں مثال ایڈورڈ تھامسن (Edward Thompson) کی کتاب The Other Side of the Medal(۱۹۲۵ء) ہے۔ اس نے انگریزوں کی انتقامی کارروائیوں اور پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ وہ لکھتا ہے:

> لیکن افسوس ہے کہ اس پردہ پوشی میں بھی معاندانہ رنگ اختیار کیا گیا یعنی انگریز مورخین نے اپنی قوم کی سیاہ کاریاں چھپانے میں تو پوری سرگرمی کا اظہار کیا مگر دوسری طرف ہندوستانی زیادتیوں کی خوب دل کھول کر تشہیر کی۔ اس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم ان مستور اور پوشیدہ واقعات کے رخ سے نقاب الٹ کر ایک فیصلہ کن نظر ڈالیں تا کہ دنیا کے سامنے اس واقع کا دوسرا رخ پیش کیا جا سکے۔ نیز غم و غصہ کی اس آگ کا اندازہ

کیا جاسکے جو اس وقت تک ہندوستانی سینوں میں ہمارے خلاف سلگ رہی ہے۔[۴]

۱۸۵۷ء کی بغاوت پر فوری طور پر برصغیر کے لوگوں کی بھی فارسی اور اردو میں لکھے گئے روزنامچہ، یادداشتیں اور کتابیں وغیرہ سامنے آئیں چونکہ اس وقت انگریزوں کے خلاف آواز اٹھانا ایک مشکل امر تھا اس لیے ایسی ہی تحریریں سامنے آئیں جو یا تو صرف حالات و واقعات کا اندراج ہیں یا پھر برطانوی افسران کی ایماء پر لکھی گئیں، یا ان میں مدافعانہ انداز تھا اور اپنی وفاداری ثابت کرتے ہوئے مقامی آبادی پر سے بغاوت کے الزام کو کم کرنے کی کوشش کی گئی۔ تاہم بیں السطور میں ان تکالیف اور مشکلات کی صورت واضح ہو جاتی ہے جو مقامی آبادی کو جھیلنا پڑیں۔ ان کتابوں میں حکیم احسان اللہ خان کی یادداشتیں، ظہیر دہلوی کی داستان غدر جسے اکثر مورخین کے یہاں ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر اہم ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ جیون لال کا روزنامچہ، معین الدین احسن خان کی یادداشتیں،[۵] کنہیالال کا محاربہ اعظم، ذکاءاللہ خان کی تاریخ عروج، عہدِ سلطنت انگلیشہ (۱۹۰۴ء)، سرسید احمد خان کی 'اسباب سرکشی ہند' (۱۸۵۹ء) An Account of the loyal Muhammadans of India (۱۸۶۰ء) ہیں۔ یہاں ہم خصوصیت سے سرسید کی متعلقہ کتابوں کا ذکر کریں گے۔ 'اسباب سرکشی ہند' میں ان عوامل کی نشاندہی کی گئی ہے جو ہندوستانیوں کی بغاوت یا سرکشی کا باعث ہوئے۔ سرسید نے خاص طور سے مسلمانوں کے مسائل کی نشاندہی کی ہے۔ بجا طور پر ان کی اسباب کی تشخیص بڑی حد تک درست ہے لیکن انداز استعماری رویہ اور اقدامات پر تنقید سے زیادہ مدافعانہ ہے یاد رہے کہ سرسید کی تنقید ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقدامات کے تناظر میں تھی وہ برطانوی بادشاہت یا اس کی برصغیر پر حکومت کے ناقد نہیں تھے اور انگریزوں کی سیاسی، ثقافتی اور علمی ترقی و برتری کے کھلے دل سے معترف تھے۔ An Account of the Loyal Muhammadans of India میں سرسید نے مسلمان جاگیرداروں، نوابوں پر سے باغی ہونے کے عمومی الزام کو دھونے کی کوشش کی ہے اور مثالیں دے کر واضح کیا ہے کہ کہاں کہاں انہوں نے اپنی جان خطرہ میں ڈال کر انگریزوں سے حق وفاداری ادا کیا۔ سرسید نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے لیے غدر اور سرکشی کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور اس میں حصہ لینے والوں کا ذکر وہ منفی الفاظ میں کرتے ہیں جیسا کہ جاہل، بدمعاش،

واہی مولوی، نمک حرام، شراب خور، تماش بین وغیرہ یہاں تک کہ بہادر شاہ ظفر کے لے کہا کہ بے وقت بادشاہ اور مالیخولیا والا آدمی۔[6]

ایک ایسے وقت میں جب ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر اٹھنے والی آوازوں میں یا تو استعماری رویہ اور نسلی برتری اور خود پسندی کا رجحان غالب تھا یا پھر مقامی لوگوں کی جانب سے شکست خوردگی اور مایوسی کا، اس وقت کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز کی آواز ایسی تھی جس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے استعماری ہتھکنڈوں کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔ جولائی ۱۸۵۳ء، نیویارک ڈیلی ٹریبیون میں مارکس اشارہ کرتا ہے کہ:

> جب بورژوا تہذیب اپنے وطن سے جہاں وہ معزز شکلیں اختیار کرتی ہے، نوآبادیات کی طرف بڑھتی ہے، جہاں وہ بالکل عریاں ہو جاتی ہے، تو اس کی گہری ریاکاری اور بربریت جو اس کی فطرت کا خاصہ ہے، ہماری آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہو جاتی ہے۔[7]

اس روزنامہ میں ایک اور مضمون میں وہ برطانوی منتظمین کی مقامی لوگوں پر سختیوں کو بیان کرنے کے بعد اپنی بحث کا اختتام ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ہم نے یہاں ہندوستان میں برطانیہ کی سچی تاریخ سے ایک معتدل سا حصہ پیش کیا ہے ان واقعات کے پیش نظر غیر جانبدارانہ اور صاحب فکر لوگ پوچھ سکتے ہیں کہ کیا کسی قوم کی یہ کوشش بجا نہیں ہے کہ وہ ان غیر ملکی فاتحوں کو نکال باہر کرے جو اپنی رعایا کے ساتھ ایسا برا سلوک کرتے ہیں اور اگر انگریز لوگ ایسی باتیں سنگدلی کے ساتھ کر سکے تو کیا اس پر حیرت ہوگی کہ باغی ہندوستان اپنی بغاوت اور تصادم کے طوفان میں انہیں جرائم اور مظالم کے مرتکب ہوں جو ان پر کیے جاتے ہیں۔[8]

مارکس اور اینگلز ایسٹ انڈیا کمپنی کی لوٹ کھسوٹ، اس کے استعماری ہتھکنڈوں اور استحصالی پہلوؤں کو سامنے لائے۔ کاشتکاروں کے مسائل سامنے لائے اور طبقاتی رویوں اور پیداواری قوتوں کی روشنی میں حالات کا تجزیہ کیا۔ مارکسٹ نقطہ نظر اور ان کا مخصوص تجزیاتی طریقہ کار ایک دبستان فکر کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اس رجحان اور طریقہ کار کے تحت ۱۸۵۷ء کی

بغاوت اور اس کے اسباب وعوامل کا تجزیہ کیا گیا جس کی نمایاں مثال پی سی جوشی اور تلمیذ خلدون کے مضامین ہیں جو کہ پی سی جوشی کی مرتبہ 'انقلاب ۱۸۵۷' میں شامل ہیں۔

ابتدائی ادوار میں لکھے جانے والے تاریخی ادب میں انگریز مورخین کا ایک تجزیاتی رجحان بغاوت کو مسلمانوں کی سازش کے تناظر میں دیکھنا ہے۔ چونکہ انگریزوں کو سیاسی اقتدار و قوت مغلیہ سلطنت کی قوت کو ختم کر کے حاصل ہوا تھا اور پھر یہ کہ باغیوں میں جہادیوں کی صورت میں اضافہ ہوتا رہا جسے آگے چل کر وہابیوں کی بغاوت میں شمولیت کا نام بھی دیا گیا۔ غالباً اس لیے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ذمہ داری مسلمانوں کے کندھے پر ڈالی گئی اور اسے محمڈن سازش (Mohammadan Conspiracy) کہا گیا۔ ان منتظمین میں جنہوں نے اس نقطہ نظر کو بڑھایا ولیم میور (William Muir)، الفریڈ لائل (Alfred Lyall) اور رابرٹس (Roberts) کے نام نمایاں ہیں[۱۰] غلام رسول مہر نے اس ضمن میں ہنری میڈ (Henry Mead) کی کتاب 'سپاہیوں کی بغاوت اور اس کے اسباب' کا ذکر کیا ہے۔ اور لاہور کرانیکل سے اس کتاب کے بارے میں الفاظ درج کرتے ہیں کہ:

> اس سرکشی کو موجودہ مرحلے میں سپاہیوں کی بغاوت کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ یقیناً اس کا آغاز سپاہیوں سے ہوا۔ لیکن بہت جلد اس کی حقیقی حیثیت آشکارا ہو گئی یعنی یہ اسلامی بغاوت تھی۔[۱۱]

۱۸۵۷ء کی بغاوت کا ایک متنازعہ پہلو اسے غدر اور سرکشی یا جنگ آزادی قرار دینے کے حوالے سے ہے۔ بغاوت کی ابتدائی دھائیوں میں لکھے جانے والے تاریخی ادب میں خصوصاً اور بعد میں بھی اس کے لیئے سپاہیوں کی لڑائی (Sepoy War)، غدر (Mutiny) اور سرکشی وغیرہ کے نام استعمال ہوئے ہیں۔ یہ بغاوت جس کا آغاز بنگال ریجمنٹ میں سپاہیوں کی بے چینی سے ہوا اور ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کے فوجی کیمپ میں اس نے باقاعدہ بغاوت اور شورش کی شکل اختیار کر لی اور دیکھتے ہی دیکھتے مختلف علاقوں کے مقامی سپاہی اٹھ کھڑے ہوئے اور انگریز سپاہی، افسران اور تمام برطانوی شہری بلا امتیاز ان کا نشانہ بنے۔ اس بغاوت میں سپاہیوں کے نمایاں کردار کی وجہ سے اسے سپاہیوں کی بغاوت یا غدر قرار دیا۔ تاہم ابتداء میں سپاہیوں کی نظر آنے والی بغاوت میں جلد ہی معاشرے کے دیگر طبقے اور حلقے شامل ہوتے گئے اور اس بغاوت

نے عام شورش کی شکل اختیار کر لی جس کی وجہ سے اسے عوامی یا قومی بغاوت بھی کہا گیا اس نسبت سے یہ برصغیر کے لوگوں کی انگریزوں سے آزادی کی جدوجہد قرار پائی یہی وجہ ہے کہ بار بار یہ سوال اٹھتا رہا ہے کہ آیا یہ غدر ہے، بغاوت یا قومی آزادی کی جدوجہد۔ اولین طور پر اس کا جواب برطانوی منتظمین کی جانب سے آیا جب ڈزرائیلی (Disraeli) نے ۲۷ر جولائی ۱۸۵۷ء کو ہاؤس آف کامنز میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ تحریک فوجی غدر کے بجائے ایک قومی بغاوت ہے۔[۱۲] جبکہ ہندوستان کا گورنر جنرل لارڈ کیننگ (Lord Canning) اعتراف کرتا ہے کہ بغاوت مختلف مراحل سے گزری اور مذہبی تحفظ کی کوشش سے ہوتی ہوئی سیاسی بغاوت کی شکل اختیار کر گئی[۱۳] جسٹس میکارتھی (Mac Carthy) نے لکھا کہ:

> اس کو کسی طرح بھی محض فوجی غدر سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا ہندوستان پر انگریزوں کے قبضے کے خلاف یہ فوجی شکایتوں، قومی نفرت اور مذہبی تعصب کا ایک مشترکہ محاذ تھا۔ اس میں دیسی حکمراں بھی شامل تھے اور دیسی سپاہی بھی۔ عیسائیوں کے خلاف متحد ہونے کے لیے مسلمانوں اور ہندوؤں نے اپنے قدیم مذہبی اختلافات کو بھلا دیا تھا۔[۱۴]

اگرچہ کہ کچھ سطحوں پر برطانوی منتظمین نے بغاوت کی نوعیت کو قومی، سیاسی بغاوت اور مقامی لوگوں کا انگریزوں کے خلاف مشترکہ محاذ قرار دیا لیکن عام طور سے بغاوت پر لکھے جانے والے ابتدائی تاریخی ادب میں سپاہیوں کی بغاوت اور غدر کے عنوان کو ہی اہمیت حاصل رہی۔

برصغیر کے لوگوں کی جانب سے اسے جنگ آزادی قرار دینے والوں میں اولین نام وی ڈی ساورکار (V.D. Savarkar) کا ہے۔ ۱۹۰۹ء میں اس نے ہندوستانی قومی پرست کے فرضی نام سے لندن سے ایک کتاب چھپوائی جس کا عنوان تھا The Indian War of Independance یعنی اس نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو انگریزوں کے خلاف برصغیر کے لوگوں کی بغاوت قرار دیا جو کہ برطانوی استعماریت کا جوا اتار پھینکنے کی کوشش تھی۔ ساورکار کا مقصد بغاوت میں شریک لوگوں کی بہادری کے قصہ بیان کر کے ہندوستان کے نوجوانوں میں وطن پرستی کے جذبات بیدار کرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کتاب کا عنوان اور مواد کسی طور بھی برطانوی استعماریت کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ اس کتاب پر پابندی لگا دی گئی جو کہ ۱۹۴۷ء میں برطانوی حکومت کے

خاتمہ تک قائم رہی۔ تاہم ہندوستان اور پاکستان میں برطانوی استعماریت کے تسلط سے آزادی کی جدوجہد شعوری طور سے ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے جڑ گئی اور اکثر قومی جدوجہد آزادی کے سلسلے کو ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے جوڑا جاتا ہے۔ لیکن یہ سوال اٹھتا رہا کہ آیا اسے ایک قومی جدوجہد کہا جائے یا غیر ملکی تسلط سے نجات کی مختلف گروہی سطح پر کوششیں۔ جیسا کہ تاراچند سمجھتے ہیں کہ:

> یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انگریزوں کے خلاف جنگ کا محرک کوئی قومیت کا جذبہ نہیں تھا اس لیے کہ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کو سیاسی اعتبار سے ایک قوم نہیں کہا جاسکتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر حصہ لیا لیکن دونوں فرقوں کے قائدوں اور ان کے ساتھیوں نے ایک مشترک مادر وطن کی وفاداری کے بجائے ذاتی وفاداریوں سے تحریک پائی۔ اس کے باوجود ۱۸۵۷ء کی شورش ہندوستان کو بدیسیوں کی غلامی سے نجات دلانے کی جنگ تھی۔ [۱۵]

پاکستانی مورخین میں سید معین الحق بھی یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح یہ انقلابی تحریک ترتیب دی گئی اور آگے بڑھی اس سے یہی لگتا ہے کہ یہ لوگوں کو برطانوی استعماریت کے پنجے سے آزاد کرانے کی ایک کوشش تھی۔ [۱۶] اور شواہد اس کے عکاس ہیں کہ وہ ایک قومی انقلاب تھا۔ [۱۷]

تاہم ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے مراکز، واقعات کی نوعیت، سماجی طبقات، سیاسی اور گروہی مفادات وغیرہ اتنے ہمہ جہت ہیں کہ انہیں صرف سپاہیوں کی بغاوت، غدر یا جنگ آزادی کے دائرہ میں محدود نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی صرف ان حوالوں سے تاریخ کا تجزیہ اس وقت کے صحیح حالات واسباب کا ادراک وشعور دے سکتا ہے جیسا کہ سی اے بیلے (C.A. Bayly) نے کہا کہ اس کے لئے کوئی ایک عنوان نہیں بنایا جاسکتا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کوئی ایک تحریک نہیں تھی۔ اسے کاشتکاروں کی بغاوت کہا جائے یا قومی آزادی اس کے کئی پہلو تھے اور اس کے خدوخال ضلع تا ضلع اور گاؤں تا گاؤں ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ [۱۸]

۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ہمہ جہت نوعیت کو سمجھنے کی یہی کوشش ہے جو اس کے مختلف پہلوؤں پر لکھے گئے تاریخی ادب میں نظر آتی ہے اور مورخین دلائل ونتائج اخذ کرنے کے حوالے سے علیحدہ حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ نئے ماخذ کی دریافت اور نئے تجزیاتی رجحانات کی روشنی میں

ایسے گوشوں سے نقاب اٹھا رہے ہیں کہ جنہیں ابھی تک نظر انداز کیا جاتا رہا تھا یہ چیز نمایاں طور پر ۱۹۵۷ء میں بغاوت کے سو سال پورے ہونے والے سیمینارز، سمپوزیم اور شائع ہونے والی کتابوں میں نظر آتی ہے۔ تاہم جنگ آزادی کا حوالا ہندوستانی اور پاکستانی مورخین کے یہاں بہر حال اہمیت کا حامل ہے۔

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے سو سال پورے ہونے پر ۱۹۵۷ء میں کئی اہم کتابیں شائع ہوئیں اور سیمینارز اور سمپوزیم کا انعقاد کیا گیا۔ یہاں ہم ان میں سے چند کا ذکر کریں گے جو کہ نمائندہ نقطہ نظر کی عکاس ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں انڈین گورنمنٹ کی طرف سے انڈین ہسٹاریکل ریکارڈ کمیشن کے سالانہ اجلاس میں ایس این سین کو ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر تحقیق کی ذمہ داری سونپی گئی۔ سین کی کتاب ۱۹۵۷ء میں Eighteen Fifty Seven کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس نے بغاوت کو آزادی کی جدوجہد کے تناظر میں تو دیکھا لیکن اسے ایک قومی جدوجہد تسلیم نہیں کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ جو جنگ مذہب کے لیے شروع ہوئی وہ جنگ آزادی کی صورت میں ختم ہوئی۔ تاہم قومیت کا نظریہ اس بغاوت پر نہیں لگایا جا سکتا۔ تصور قومیت اس وقت ابتدائی مراحل میں تھا اور قوم سے وفاداری علاقائی معنوں میں تھی اسٹوک کے مطابق سین کا لہجہ مدبرانہ اور معتدل ہے اور ان کی توجیہات بہت کم برطانوی مورخ جون کے کی رائے سے مختلف ہے۔[19] ایک قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے اہم رہنما جواہر لال نہرو بھی ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو ایک مقبول تحریک تو سمجھتے ہیں لیکن قومی تحریک نہیں اور جو انکے خیال میں فیوڈل سرداروں کی سرکردگی میں اٹھنے والی ایک فیوڈل طبقہ کی بغاوت تھی کیرسٹوفر ہیبرٹ (Christopher Hibbert) اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ:

> گاندھی کے ماننے والے جنہوں نے تشدد کو مسترد کر دیا تھا ان کی رائے برہمن، راجہ رام موہن رائے جیسے بیش بین دانشوروں سے زیادہ ہم آہنگ تھی یہ نسبت ۱۸۵۷ء کے رجعت پسند باغیوں سے کہ جن کے طریقہ کار کو انہوں نے مسترد کر دیا۔[20]

S. B. Chaudhuri نے Civil Rebellion in the Indian Mutinies (۱۹۵۷ء) میں مختلف شواہد کی مدد سے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو شہری بغاوت قرار دیا اور

واضح کیا کہ کسی طرح ہندوستان کے مختلف علاقوں سے لوگ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقدامات کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی یہ بغاوت عوامی بغاوت میں بدل گئی۔ البتہ R.C. Majumdar کی The Sepoy Mutiny and the Revolt of 1857 (۱۹۵۷ء) میں ایک متضاد رجحان نظر آتا ہے وہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو نہ ہی جنگ آزادی مانتے ہیں اور نہ ہی قومی جنگ ان کے نزدیک اس کا دائرہ یوپی اور اس کے آس پاس کے علاقوں تک محدود تھا اور جنگ کے رہنماؤں کے سامنے قومی یا عوامی مفاد کے مقابلہ میں ذاتی مفادات زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔

۱۹۵۷ء میں ہندوستان میں ۱۸۵۷ء میں بغاوت کے سو سال ہونے پر ایک سمپوزیم میں پڑھے گئے مقالات کئی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ مقالات 'انقلاب ۱۸۵۷' کے عنوان سے پی سی جوشی نے کتابی صورت میں مرتب کیے۔ پی سی جوشی ایک جانے مانے مارکسٹ ہیں اور مقالات لکھنے والوں کی اکثریت بھی اس نکتہ نظر کی حامل ہے۔ کتاب میں مارکسٹ تجزیہ تاریخ نمایاں ہے اور ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو سمجھنے کے نئے پہلو اجاگر کرتا ہے۔ ساتھ ہی مقالات کے موضوعات کی متنوع نوعیت بغاوت کے معاشرہ پر دوررس اثرات، ادب اور لوک گیتوں میں اس کا بیان اور دوسرے ممالک (برطانیہ، فرانس، اٹلی اور چین) میں بغاوت پر آراء کا تجزیہ فراہم کرتی ہے۔ تلمیذ خلدون ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو بغاوت عظیم کا عنوان دیتے ہیں۔ وہ اسے مقبول عام بغاوت تو تسلیم کرتے ہیں لیکن قومی آزادی کی جنگ نہیں ان کے مطابق اس وقت ہندوستانیوں میں قومیت کا کوئی ایسا جذبہ نہیں پایا جاتا تھا جیسا کہ مفہوم آج کل ہمارے ذہنوں میں ہے۔[۲۱] خلدون نے بغاوت کا بنیادی سبب ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں مقامی لوگوں کی اقتصادی استحصال کو قرار دیا ہے۔ اور اس کی ناکامی میں طبقاتی کردار کی وضاحت کی ہے۔ پی سی جوشی کا البتہ یہ ماننا ہے کہ وہ ایک قومی انقلاب اور عوامی بغاوت تھی۔ بقول ان کے:

> ۵۸-۱۸۵۷ء کی بغاوت کا بنیادی مقصد ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی تباہی اور اس کی جگہ ہندوستانی حکومت کا قیام تھا پہلا ایک تخریبی قدم تھا اور دوسرا جدوجہد کا تعمیری جز تھا۔ اگر اس سے یہ شورش قومی بغاوت کا رنگ اختیار نہیں کرتی تو اور کس چیز سے کرے گی۔[۲۲]

مارکسٹ نقطہ نظر کے حامل جوش ایسٹ انڈیا کمپنی کے استحصالی ہتھکنڈوں، جاگیرداری نظام کی توڑ پھوڑ اور نئی ابھرنے والی قوتوں کا ذکر کرتے ہیں ان کا تجزیہ ہے کہ جاگیرداری نظام اگرچہ بکھر رہا تھا اور جمہوری خیال کی حامل نئی قوتیں ابھر رہی تھیں تاہم ابھی وہ اتنی قوت نہیں رکھتی تھیں کہ قدیم جاگیرداری نظام اور برطانوی حکام پر حاوی ہوسکیں۔[۲۳] جوشی نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں کسانوں کے کردار کو نمایاں اہمیت دی ہے اور سمجھتے ہیں کہ تمام طبقوں سے زیادہ کسانوں نے اس بغاوت میں قربانیاں دیں۔[۲۴]

یہ نقطہ نظر زیادہ نمایاں طور پر ایرک اسٹوکس کے یہاں نظر آتا ہے جس کی کتابیں The Peasant and the Raj : Studies in Agrarian Society and Peasent Peasant Armed, The اور (۱۹۷۸ء) Rebllion in Colonial India (۱۹۸۶ء) Indian Revolt of 1857 ہیں۔ کنور محمد اشرف نے اپنے مقالہ میں اسلام پسند حلقوں کے ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں کردار کے حوالے سے بات کی ہے اور اس ضمن میں وہابی تحریک کے کردار کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ آج کل بھی ۱۸۵۷ء کے واقعات کے حوالے سے یہ سوال اٹھ رہا ہے کہ اس میں مذہب یا جہادی عناصر کا کردار کس حد تک تھا اور آیا کیا اس کی گہری جڑیں مذہب میں پیوست تھیں۔[۲۵] سیموزیم کے دیگر مقالات میں ہندی، اردو، بنگالی ادب اور لوک گیتوں میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی نسبت سے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے سے سماجی و معاشرتی سطح پر بغاوت کے اسباب واثرات کا اندازہ ہوتا ہے۔

۱۹۵۷ء میں پاکستان میں ۱۸۵۷ء کے سو سال ہونے پر اگرچہ تقریبات کا انعقاد کیا گیا کانفرنسیں ہوئیں، یادگاری ٹکٹ کا اجراء ہوا اور کراچی سے ایک وفد مغلوں سے عقیدت کے اظہار میں بہادر شاہ ظفر کی قبر پر پھول چڑھانے رنگون گیا لیکن جہاں تک ۱۸۵۷ء کے واقعات پر تحقیقی کام کی اشاعت کا تعلق ہے اس ضمن میں زیادہ کام نظر نہیں آتا۔ اخبارات ورسائل میں لیل ونہار، انقلاب، امروز اور جنگ کی خصوصی اشاعتیں ہوئیں۔ کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے غلام رسول مہر کی دو کتابیں شائع ہوئیں ایک '۱۸۵۷ء پاک و ہند کی پہلی جنگ آزادی' اور دوسری 'اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد' غلام رسول مہر غدر کو جنگ آزادی تسلیم کرتے ہیں۔[۲۶] ان کا یہ بھی ماننا ہے کہ وہ ایک فرقہ وارانہ تحریک نہیں تھی اور نہ اسلامی

بغاوت بلکہ اس کے مقاصد سیاسی تھے اور ہندو اور مسلمان دونوں اس میں شریک تھے۔[۲۷] تاہم شہر دہلی کے حوالے سے ایک جگہ انہوں نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ابتداء میں ہندو مسلم اختلافات بالکل نہیں تھے لیکن بعد میں شک وشبہات پیدا ہونے لگے اور پھر جب بخت خان نے جہاد کے فتویٰ کا نعرہ بلند کیا تو اس کے نتیجے میں مسلمانوں میں زیادہ سختی آ گئی۔[۲۸] اس بات کا زیادہ واضح اعادہ ان کی موخر الذکر کتاب کے مقدمہ میں نظر آتا ہے جہاں ان کے مطابق اس جہاد میں سب سے بڑھ کر حد درجہ ممتاز حصہ مسلمانوں نے لیا۔[۲۹] انہوں نے نمایاں طور پر جن ۲۳ مجاہدین کا ذکر کیا ہے ان میں سے صرف پانچ ہندو ہیں۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت پر کسی پاکستانی پروفیشنل مورخ کی کتاب سید معین الحق کی The Great Revolution of 1857(۱۹۶۸ء) ہے۔ اس میں پاکستان میں پائے جانے والے دو قومی نظریہ کی واضح عکاسی نظر آتی ہے۔ وہ تقسیم سے قبل کے ہندوستان کے لیے ہندوستان، انڈیا یا برصغیر پاک و ہند کے بجائے ہند پاکستان کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ یہ وہ اصطلاح ہے جو کہ پاکستان کے قیام کے ابتدائی سالوں میں اختیار کی گئی لیکن مقبولیت حاصل نہ کر سکی اور برصغیر پاک و ہند کی اصطلاح ہی زیادہ مروج رہی۔ معین الحق کا بنیادی نقطہ نظر یہی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے پیچھے مسلمان تھے تاہم کچھ ہندو لیڈر اور بڑی تعداد میں ہندو سپاہی ان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے لیکن جب تحریک کمزور پڑنا شروع ہوئی تو چند استثناء کے علاوہ سب ساتھ چھوڑ گئے اور انگریزوں نے اس کا ذمہ دار مسلمانوں کو سمجھا اور اس کے نتائج بھی مسلمانوں کو سہنا پڑے۔[۳۰] معین الحق ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو قومی آزادی کی تحریک مانتے ہیں اور اس نقطہ نظر کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ بغاوت کی تیاریاں پہلے سے منظم طریقے سے جاری تھیں یہاں تک کہ انقلابیوں کی طرف سے ۳۱ مئی کی تاریخ عام بغاوت کے لیے مقرر کر دی گئی تھی۔[۳۱] جبکہ ۱۰ مئی کو سپاہیوں کی بغاوت کے نتیجے میں اس پلان کو دھچکا پہنچا جو کہ بغاوت کی ناکامی کا ایک سبب بھی رہا۔[۳۲]

۱۹۶۰ء کے عشرہ کے بعد بھی اگرچہ بغاوت کے تجزیہ میں غدر یا جنگ آزادی کے حوالے کو اہمیت حاصل رہی لیکن ساتھ ہی اس کے سیاسی، مذہبی، معاشی، سماجی، طبقاتی، علاقائی اور ادبی پہلوؤں کو بھی اہمیت حاصل ہوتی گئی۔ یہ حوالے اگرچہ پچھلی کتابوں میں بھی موجود تھے لیکن

سرسری طور سے جیسا کہ جون ولیم کے کے یہاں بغاوت میں کسانوں کے کردار کا ذکر جو زیادہ واضح صورت میں مارکسٹ نقطہ نظر کی حامل تحریروں میں اور ایرک اسٹوکس کے یہاں پایا جاتا ہے۔ ایک نقطہ نظر یہ بھی سامنے آیا کہ بغاوت ان روایت پسند حلقوں کی جانب سے ہوئی جن کے مفادات کو برطانوی پالیسیوں کے نتیجے میں زد پہنچی۔

۶۰ کے عشرہ میں سب سے نمایاں کتاب تھامس میٹکالف (Thomas Metcalf) کی *The Aftermath of Revolt: India 1857-1870* (۱۹۶۴ء) ہے۔ یہ دراصل غدر اور اس کے بعد کے اثرات کے تجزیہ پر مشتمل ہے جس میں سماجی اصلاح، تعلیم، معاشی پالیسی، ریاستوں کے ساتھ تعلقات اور حکومتی ڈھانچہ میں تبدیلی اور اثرات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ میٹکالف کے تجزیہ کے مطابق ۱۸۵۷ء کی بغاوت سپاہیوں کی بغاوت سے بڑھ کر تھی اور ہندوستان کے لوگوں کی اس طرف متوجہ ہونے اور حصہ لینے کی کئی وجوہات تھیں۔ بغاوت میں حصہ لینے والوں میں سب سے نمایاں وہ قدامت پسند عناصر تھے جو برطانوی نظام کے ہاتھوں سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ ان میں برہمی پنڈت، مسلمان مولوی، زمیندار، تعلقہ دار وغیرہ شامل تھے۔ دوسری جانب کسان تھے جسے برطانوی نظام سے خاطر خواہ فائدہ نہ پہنچا۔[۳۳] اس دھائی میں بغاوت کے عمومی جائزہ کے علاوہ علاقائی حوالوں سے بھی بغاوت کے مراکز اور سرگرمیوں کو بھی موضوع بنایا گیا۔ اطہر عباس رضوی اور ایم آئی بھرگاوا (M.I. Bhargava) نے حکومتی سرپرستی میں تاریخی دستاویزات کی روشنی میں پانچ جلدوں میں *Freedom Struggle in Uttar Pardesh* (۱۹۵۷ء۔۱۹۶۰ء) مرتب کی۔ اس کے علاوہ یہ رجحان بھی رہا کہ بغاوت میں شریک نمایاں شخصیات اور لیڈروں کو ہیروز کے طور پر متعارف کرایا جائے۔ دھرم پال (Dharam Paul) کی *Tatya Tope: The Hero of India's Frist War of Independence* اور پریتو چندر گپتا کی *Nana Sahib and the Rising at Cawnpore* (۱۹۶۳ء) ہیں۔

۷۰ کے عشرہ میں مائیکل ایڈورڈز (Michael Edwards) کی *Red Year: The Indian Rebellican of 1857* (۱۹۷۵ء) اور کرسٹوفر ہیبرٹ (Christopher Hibbert) کی *The Great Mutiny of India 1857*

(۱۹۷۸ء) ہیں۔ان میں ۱۸۵۷ء میں پیش آنے والے حالات و واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ موخرالذکر کتاب کے مصنف کے مطابق اس نے ایک ہی جلد میں ان تمام واقعات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے جو جون کے اور میلسن کی ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر چھ جلدوں میں ہیں۔[۳۴]

۸۰ کے عشرہ میں ایرک اسٹوکس (Eric Stokes) کی کتاب *Peasant Armed: The Indian Revolt of 1857* (۱۹۸۶ء) میں کسانوں کے حوالے سے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بغاوت میں کسانوں کے نمایاں کردار کا ذکر کارل مارکس اور اینگلز کی تحریروں اور بعد کے مارکسٹ مورخین کے یہاں نظر آتا ہے تاہم اسٹوکس نے زیادہ تفصیل سے کسانوں کی مسلح بغاوت کے اسباب و عوامل کو بیان کیا ہے۔ اس کے مطابق کسی بھی واقع میں فوجی بغاوت اور دیہی شورش کے درمیان کسان بنیادی رابطہ تھے۔ حقیقتاً بغاوت کسانوں کی فوج کی بغاوت تھی جس نے اپنے غیر ملکی آقاؤں سے رابطہ توڑ لیا تھا۔[۳۵] سبالٹرن نقطہ نظر کہ جس میں محکوم یا نچلے طبقہ کے حوالے سے تاریخ کا تجزیہ کیا جاتا ہے، اسے ہندوستان کی جدید تحریک آزادی کے مختلف پہلوؤں کے جائزہ میں اختیار کیا گیا ہے۔ تاہم اس حوالے سے تھوڑا بہت کام ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر بھی کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں رانا جیت گوہا جو کہ اس دبستان کی فکری بنیاد رکھنے والوں میں سے ہیں، ان کا ایک کام *Elementary Aspects of Peasant Insurgency in Colonial India* (۱۹۸۳ء) ہے۔ اس میں ۱۷۸۳ء تا ۱۹۰۰ تک کسانوں کی بے چینی کا جائزہ لیا گیا ہے اور یوں ۱۸۵۷ء کے حوالے سے بھی نقطہ نظر سامنے آجاتا ہے۔ انہوں نے اس نقطہ نظر کو چیلنج کیا ہے کہ کسان ایسے بے قوت ایجنٹ تھے جنہوں نے بغیر سوچے سمجھے برطانوی استعماریت اور مقامی زمینداروں کے استحصالی ہتھکنڈوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ گوہا کا کہنا ہے کہ کسان پوری آگاہی رکھتے تھے اور ان میں سیاسی تبدیلی پر اثر انداز ہونے کا جذبہ بھی تھا۔ سبالٹرن دبستان کے عکاس گوتم بھدرا (Gautam Bhadra) کے سبالٹرن اسٹڈیز کے تحت شائع ہونے والے مضمون 'Four Rebels of 1857' (۱۹۸۵ء) اور رودرنگھشو مکھرجی (Rudrengshu Mukherjee) کی *Avadh in Revolt 1857-58: A Study of Popular Resistance* (۱۹۸۴ء) ہیں۔

۹۰ کے عشرہ میں اس فکری رجحان کی نمائندہ کتاب ٹپتی رائے (Tapti Roy) کی

The Politics of a Popular Uprising: Bundelkhand in 1857 (۱۹۹۴ء) ہے۔ سلیم الدین قریشی نے *Cry for Freedom Proclamations of Muslim Revolutionaries of 1857* (۱۹۹۷ء)۔ اس میں باغی رہنماؤں کی جانب سے جاری کیے گئے پندرہ کے قریب فرمان جمع کیے گئے ہیں جنہیں برطانوی منتظمین نے انگریزی میں ترجمہ کر کے سرکاری دستاویزات میں محفوظ رکھا تھا۔ مرتب کے مطابق تمام فرمانوں میں جو موضوع نمایاں ہے وہ برطانوی دورِ اقتدار میں مقامی لوگوں کا استحصال اور ناانصافی کا احساس اور انگریزوں کے خلاف ایک مشترکہ محاذ بنا کر آزادی کی خواہش کی تکمیل۔ ۳۶

۲۰۰۰ء کی دھائی میں پی ایس مکھریا (P.S. Mukharya) کی *The Revolt of 1857: Saugar and Nerbudda Territories* (۲۰۰۷) ہے جس میں مخصوص علاقے میں بغاوت کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ امریش مسرا کی *War of Civilizations: India AD1857* میں اس بات کا دعویٰ کیا گیا کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے نتیجہ میں کہیں بڑی تعداد میں مقامی لوگوں کا قتلِ عام کیا گیا اور ایک لاکھ کے بجائے دس سال کے عرصہ میں دس ملین لوگ قتل ہوئے۔ اس کے اس دعویٰ اور اس میں پیش کیے گئے دلائل کا مورخین کی جانب سے ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ گوتم چکرورتی نے انگریزی ادب کا تجزیہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے اثرات کے حوالے سے اپنی کتاب *The Indian Mutiny and the British Imagination* (۲۰۰۵ء) میں لیا ہے۔

متذکرہ حوالوں کے علاوہ ہندوستان میں خصوصیت سے نئے حوالوں سے بھی کام سامنے آ رہا ہے جیسے دلت اور عورتوں کا جنگ آزادی میں کردار وغیرہ۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۲۰۰۶ء تک ۱۸۵۷ء کی بغاوت، غدر یا جنگ آزادی پر اس عنوان کے تحت بہت کتابیں لکھی گئی ہیں اور اگر اس میں ان کتابوں کو بھی شامل کر لیا جائے جس میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت ایک ذیلی لیکن اہم عنوان کی حیثیت رکھتی ہے تو یہ ادب کئی گنا پھیل جائے گا۔ جو کتابیں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی زیر عنوان ہی لکھی گئی ہیں ان کے اس سرسری مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اگرچہ اسے غدر یا سپاہیوں کی بغاوت اور جنگ آزادی کے دو متضاد ذہنی، فکری رویہ اور تناظر میں تقسیم کیا گیا لیکن ابتداء ہی سے اس کے اسباب و عوامل اور تجزیہ میں تنوع نظر آتا ہے۔ ابتدائی برطانوی تاریخ نگار جن میں

منتظمین، فوجی وغیرہ بھی شامل تھے، اگر نسلی برتری کا پہلو نمایاں ہے تو کہیں کہیں واقعات کو حقائق کے تناظر میں سمجھنے یا بیان کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ اس طرح ہندوستان کے مورخین میں جہاں ایک مضبوط حلقے نے اسے جنگ آزادی کی جدوجہد کی روشنی میں دیکھا وہیں کچھ حلقوں نے دیگر حوالوں سے بھی بحث کی اور یہی چیز ماضی یا تاریخ کو جاننے کا عمل ہے۔ جوں جوں ماضی کو جاننے، سیاست و معاشرت کو سمجھنے کے لیے دبستان قائم ہوتے گئے ۱۸۵۷ء کے مطالعہ پر بھی اثر انداز ہوتے رہے۔ کسی بھی واقعہ کے ہونے کے عوامل اور نتائج واثرات کی ہمہ گیریت کو جب تسلیم کرلیا گیا تو اس کا صرف سیاسی پہلو ہی نہیں رہا بلکہ علاقائی، معاشی، معاشرتی، شخصی، مذہبی، ادبی، طبقاتی سبھی کچھ آ گیا۔ یہی سب پہلو ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر لکھے گئے تاریخی ادب میں بھی نظر آ رہے ہیں۔

حوالہ جات

1) S.N. Sen, 'Writings on the Mutiny', in *Historians of India Pakistan and Ceylon,* C.H. Philips (ed.) (London: Oxford University Press, 1961), p.373.

2) Eric Stokes, *The Peasant Armed: The Indian Revolt of 1857*, C.A. Bayly (ed.) (Oxford: Clarendan Press, 1986), p.4.

3) John Kaye, *The History of Indian Mutiny*, G.B. Malleson (ed.) (Lahore: Sheikh Mubarak Ali, 1976), p.XIV.

۴) ایڈورڈ تھامسن (Edward Thompson)، 'انقلاب ۱۸۵۷ء تصویر کا دوسرا رخ'، شیخ حسام الدین (مترجم) (لاہور: گوتم پبلشرز، ۱۹۹۳ء)، صفحہ ۳۶۔

۵) معین الدین احسن خان اور منشی جیون لال کے روزنامچوں یا یادداشتوں کا انگریزی میں ترجمہ کرکے چارلس میٹکالف (Charles Metcalfe) نے *Two Narratives of the Mutiny in Delhi* کے عنوان سے ۱۸۹۸ء میں شائع کیا۔

۶) ضیاء الدین لاہوری (مرتبہ) 'خودنوشت حیات سرسید' (کراچی: جنگ پبلشرز، ۱۹۹۳ء)، صفحات ۱۲۷ تا ۱۲۸، ۱۳۱۔

۷) کارل مارکس، 'ہندوستان کا تاریخی خاکہ'، احمد سلیم (مرتبہ) (لاہور: تخلیقات، ۲۰۰۲ء) صفحہ ۲۴۶۔

۸) ایضاً، صفحہ ۲۹۱۔

۹) پی سی جوشی، ''ہماری تاریخ میں ۱۸۵۷ء''، 'انقلاب ۱۸۵۷ء'، پی سی جوشی (مرتبہ) (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۹۸ء)

۱۰) وضاحت کے لیے دیکھیے ایرک اسٹوکس، محولہ بالا، صفحات ۷۔۹۔

(۱۱ غلام رسول مہر، '۱۸۵۷ء: پاک و ہند کی پہلی جنگِ آزادی' (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۷ء)، صفحہ ۴۵۶۔

(۱۲ تاراچند، 'تاریخ تحریک آزادی ہند'، غلام ربانی تاباں (مترجم) (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۱ء)، جلد دوم، صفحہ ۴۲۔

13) Salim al Din Qureshi (comp), *Cry for Freedom: Proclamations of Muslim Revolutionaries of 1857* (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1997), pp.v-vi.

(۱۴ تاراچند، محولہ بالا، صفحہ ۴۳۔

(۱۵ ایضاً، صفحہ ۴۴

16. Syed Moin ul Haq, The Great revolution of 1857 (Karachi: Pakistan Historical Society, 1968), p.75

17. Ibid, p.81

18. C.A Bayly, 'Editor's concluding note', in *The Peasant Armed: The Indian Revolt of 1857*, op.cit, p.226

19. Eric Stokes, *The Peasant Armed: The Indian Revolt of 1857*, Ibid, p.6

20. Christopher Hibbert, *The Great Mutiny: India 1857* (England: Penguin Books, 1983), p.391

(۲۱ تلمیذ خلدون، ''بغاوت عظیم''، 'انقلاب ۱۸۵۷ء'، پی سی جوشی (مرتبہ)، محولہ بالا، صفحہ ۱۵

(۲۲ پی سی جوشی، ''ہماری تاریخ میں ۱۸۵۷ء''، 'انقلاب ۱۸۵۷ء'، ایضاً، صفحہ ۱۵۰۔

(۲۳ ایضاً، صفحہ ۱۹۸۔

(۲۴ ایضاً، صفحہ ۱۹۹۔

25. See William Dalrymple's *The Last Mughal*, London: Bloomsbury, 2006

(۲۶ غلام رسول مہر، '۱۸۵۷ء، پاک و ہند کی پہلی جنگ آزادی' محولہ بالا، صفحات ۱۱، ۱۴، ۳۴-۳۵، ۷۰

(۲۷ ایضاً صفحات ۳۴، ۴۵۵۔

(۲۸ ایضاً، صفحات ۱۵۶-۱۵۷۔

(۲۹ غلام رسول مہر، 'اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد' (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۲ء)، صفحات ۱۰-۱۱۔

30) Syed Moin ul Haq, *op.cit.*, p.555.

31) *Ibid.*, p.73.

32) *Ibid.*, p.75.

33) Thomas R. Metcalfe, *The Aftermath of Revolt: India 1857-1870* (New Delhi: Manohar Publications, 1990), pp.61-65.

34) Christopher Hibbert, *op.cit.*, p.11.

35) Eric Stokes, *op.cit.*, p.14.

36) Salim al Din Qureshi, *op.cit.*, p.xiii.

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی ۔ چند نظری پہلو

ڈاکٹر سید جعفر احمد

اب سے ڈیڑھ سو سال قبل ۱۸۵۷ء میں ہندوستان ایک ہمہ گیر مگر ناکام بغاوت کے بعد سلطنتِ برطانیہ کی مقبوصات میں شامل ہوا اور پھر نوّے (۹۰) سال کی طویل اور صبر آزما جدوجہد کے بعد ہی غلامی کا یہ طوق اس کی گردن سے اُتر سکا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت جس کو جنگِ آزادی بھی قرار دیا جاتا ہے، غیر معمولی اہمیت کا حامل تاریخی واقعہ تھی۔ اس واقعے کے حقیقی پس منظر، اس کے سماجی اور سیاسی عوامل اور اسباب اور اس کے دوررس مضمرات کے بارے میں مؤرخین نے بہت کچھ لکھا ہے اور اب بھی جبکہ اس واقعے کو ڈیڑھ صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے، تاریخ کے طالب علموں کی اس میں دلچسپی کم نہیں ہوئی ہے۔

اس واقعے کے بارے میں جہاں تصنیف و تالیف کے کام میں قابل ذکر پھیلاؤ آیا ہے وہیں اس کی نسبت نت نئے مباحث اور سوالات بھی اٹھتے رہے ہیں۔ مثلاً مؤرخین ایک زمانے سے یہ بحث کرتے آئے ہیں کہ کیا ۱۸۵۷ء کی بغاوت، جنگ آزادی کے زمرے میں آتی ہے یا انگریز کا اس کو 'غدر' قرار دینا ٹھیک تھا۔ اسی طرح یہ بات بھی ایک عرصہ زیر بحث رہی کہ اس بغاوت کی وسعت کیا تھی؟ کیا یہ ایک ملک گیر بغاوت تھی یا محض چند علاقوں سے اٹھنے والی شورش کو اہلِ شوق نے جنگ آزادی کا نام دے دیا۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات کو مذہبی رنگ میں دیکھنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ چنانچہ فرقہ پرست مؤرخین نے اس جنگ کو تمام و کامل اپنے اپنے مذہب کے ماننے والوں کے جذبۂ آزادی کا مظہر قرار دینے کی کوشش کی۔ چنانچہ انتہا پسند ہندو مؤرخین نے

اپنی تحریروں میں اس جنگ کا ایک ایسا نقشہ کھینچا جس میں مسلمانوں کے کردار کو گھٹا کر بیان کرنے کی شعوری کوشش کی گئی۔ ادھر مسلمان مؤرخین میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں رہی جنہوں نے اس جنگ میں ہندوؤں، سکھوں اور ہندوستان کے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے کردار سے یا تو صرفِ نظر کیا یا اس کا ذکر محض سرسری طور پر کر کے آگے بڑھ جانے کا رویہ اختیار کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات میں نہ صرف باغیوں میں مسلمان اور ہندو دونوں شامل تھے[1] بلکہ انگریزوں کا ساتھ دینے والے غدّارانِ وطن میں بھی دونوں مذاہب کے ماننے والے پیش پیش تھے۔[2]

تقسیمِ ہند سے قبل ہندوستان میں متحدہ قومیت کے تصور کے زیرِ اثر جو تاریخ نویسی ہوئی اور جس کا تسلسل تقسیم کے بعد بھی وہاں جاری رہا اس کا بنیادی داعیہ کیونکہ ہندو مسلم اتحاد اور ہم آہنگی کے تصورات ہی تھے لہٰذا ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں تمام مذاہب کے ماننے والوں کی شرکت اس داعیے کو تقویت پہنچانے کا ذریعہ بن سکتی تھی۔ چنانچہ وہاں بحیثیت مجموعی ۱۸۵۷ء کے بارے میں اہلِ قلم کا رویہ تاریخی حقائق سے قریب رہا۔ البتہ انتہا پسند حلقے خاص طور سے ہندو بنیاد پرستی کی علمبردار راشٹریہ سیوک سنگھ اور اس کی جدید سیاسی تشکیل یعنی بی۔ جے۔ پی کے زیرِ اثر تاریخ کو 'ہندوانے' کا عمل شروع ہوا تو ۱۸۵۷ء کی تعبیر بھی اسی نہج پر کی جانے لگی کہ جیسے یہ ہندوؤں کا انگریزی استعمار کے خلاف احتجاج تھا جس میں مسلمانوں کا حصہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ طرزِ فکر صرف ایک حد تک ہی آگے جا سکا اور ہندوستان کے سیکولر حلقوں نے فوراً ہی اس رجحان کا علمی سطح پر مقابلہ کرتے ہوئے تاریخ کو مسخ ہونے سے بچا لیا اور جن نصابی کتابوں کو بی۔ جے۔ پی کے دورِ حکومت میں تبدیل کر دیا گیا تھا ان کو از سرِ نو درست کر دیا گیا۔

پاکستان میں صورتِ حال بالکل مختلف رہی۔ پاکستان کا مطالبہ کیونکہ دو قومی نظریے کے تصور کے ساتھ اُٹھا تھا لہٰذا قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے سرکاری اور روایتی تاریخ نویسوں نے ضروری سمجھا کہ ہندوستان کی ساری پچھلی تاریخ کو دو جدا قومیتی وحدتوں کے حوالے سے تقسیم کر کے پیش کریں حالانکہ تاریخ کی یہ تعبیر خود دو قومی نظریے کے استناد کے لیے ضروری نہیں تھی۔ دو قومی نظریہ ایک سیاسی تصور تھا جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے نصف اوّل میں ہندوستان کی مسلم سیاسی اشرافیہ اور متوسط طبقے کے معاشرتی اور سیاسی مفادات کی تکمیل کا ذریعہ بن

سکتا تھا۔ اسی نظریے کو بنیاد بنا کر مذکورہ حلقوں نے پہلے متحدہ ہندوستان کے دائرے میں اپنے حقوق اور مفادات کے حصول کی کوشش کی اور بعدازاں یہی نظریہ مطالبۂ پاکستان کی اساس بنا۔ لیکن جیسا کہ بالعموم قومیتی سیاست میں ہوتا ہے کہ حال کے سیاسی موقف کو ماضی سے تقویت پہنچائی جاتی ہے، چنانچہ ہمارے یہاں بھی تاریخ نویسوں نے دوقومی نظریے کو ماضی کی ہزار سالہ تاریخ پر منطبق کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں جن دو قوموں کی بات زور و شور کے ساتھ ہوئی وہ ماضی بعید سے اسی شکل میں دو جُدا دھاروں کی صورت میں چلتی چلی آئی ہیں۔ اس طرزِ فکر کا ناگزیر پہلو یہ تھا کہ ماضی کے وہ واقعات اور رجحانات جو مذہبی آویزش سے پراگندہ نہیں تھے اُن کو بھی مذہبی تقسیم کے انداز میں پیش کیا جائے۔ اس کی ایک صورت تو یہ تھی کہ ایسے واقعات کو زیرِ بحث لاتے وقت غیر مسلموں کے کردار سے یا تو یکسر صرفِ نظر کر لیا جائے یا پھر اس کو محض ایک غیر نمایاں اور غیر اہم کردار کے طور پر پیش کیا جائے۔ یہ رویہ کیونکہ غیر تاریخی ہے لہٰذا اس کی اصلاح کی ضرورت ہے اور یہ اچھی بات ہے کہ اب ہمارے یہاں اس کمزوری کو محسوس کیا جانے لگا ہے اور تاریخ کو معروضی انداز میں دیکھنے کے رجحان نے کسی نہ کسی حد تک تقویت حاصل کی ہے۔

یہاں پاکستان کی تاریخ نویسی کی ایک اور بڑی کمزوری کی طرف اشارہ بھی ناموزوں نہیں ہوگا اور وہ کمزوری یہ ہے کہ صرف ۱۸۵۷ء ہی پر کیا موقوف، ہمارا سارا تاریخ نویسی کا بیانیہ برطانوی استعمار کے بنیادی موضوع کو نظرانداز کر دیتا ہے یا اس کا ذکر ایک ثانوی حقیقت کے طور پر اور وہ بھی اکثر و بیشتر واجبی انداز میں کیا جاتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ میں کامیابی کے بعد انگریزی استعمار نے ہندوستان پر پنجے گاڑھنے کا عمل شروع کر دیا تھا۔ یہ عمل سو سال بعد یعنی ۱۸۵۷ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا اور پھر ۱۹۴۷ء تک ہندوستان سلطنتِ برطانیہ کی نوآبادی بنا رہا۔ گویا کوئی دو سو سال تک انگریزی استعمار ہندوستان کی معاشرت اور سیاست کی سب سے بڑی حقیقت تھا اور وہ سب رجحانات، سماجی رویے، سیاسی تصورات اور سیاسی تشکیلات جو ان دو سو سال میں ظہور پذیر ہوئیں وہ سب کی سب براہ راست طور پر اس نوآبادیاتی نظام کا شاخسانہ تھیں اور اس کے زیر اثر اُبھری تھیں۔ سوچا جا سکتا ہے کہ اگر ہندوستان ایک نوآبادی نہ بنا ہوتا تو کیا یہاں کسی کانگریس، کسی مسلم لیگ، کسی فیوڈل سیاسی اشرافیہ اور کسی چیمبر آف کامرس کا

قیام اسی صورت ممکن ہوتا جس طرح یہ سب تشکیلات اور واقعات انگریز کی آمد کے براہ راست نتیجے کے طور پر ظہور پذیر ہوئے۔ اس گزارش کا مقصد صرف یہ ہے کہ یہ واضح کیا جائے کہ ہم ہندوستان میں انیسویں اور بیسویں صدی میں جس سیاسی جدل اور جن رجحانات و واقعات کو موضوعِ بحث بناتے ہیں اُن کا حقیقی تناظر تو نوآبادیاتی نظام ہی تھا۔ اس تناظر کو صفحۂ یادداشت سے مٹا کر ہم محض سطحی تجزیوں ہی کے مکلّف ہو سکتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی ہندوستانی بغاوت کی تعبیرات اور پاکستان کی تاریخ نویسی کے چند بنیادی مسائل کے محولہ بالا تذکرے کے بعد اب ہم اس بغاوت کے آغاز و انجام، اس کے تحت ہونے والے سلسلۂ واقعات، اس کے سماجی کردار اور اس کے سیاسی و سماجی نتائج کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

۱۸۵۷ء صرف برطانوی استعمار کے حتمی تسلط کا ہی سال نہیں ہے بلکہ اس سال جو پُر آشوب واقعات ہندوستان کے طول و عرض میں ظہور پذیر ہوئے انہوں نے اس استعمار کے خلاف ہندوستان کے ردِ عمل کو بھی تاریخ کے صفحات میں محفوظ کر دیا۔ ان واقعات کا آغاز ۱۰ مئی کو میرٹھ میں تین رجمنٹوں کی بغاوت سے ہوا جنہوں نے ایک روز قبل اپنے ۸۵ سپاہی ساتھیوں کو کورٹ مارشل کے ذریعے ہونے والی ۱۰ سال کی سزا پر احتجاج کیا۔ انہوں نے قید خانے پر ہلّہ بول کر ان سپاہیوں کو رہا کروالیا۔ ان سپاہیوں پر الزام یہ تھا کہ انہوں نے بندوقوں میں استعمال ہونے والی نئی وضع کے کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کارتوسوں میں گائے اور سؤر کی چربی استعمال کی جاتی ہے۔ گائے کی چربی پر ہندوؤں کا اعتراض تھا جبکہ سؤر کی چربی مسلمانوں کے لیے مکروہ اور حرام تھی۔ چونکہ ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے پہلے ان کو منہ سے کھولنا پڑتا تھا لہٰذا نہ تو ہندو اور نہ ہی مسلمان اس فعل کو قبول کر سکتے تھے۔ کارتوسوں کی یہ بات بہت معروف اور عام فہم بات ہے مگر جیسا کہ بعد کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی زاویے سے قطع نظر کارتوسوں کا قصہ اُس وقت ہندوستان میں پائے جانے والے انگریز مخالف جذبات کو محض چنگاری دکھانے کے واقعے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بجائے خود کوئی اتنا بڑا واقعہ نہیں تھا جو پورے ہندوستان میں بغاوت کی آگ لگا سکتا۔ اور جیسا کہ بعد میں ہوا بھی کہ باغی سپاہیوں نے انہی کارتوسوں کو خود انگریز فوج کے خلاف استعمال کیا اور

ظاہر ہے کہ اس کا طریقۂ استعمال بھی وہ ہی رہا ہوگا جس طریقے پر وہ معترض تھے اور جس کی بنا پر وہ آمادۂ بغاوت ہوئے تھے۔ چنانچہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ برٹش بنگال آرمی کے سپاہیوں نے جو بغاوت کی اُس کے مذکورہ بالا فوری سبب سے قطع نظر اصل محرکات کیا تھے اور یہ کہ یہ ایک ملک گیر اُبھار کس طرح بن گئی۔ آگے چل کر ہم اس موضوع پر بات کریں گے۔ یہاں ہمارے پیش نظر یہ دیکھنا ہے کہ اس بغاوت کی وسعت کیا تھی اور ہندوستان کے کون کون سے علاقے براہ راست طور پر اس کی زد میں آئے۔ اس بات کا تعین اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ دیکھا جا سکے کہ یہ کسی ایک یا دوسرے علاقے تک محدود چھوٹا سا واقعہ نہیں ہے جس کو کہ تاریخ نویسوں نے سیاسی ضرورتوں کے پیش نظر بڑھا چڑھا کر پیش کر دیا ہو۔ اس وقت کے انگریز حکمرانوں نے قابلِ فہم طور پر اس کو غدر قرار دیا اور جب کبھی اس کو بغاوت کہا بھی تب بھی اُن کا اشارہ محض بنگال کی فوج کی طرف ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا مقصد بغاوت کی وسعت کو محدود کر کے دکھانا ہوتا تھا۔ لیکن یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ پہلی بار اس بغاوت کو ایک ہمہ گیر اور ہندوستان گیر بغاوت قرار دینے بلکہ اس کو ایک قومی انقلاب کا نام دینے والے بھی خود انگلستان ہی کے عمائدین اور اہلِ دانش تھے۔ ۲۷ جولائی ۱۸۵۷ء کو یعنی اس بغاوت کے آغاز کے صرف دو مہینے بعد برطانیہ کی اس وقت کی حزبِ اختلاف کے ترجمان بنجمن ڈزرائلی (Benjamin Disraeli) نے ہاؤس آف کامنز کے سامنے ہندوستان کی صورتِ حال کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے یہ نقطہ اختیار کیا کہ یہ جنگ محض ایک فوجی بغاوت نہیں ہے بلکہ یہ مظہر ہے اس گہرے عدم اطمینان کا جو ہندوستان کی پوری آبادی میں پایا جاتا ہے۔ انہوں نے وِس کاؤنٹ پالمرسٹن (Viscount Palmerston) کی حکومت پر شدید تنقید کرتے ہوئے یہ سوال اٹھایا کہ 'کیا یہ ایک فوجی شورش ہے یا یہ ایک قومی انقلاب ہے؟... جو اقدامات ایک فوجی شورش سے نمٹنے کے لیے کافی ہو سکتے ہیں وہ ایک قومی بغاوت سے عہدہ برا ہونے کے لیے کافی ثابت نہیں ہو سکتے'۔[۳]

ڈزرائلی کا یہ تجزیہ غلط نہیں تھا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت جنگل میں لگنے والی آگ کی مانند تھی جس نے چند ہی روز میں ایک پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور یہ شمالی ہند کے ایک ایسے وسیع رقبے پر پھیل گئی جس میں دہلی، اودھ، روہیل کھنڈ، بندیل کھنڈ اور آگرہ پر مشتمل شمال مغربی صوبہ جات اور بہار کا بہت بڑا حصہ شامل تھا۔[۴] اس رقبے کی وسعت کا اندازہ اس بات سے

لگایا جاسکتا ہے کہ یہ فرانس، آسٹریا اور پرشیا کے مجموعی رقبے کے برابر اور آبادی میں اس بھی زیادہ تھا۔[۵] یہی نہیں بلکہ پنجاب، سندھ اور سرحد تک اس کے اثرات پہنچے۔ مولانا غلام رسول مہر نے انبالہ، لدھیانہ، جالندھر، لاہور، گجرانوالہ، سیالکوٹ، جہلم، ملتان اور پشاور میں بغاوت کی تفصیلات درج کی ہیں۔[۶]

بغاوت کی تفصیلات مرتب کرنے والوں نے اب اس کی تقریباً سب ہی جزیات کو محفوظ کرلیا ہے۔[۷] ۱۰ر مئی کو میرٹھ میں بغاوت شروع ہونے کے اگلے ہی دن باغی سپاہی دہلی پہنچ گئے اور بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت کا اعلان کردیا۔ مغلیہ سلطنت اُس وقت تک ہندوستان کے تقریباً سب ہی علاقوں سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی اور بہادر شاہ ظفر کا اقتدار دہلی کے قلعے تک محدود تھا۔ اُن کی بادشاہت کا اعلان ان معنوں میں اہم تھا کہ بہادر شاہ ظفر کی ایک علامتی حیثیت تھی اور وہ ہندوستان کی وحدت اور اقتدارِ اعلیٰ کی علامت بن سکتے تھے۔ یہی مقصد تھا جس کے پیش نظر باغیوں نے اُن کی بادشاہت کا اعلان کیا۔ مئی کے اواخر تک بغاوت کی چنگاریاں علی گڑھ، فیروز پور، مارتھ پور، لکھنؤ، بریلی اور شاہ جہاں پور تک پہنچ گئیں۔ جون کے پہلے ہفتے میں مراد آباد، بدایوں، اعظم گڑھ، سیتاپور، بنارس، کانپور اور جھانسی نے بغاوت کے مناظر دیکھے۔ ۶ جون کو نانا صاحب نے کانپور کا محاصرہ کرلیا۔ ۷ر اور ۸ جون کو باغیوں نے جھانسی پر قبضہ کیا اور رانی لکشمی بائی کی حکمرانی کا اعلان کردیا۔ ۹ر اور ۱۳ر جون کے درمیان فتح پور، نواگنج، گوالیار اور فتح گڑھ میں بغاوت ہوئی۔ جون کے اواخر تک کانپور پر نانا صاحب کا قبضہ مکمل ہو چکا تھا۔ جولائی میں اندور میں بغاوت ہوئی اور لکھنؤ کی ریزیڈنسی باغیوں کے قبضے میں آ گئی۔ اس بغاوت کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ کامیابیاں اور ناکامیاں دونوں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں، کسی علاقے میں باغیوں کو کامیابی ہوتی تو عین اُسی وقت کسی دوسرے علاقے میں وہاں کے باغی ناکامی کا سامنا کررہے ہوتے یا اُن کی ابتدائی کامیابی ناکامی میں بدل رہی ہوتی۔ چنانچہ جولائی ہی میں نانا صاحب کو فتح گڑھ اور کانپور میں بھی پسپائی کا سامنا کرنا پڑا۔ اگست میں تانتیا توپے کو بتھور میں ناکامی ہوئی۔ ۱۷ر اگست کو سر کولن کیمبل نے فوج کی کمان سنبھالی۔ اگلے مہینے باغیوں کو اور بھی کئی جگہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ خاص طور سے ۱۴ر ستمبر کو برطانوی فوج نے کشمیری گیٹ کو بم سے اُڑا دیا اور ۱۹ر اگست کو لاہوری گیٹ بھی اڑا دیا گیا۔ ۲۰ ستمبر تک دہلی پر دوبارہ انگریز کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ بہادر شاہ ظفر

نے ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی اور بعد میں وہ گرفتار ہوگئے۔ ان کے شاہزادے بھی گرفتار ہوئے اور بعد میں انہیں میجر ہڈسن نے قتل کر دیا۔ اکتوبر میں لکھنؤ بھی واپس انگریزوں کو مل گیا۔ اکتوبر ہی میں تانتیا توپے نے کانپور میں انگریزوں کو شکست دی مگر دو ماہ بعد کولن کیمبل کے ہاتھوں اُس کو بھی شکست ہوئی۔ مارچ ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ مکمل طور پر برطانوی کنٹرول میں آ گیا۔ اگلے ماہ برطانوی فوجوں نے جھانسی پر حملہ کیا اور قلعے پر قبضہ کر لیا۔ رانی لکشمی بائی وہاں سے نکل جانے میں کامیاب ہوگئی۔ ایک اور باغی کمانڈر کنور سنگھ جس نے اعظم گڑھ اور جگدیش پور میں انگریزوں کو ہرایا تھا ۲۶ر اپریل کو مارا گیا۔ ایک اور باغی لیڈر بہادر خان جس نے دہلی میں علم بغاوت بلند کیا تھا مئی میں اُس کو بھی شکست ہوئی۔ جون میں رانی جھانسی ماری گئی۔ رانی جھانسی گوالیار میں لڑتے ہوئے ماری گئی۔ تانتیا توپے بھی جواب تک کبھی اِدھر کبھی اُدھر انگریز سے نبرد آزما تھا۔ بالآخر پکڑا گیا اور اُسے پھانسی دے دی گئی۔

بغاوت کے دنوں میں جہاں جہاں برطانوی کنٹرول بحال ہوتا جاتا تھا وہاں بغاوت کو مکمل طور پر کچل دینے کے بعد برطانوی سپاہ کی طرف سے ظلم و جبر کا بازار گرم کر دیا جاتا تھا۔ لوگوں کو گروہ در گروہ قتل کیا گیا۔ باغیوں، ان کے ہمدردوں یہاں تک کہ ایسے عام لوگوں کو جن کے بارے میں انگریز کو شک ہوتا تھا کہ انہوں نے باغیوں کا ساتھ دیا ہے اُن سب کو پھانسی دے دی جاتی تھی اور ایک بڑی تعداد میں لوگوں کو درختوں کی ٹہنیوں پہ باندھ کر پھانسی دی گئی۔ گھر اور بازار الگ سے جلائے گئے۔ شاہی خاندان کی بیگمات کی تضحیک کی گئی۔ خواجہ حسن نظامی نے 'بیگمات کے آنسو' میں بغاوت کے اس پہلو کی بہت دلدوز تصویریں پیش کی ہیں۔[۸] خود غالبؔ کے خطوط میں بغاوت کے دنوں کے دہلی کے بڑے بھیانک مرقعے دیکھے جا سکتے ہیں۔

بغاوت کی وسعت کا اندازہ اس بھی کیا جا سکتا ہے کہ انگریز کی باقاعدہ فوج (ریگولر آرمی) کی ہر رجمنٹ نے اور غیر مستقل (irregular) فوج کی ۱۸ر میں سے ۱۰ر رجمنٹوں اور پیادہ فوج (cavalry) کی ۷۴ میں سے ۶۳ رجمنٹیں قطعاً باغی ہوگئیں اور ڈیوٹی سے غائب ہوگئیں۔ یہ بات بھی اہم اور قابلِ غور ہے کہ فوجیوں کی طرف سے شروع کی گئی بغاوت کا براہ راست تعلق تو ان کی بیرکوں اور ان علاقوں سے تھا جہاں یہ فوج تعینات تھی مگر بغاوت کی آگ پھیلتے ہی دوسرے علاقے اور غیر فوجی حلقے بھی اس کا حصہ بنتے چلے گئے۔ ماضی میں انگریز کو

ہندوستان میں جو مزاحمت دیکھنی پڑی تھی وہ ٹکڑیوں میں اور ایک دوسرے سے الگ اور غیر مربوط انداز میں ہوتی تھی بلکہ انگریز کی کامیابی کا ایک بڑا راز یہ تھا کہ اُس نے پورے ہندوستان میں ایک ساتھ محاذ کھولنے کے بجائے ایک ایک کر کے مختلف علاقوں پر قبضہ کیا تا کہ یہ علاقے مل کر زیادہ بڑی قوت کے ساتھ اُس کے مقابل نہ آ سکیں۔ خود ان علاقوں کے ایک دوسرے سے کٹے ہوئے اور اکثر صورتوں میں ایک دوسرے سے دشمنی رکھنے والے حکمرانوں نے بھی الگ الگ ہی انگریز کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ بنگال ہو یا کرناٹک، مرہٹہ ہوں یا پنجاب اور سندھ کے حکمران، یہ سب الگ الگ ہی انگریز سے لڑے اور ظاہر ہے کہ ناکام رہے۔ یہی نہیں بلکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ ایک ریاست کے حکمرانوں نے کسی دوسری ریاست پر انگریز کی چڑھائی کے موقع پر انگریز کا حلیف بننا پسند کیا۔ ۱۸۵۷ء کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں پہلی بار مختلف ریاستوں کے درمیان اتحاد اور تعاون قائم ہوا۔ کچھ ریاستوں نے انگریز کا بھی ساتھ دیا مگر جو ریاستیں انگریز کے خلاف نبرد آزما ہوئیں انہوں نے کوشش کی کہ آپس میں تعاون کریں۔ اس باہمی اشتراک کی فضا نے جو گو کہ کچھ ہی عرصے تک قائم رہی اور بغاوت کی ناکامی پر ختم بھی ہوگئی، ہندوستان میں ایک متحدہ اُبھار کے ابتدائی نقوش اُجاگر کیے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ، چند بیرکوں میں ہونے والی شورش سے ایک وسیع بغاوت میں کس طرح تبدیل ہوئی اور اس کا دائرہ کار سپاہیوں سے بڑھ کر معاشرے کے مختلف شعبوں تک کس طرح پھیل گیا، اس کے لیے ہم کو اس بغاوت کے سماجی پس منظر کو سمجھنا ہوگا۔ خاص طور سے ہمیں ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی اقتصادی اور سیاسی ریشہ دوانیوں پر نظر ڈالنی ہوگی اور یہ دیکھنا ہوگا کہ کمپنی کی پالیسیوں نے ہندوستانی معاشرے پر کس قسم کے اثرات مرتب کیے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں تجارت کرنے کا پہلا چارٹر ۱۶۰۰ء میں ملا تھا۔ آئندہ برسوں میں اس نے ہندوستان میں رفتہ رفتہ اپنے قدم جمائے۔ سترہویں صدی میں کمپنی نے ہندوستان میں اپنے تجارتی ڈپو قائم کیے خاص طور سے سورت میں ۱۶۱۲ء میں اور مدراس میں ۱۶۳۹ء میں کمپنی کے ڈپو قائم ہوئے۔ ۱۶۶۹ء میں بمبئی لیز پر کمپنی کو دے دیا گیا۔ اس اہم اقدام کے بعد فورٹ ولیئم، کلکتہ میں ۱۶۹۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا کاروباری مرکز قائم ہوا۔ اسی زمانے میں کمپنی نے مقامی ریاستوں کے معاملات میں دلچسپی لینی شروع کی۔ اس ضمن میں دو چیزوں نے

اس کی مدد کی۔ ایک تو مغل مرکز کی بتدریج کمزوری نے مقامی حکمرانوں کو اپنی خودمختار اور آزاد حکومتیں بنانے میں کامیاب کر دیا تھا۔ یہ خودمختار ریاستیں اکثر آپس میں برسرِ پیکار رہتی تھیں۔ اس باہمی آویزش نے کمپنی کو اپنا راستہ نکالنے اور بین الریاستی جھگڑوں کو ہوا دے کر مطلب براری کا موقع فراہم کر دیا۔ کمپنی ایک ریاست کے حکمران کی طرفداری کرتے ہوئے دوسری ریاست پر چڑھائی کرواتی اور بدلے ہوئے حالات میں اپنی پچھلی حلیف ریاست کے خلاف صف آرا ہونے میں بھی اس کو دیر نہیں لگتی۔ دوسری اہم چیز جس نے کمپنی کو طاقتور بنایا وہ یہ حقیقت تھی کہ اس نے تجارتی راستوں کو محفوظ بنانے کے نام پر اپنی فوج بنالی۔ پلاسی کی جنگ نے اس کو ہندوستان میں پہلی مرتبہ ایک علاقے پر قابض کیا اور یوں کمپنی کی علاقائی طاقت جو بجائے خود اس کی عسکری طاقت کا نتیجہ تھی اس کی آئندہ پیش قدمیوں کا وسیلہ بنی۔ کمپنی کی اقتصادی پیش قدمیوں نے مقامی معیشت کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ مغل مرکزیت کا خاتمہ سماجی و اقتصادی اعتبار سے بھی ایک معنویت رکھتا تھا۔ رجنی پام دت کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی داخلی جنگیں بجائے خود اس حقیقت کی مظہر تھیں کہ ہندوستان کا سابق سماجی دروبست اور نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا جس کو بالآخر ایک نئے نظام کا پیش خیمہ بننا تھا۔ یہ نیا نظام ہندوستان میں بڑھتی ہوئی تجارتی سرگرمیوں، جہاز رانی اور نئے صنعتی مفادات کے گرد استوار ہونا تھا۔ مگر قبل اس کے کہ نوخیز سرمایہ دارانہ رشتے محکم ہوتے اور ہندوستان میں سرمایہ دارانہ نظام کی ٹھوس بنیاد پڑتی، برطانوی سرمایہ دارانہ مفادات جن کو ایک زیادہ ترقی یافتہ تکنیکی اور عسکری طاقت اور سماجی و سیاسی ارتباط کی پشت پناہی حاصل تھی، ہندوستان پر غالب آ گئے اور انہوں نے خود کو ایک پرانے معاشرے پر مسلط کر دیا۔[9]

برطانوی استعماری نظام میں بنگال کے انجذاب سے لے کر اٹھارویں صدی کے اواخر تک کمپنی کا مطمحِ نظر بنیادی طور پر یہی تھا کہ زیادہ سے زیادہ منافع کمایا جائے اور ہندوستان کے ایک زرخیز خطے پر اپنے تصرف سے بھرپور فائدہ حاصل کیا جائے۔ بنگال پر مکمل قبضے سے کمپنی کو جو تقویت حاصل ہوئی اُس نے اس کو اس لائق بنا دیا کہ کم سے کم قیمت پر زیادہ سے زیادہ اشیاء خرید سکے۔ صورت حال یہ تھی کہ کمپنی سے وابستہ تاجر، کسانوں اور کاریگروں پر حکم چلاتے تھے اور اپنی مرضی کی شرائط پر اُن سے اجناس اور مصنوعات حاصل کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ان کی ادا کردہ رقم اجناس اور مصنوعات کی اصل قدر کے ایک چوتھائی تک بھی چلی جاتی تھی۔

دوسرے لفظوں میں تجارت اور لوٹ مار کا فرق ختم ہوگیا تھا۔ اس لوٹ مار کی بہترین توثیق برطانوی پارلیمنٹ کے رکن سرجارج کارنی وال لوئیس (Sir George Cornewall Lewis) کے بیان سے ہوتی ہے جنہوں نے ۱۲ر فروری ۱۸۵۸ء میں پارلیمان میں یہ بیان دیا کہ 'صفحۂ ہستی پر آج تک کوئی ایسی مہذب حکومت نہیں گزری جو اتنی بدعنوان، نمک حرام اور حریص واقع ہوئی ہو جتنی کے ۱۷۶۵ء اور ۱۷۸۴ء کے دوران ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ثابت ہوئی'۔[۱۰]

لوٹ مار کا یہ عمل اس وقت ایک منظم نظام یا ایک باقاعدہ ادارے کے طور پر متشکل (institutionalised) ہوگیا جب ایسٹ انڈیا کمپنی کو ۱۷۶۵ء میں بنگال کی سول انتظامیہ یا دیوانی کا اختیار سونپ دیا گیا۔ مالیات کے نظم ونسق نے کمپنی کو لامتناہی لوٹ مار اور غبن کا موقع فراہم کردیا کیونکہ اب وہ اس لوٹ مار اور تاراجی کے لیے انتظامی ہتھکنڈوں کو استعمال کرنے اور ہیر پھیر کی پوزیشن میں آچکی تھی۔ بنگال کی اس تاخت وتاراج کا اچھا خاصا ماتم خود برطانیہ کے دارالعوام میں بھی کیا گیا اور بعض باضمیر انگریزوں نے اس پر خوب خوب لعن طعن کی۔

اٹھارویں صدی میں برطانوی معیشت میں ایک اہم قلبِ ماہیت یہ ہوئی کہ تجارتی سرمایہ بڑی تیزی کے ساتھ صنعتی سرمائے میں تبدیل ہوا۔ صنعتی انقلاب کی طرف تیز رفتار پیش رفت کے لیے انگلستان کو جس ارتکازِ سرمایہ کی ضرورت تھی اُس کو ہندوستان سے آنے والی دولت نے پورا کیا۔[۱۱] مگر تصویر کا دوسرا رُخ یہ تھا کہ خود ہندوستان کی اقتصادی صورتِ حال زبوں حالی کا شکار ہوگئی۔ ہندوستانی معیشت اور وسائل کی لوٹ مار نے آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کو بے روزگاری اور انتہائی افلاس سے دوچار کردیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی استحصالی پالیسیوں نے ہندوستانی معیشت کو تقریباً برباد کرکے رکھ دیا۔ روایتی بندوبستِ اراضی ختم کردیا گیا۔ مقامی چھوٹی صنعت اور دستکاری ختم ہوگئی، ہندوستانی تجارت پیشہ طبقہ اپنی خودمختاری سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ روایتی معیشت کی اس تباہی نے تمام ہی مقامی طبقوں کو مختلف درجوں میں متاثر کیا جس کے نتیجے میں بے چارگی اور مایوسی کی فضا عام ہوئی اور ایک بھرپور سماجی اُبھار کے اسباب پیدا ہوگئے۔

۱۷۷۰ء میں بنگال میں حالات اُس وقت مزید دگرگوں ہوگئے جب قحط کا دور دورہ ہوا۔ اس قحط کے نتیجے میں تقریباً ایک کروڑ افراد لقمہ اجل بنے۔ مگر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس قحط کے دوران زمین سے حاصل ہونے والے محصولات میں کمی نہیں بلکہ اضافہ ہوا کیونکہ کمپنی نے

محصولات کے حصول کے لیے انتہائی ظالمانہ ہتھکنڈے استعمال کیے۔[12]

جیسے جیسے ایسٹ انڈیا کمپنی کی قبضہ گیری کی پالیسی بنگال سے آگے بڑھ کر دوسرے علاقوں تک پہنچتی رہی، ویسے ویسے اس کا استحصال کا عمل بھی ترقی پاتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹ رویں صدی کے وسط تک ہندوستان کا ایک بڑا علاقہ اس کے قبضے میں آ چکا تھا۔ گو بنگال سب سے پہلے انگریزی استبداد کا شکار ہوا اور سب سے پہلے تباہی اور تاراجی بھی اسی کی ہوئی مگر بعد میں انگریزی قبضے میں آنے والے علاقوں میں جس پیمانے پر استحصال کیا گیا وہ بنگال سے کہیں زیادہ شدید تھا۔ مثلاً شمالی ہندوستان میں جو مہلواری نظام متعارف کیا گیا اور جس میں محصولات کی شرح میں مستقلاً اضافے کرتے رہنے کی گنجائش رکھی گئی، وہ بنگال اور بہار میں متعارف کیے جانے والے مستقل بندوبستِ اراضی سے کہیں زیادہ سخت گیر نظام ثابت ہوا۔ ۱۹ رویں صدی کے نصف اوّل میں، محصولات میں ۷۰ فیصد تک اضافہ ہوا۔ یہی نہیں بلکہ محصولات کے لیے اختیار کردہ یکطرفہ اور سخت گیر طریقوں کے نتیجے میں بڑی تعداد میں زمیندار اور کاشتکار زمینوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ استحصال کے اس تناظر میں یہ بات حیرت کا باعث نہیں ہونی چاہیے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت بنگال کی فوج میں کیوں ہوئی جس کے سپاہیوں کی اکثریت کی بھرتی آج کے یوپی کے مختلف علاقوں اور ہریانہ اور بہار سے ہوئی تھی۔ یہ سپاہی زرعی طبقات سے تعلقات رکھتے تھے اور یہی طبقات ایسٹ انڈیا کمپنی کی استحصالی پالیسیوں سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے تھے۔[13] یہی حقیقت اس امر کی بھی وضاحت کر دیتی ہے کہ فوج کے بیرکوں میں ہونے والی بغاوت، محض ایک فوجی بغاوت ہی کیوں نہیں بن کر رہ گئی اور آناً فاناً اس نے عوام کی حمایت اور پشت پناہی کیوں حاصل کر لی۔ فوجیوں کا ساتھ دینے والوں میں یہ زرعی طبقات سب سے آگے تھے۔ ان طبقات میں عام کسان اور زمیندار دونوں شامل تھے۔

بغاوت کا یہ سماجی اور کثیر الطبقاتی پس منظر ہی تھا جس نے لوگوں کے باہمی مذہبی اختلافات کو پس پشت ڈال دیا اور ہندو اور مسلمان دونوں ایک مشترکہ مقصد کے لیے یکجا ہو گئے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج نے اپنی تنظیم کاری میں اس پہلو کو خاص طور پر پیش نظر رکھا تھا کہ سپاہیوں میں بہت زیادہ تعلق باہمی پیدا نہ ہو۔ ہر رجمنٹ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو یکجا کرنے کا مقصد یہی تھا کہ اس طرح ان میں ثقافتی طور پر فاصلے برقرار رہیں گے۔

انگریز کی اس پالیسی کو اُس وقت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا جب کارتوسوں کے مسئلے نے ان دونوں کو متحد کر دیا اور پھر جب یہ بغاوت دیہی علاقوں تک پہنچی تو یہ علاقے کمپنی کے ہاتھ سے نکلنے لگے اور مقامی زمینداروں اور کسانوں کے پاس ان کا کنٹرول آ گیا۔ انگریزی افواج بمشکل اس کنٹرول کو ختم کروا سکیں۔

شہروں میں جس چیز نے انگریز مخالف رجحان کو تقویت پہنچائی وہ یہ عام شکایت تھی کہ ایسے شعبوں میں جو براہ راست طور پر انگریز کے کنٹرول میں تھے، ان میں مقامی آبادی کو ایک خاص سطح سے اوپر ترقی نہیں دی جاتی۔ سرسید احمد خان نے 'اسباب بغاوت ہند' میں اس پہلو کی خاص طور سے نشاندہی کی ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ مسلمانوں میں خاص طور سے یہ احساس محرومی پایا جاتا ہے کہ ماضی میں ان کو انتظامی شعبوں میں جو مقام حاصل تھا وہ اب باقی نہیں رہا ہے۔[14]

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے حوالے سے تاریخ نویسوں اور دوسرے علمی حلقوں میں ایک موضوع یہ بھی زیر بحث رہا ہے کہ کیا آزادی کی اس کاوش کو قومی جدوجہد اور قومی جنگ قرار دیا جا سکتا ہے؟ اس جنگ کے قومی ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں بحث اس وجہ سے شروع ہوئی کیونکہ آج قوم کی اصطلاح ایک خاص اور متعین مفہوم میں استعمال ہوتی ہے۔ ہم قومی ریاستوں کے دور میں رہ رہے ہیں اور یہ ریاستیں اس مفروضے پر تعمیر ہوتی ہیں کہ ان میں بسنے والے شہری سیاسی اعتبار سے ایک وحدت اور قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بعض ریاستوں نے اپنی وسیع تر قومی شناخت کے علاوہ ذیلی قومیتوں اور شناختوں کو بھی تسلیم کر رکھا ہے۔ قومی ریاستوں کے وجود میں آنے کے بعد ہی یہ رائے بھی قائم کی گئی کہ کیونکہ یہ جدید ریاستیں یورپ میں فیوڈل معاشرے کے خاتمے اور سرمایہ دارانہ نظام کے آغاز پر وجود میں آئیں لہٰذا ان ریاستوں سے منسوب قوموں کو بھی سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار قرار دیا گیا۔ ایک مرتبہ جب ماہرینِ علوم سیاست و سماجیات نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ قومیں یا قوم پرستی سرمایہ دارانہ نظام کا حاصل ہیں تو اس کے ساتھ ہی یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ سرمایہ دارانہ نظام سے قبل کے دور میں جو سیاسی اور سماجی جمعیتیں قوم کے نام سے پکاری جاتی تھیں یا جن کو آج بھی کچھ لوگ قوم کے طور پر پیش کرتے ہیں، اُن کی حقیقت کیا ہے؟ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی ایک ایسے دور کا واقعہ ہے جب کہ ابھی ہندوستان میں سرمایہ دارانہ سماجی رشتوں کو فروغ حاصل نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ قوم اور قومیت کے سرمایہ دارانہ نظام سے منسوب تصور کی

رُو سے تو یقیناً اس جنگ کو قومی جنگ کہنا ممکن نہیں ہے لیکن اس اصطلاح کو ایک وسیع تر اور آزادانہ مفہوم میں استعمال کرنے کا جواز کم از کم چار وجوہات کی بنا پر ضرور موجود ہے۔ اولاً یہ کہ اس جنگ سے ہندوستان کا ایک وسیع علاقہ متاثر ہوا اور دور دراز علاقوں کے لوگ اس جنگ کے حوالے سے باہم مربوط ہوئے یا کم از کم اُن میں ارتباط کا آغاز ہوا۔ اس جغرافیائی ارتباط کے ساتھ ساتھ دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس جنگ میں مختلف مذاہب کے ماننے والے شامل ہوئے جس کو بجائے خود ہندوستان گیر سطح پر ایک وسیع جمعیت سازی کی کاوش قرار دیا جا سکتا ہے۔

تیسری حقیقت جو قابلِ ذکر ہے وہ اس جنگ میں مختلف سماجی طبقات کا آپس میں اتحاد ہے۔ ان طبقات میں ہنر مند، کسان اور زمیندار سب شامل تھے۔ چوتھی بات یہ کہ ہندوستان کے ایک بڑے وسیع و عریض حصے پر مختلف مذاہب کے ماننے اور مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والوں نے یہ بغاوت بیرونی استعمار کے خلاف کی۔ اس جنگ کا یہ استعمار مخالف کردار اس کو وہ تشخص فراہم کرتا ہے جس کو کسی اور موزوں اصطلاح کی عدم موجودگی میں قومی جنگ قرار دیا جاتا ہے اور ایک عمومی مفہوم میں یہ کوئی ایسا غلط بھی نہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ کے اسباب جتنے فطری اور قابلِ فہم تھے، جنگ میں ہندوستانیوں کی شکست بھی اتنی ہی فطری اور ناگزیر تھی۔[۱۵] یہ جنگ ایسے فریقوں کے درمیان تھی جن میں غیر معمولی تفاوت پایا جاتا تھا۔ یہ دو نظاموں کے درمیان جنگ تھی۔ یہ ایک ترقی یافتہ استعماری طاقت جس کے پاس بہتر اسلحہ، جدید ٹیکنالوجی اور عمدہ تنظیم تھی اور ایک پسماندہ و منقسم ملک کے درمیان جنگ تھی۔ ہندوستان سیاسی اعتبار سے اُس وحدت سے محروم ہو چکا تھا جو سلاطین اور مغلوں نے فوجی طاقت کے بل بوتے پر قائم کی تھی اور جس کو منصب داری نظام کی اقتصادیات نے سہارا دے رکھا تھا۔ مغلوں کے زوال کے ساتھ ہندوستان کا یہ پرانا نظام کمزور ہونا شروع ہوا اور قبل اس کے کہ کوئی نیا نظام اس کے بطن سے جنم لیتا، ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان پر اپنا تسلط قائم کرنے اور ہندوستانی سیاست و معیشت کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے لیے آن موجود ہوئی۔ ۱۸۵۷ء میں اُس کو جو کامیابی ہوئی اُس کے بارے میں یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ یہ اُس کی فوجی کامیابی کا آغاز نہیں بلکہ اُس کی تکمیل تھی۔ اس کا آغاز ۱۰۰ سال پہلے بنگال سے ہو چکا تھا۔ اِن سو برسوں میں اُس نے ہندوستان کے تضادات سے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔ بیسیوں ریاستوں

کے ساتھ معاہدے کیے تھے اور اُن کے حکمرانوں کا اپنا مطیع بنالیا تھا۔ ان پر نظر رکھنے کے لیے کمپنی نے ان ریاستوں میں اپنے فوجی دستے تعینات کر رکھے تھے اور اِن میں برطانوی ریزی ڈینٹ تعینات کر دیئے تھے۔ اس توسیع پسندی اور مرحلہ وار قبضہ گیری کے تناظر میں دیکھیں تو حیرت اس بات پر نہیں ہونی چاہیے کہ ۱۸۵۷ء میں بہت سی ریاستوں نے بغاوت کا ساتھ نہیں دیا بلکہ حیرت کی بات یہ ہے کہ ہندوستان کے طول وعرض میں کمپنی کے عمومی تسلط کے باوجود ریاستوں کی ایک غیر معمولی تعداد نے بغاوت میں حصہ کیونکر لے لیا۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ ریاستیں تھیں جن کے حکمران مزید ذلت اور غلامی برداشت نہیں کر سکتے تھے یا پھر ان حکمرانوں پر اپنی ریاستوں کی رعایا کا غیر معمولی دباؤ تھا۔ مگر جب جنگ ہوئی تو انگریز نے اپنی وفادار ریاستوں کے حکمرانوں کو استعمال کیا اور اُن کے علاقوں سے فوج میں بڑی تعداد میں بھرتی بھی کی۔

پھر باغی سپاہی جن مقامی کمانڈروں کے تحت تھے وہ مختلف علاقوں میں ہونے کے سبب آپس میں کوئی مربوط حکمت عملی بھی وضع نہیں کر سکے۔ یہ جنگِ آزادی کسی تیاری اور منصوبہ بندی کے تحت نہیں ہوئی بلکہ بغاوت کے شعلے اچانک بھڑک اُٹھے اور باغیوں کو بھی بغاوت کے دوران ہی جیسی تیسی حکمت عملی بنانی پڑی۔ یہی نہیں بلکہ اُن کے پاس رسد کا بھی کوئی نظام نہیں تھا۔ جن علاقوں پر اُن کو کنٹرول حاصل ہو جاتا تھا وہاں امن وامان برقرار رکھنے اور غذائی صورتِ حال کو قابو میں رکھنے کی آزمائش بھی درپیش ہوتی تھی۔ مزید برآں بہادر شاہ ظفر کو باغیوں نے اپنا رہنما تو بنالیا تھا مگر ۸۵ سالہ بادشاہ قیادت کے لائق رہا نہیں تھا۔ بادشاہ نے جنرل بخت خان کو فوج کا سپہ سالار تو بنایا مگر خود شاہزادے بخت خاں سے تعاون کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ دہلی میں ابتری پھیلتی رہی اور شہر زیادہ عرصے تک مزاحمت نہیں کر سکا۔ دہلی کے سقوط کے ساتھ ہی بغاوت کا سیلاب اُترنے لگا۔ ایک کے بعد دوسرا علاقہ دوبارہ انگریزی تسلط میں آتا گیا تا آنکہ پورا ہندوستان مغلوب ہو گیا۔

حوالہ جات وحواشی

۱) ملاحظہ ہو: غلام رسول مہر، 'اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد' (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۲ء)

۲) سلیم قریشی اور سید عاشور کاظمی نے اپنی کتاب میں ایسے ہندوستانی مخبروں کے ۱۴۳ خطوط نقل کیے ہیں جو انگریز کے لیے مخبری کرتے تھے اور شاہی قلعے کے اندرونی حالات اور باغیوں کی نقل وحرکت کی اطلاع انگریزوں کو پہنچاتے تھے۔ ان مخبروں میں ہندو، مسلمان اور سکھ سب ہی شامل تھے۔ ان کی فراہم کردہ اطلاعات ہندوستانیوں کی بغاوت کو کچلنے میں انگریز کے بہت کام آئیں۔ ملاحظہ ہو: 'اس گھر کو آگ لگ گئی (غداروں کے خطوط)' (نئی دہلی: انجمن ترقی اردو، ہند، ۱۹۹۳ء)۔

3) Benjamin Disraeli, 'Military Mutiny or National Revolt?', in Ainslie T. Embree (ed.), *1857 in India Mutiny or War of Independence?* (Boston: D.C. Heath and Company, 1963), pp.4-5.

۴) بغاوت کے عروج کے وقت ہندوستان کا تقریباً ایک لاکھ مربع میل کا علاقہ باغیوں کے کنٹرول میں تھا۔ ملاحظہ ہو:

Hiran Mukherjee, '1857 and our Struggle for Freedom', *New Age* (1857 Centenary Special), Vol.VI, No.8, August 1957, p.7.

۵) منقولہ: پی سی جوشی، 'ہماری تاریخ میں ۱۸۵۷ء'، مشمولہ: پی سی جوشی (مرتب)، 'انقلاب اٹھارہ سو ستاون' (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۸۳ء)، ص ۱۸۳۔

۶) ملاحظہ ہو: غلام رسول مہر، '۱۸۵۷ء پاک و ہند کی پہلی جنگِ آزادی' (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۷ء)

۷) پی جے او ٹیلر نے ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۹ء کے دوران ہندوستان میں بغاوت اور اس کو کچلنے سے متعلق تفصیلات کو تاریخ وار مرتب کیا ہے۔ یوں آشوب کے ان دنوں کا ایک مکمل خاکہ اُبھر کر قارئین کے سامنے آجاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

P.J.O. Taylor, *What Really Happened During the Mutiny: A Day-by-Day Account of the Major Events of 1857-1859 in India* (Delhi: Oxford University Press, 1997).

۸) تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: خواجہ حسن نظامی، 'بیگمات کے آنسو' (ملتان: بیکن بکس،

۲۰۰۷ء)، اور راقم الدولہ سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی، '۱۸۵۷ء کے چشم دید حالات' (لاہور: مکی دارالکتب، ۲۰۰۲ء)۔

9) R. Palme Dutt, *India Today* (Lahore: Book Traders, 1979), p.98.

10) Quoted in *ibid.*, p.103.

11) *Ibid.*, p.109.

12) *Ibid.*, p.107.

۱۳) مشہور مصنف ایرک اسٹوکس نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو بنیادی طور پر کسانوں کی مسلح بغاوت کے طور پر پیش کیا ہے اور تفصیلی طور پر اس امر کی وضاحت کی ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اقتصادی ریشہ دوانیوں نے کس طرح ہندوستانی زرعی معیشت کو تاراج کر کے تمام زرعی طبقات بالخصوص کسانوں کو اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ ملاحظہ ہو:

Eric Stokes, *The Peasant Armed: The Indian Rebellion of 1857* (Oxford: Clarendon Press, 1986).

۱۴) ملاحظہ ہو: سر سید احمد خان، 'اسباب بغاوت ہند' (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء)

۱۵) ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے اسباب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس موضوع پر پی سی جوشی کے محولہ بالا مضمون کے علاوہ ملاحظہ ہو:

Hira Lal Gupta, 'Why the Great Revold Failed' in Ainslie T. Embree (ed.), *op.cit.*, pp. 69-72.

انیسویں صدی کے وسط میں برطانوی صورتِ حال

اشفاق سلیم مرزا

یہ بحث اس سلسلے کی ایک کڑی ہے کہ 1857ء کی جنگ آزادی میں برطانوی افواج کو فتح کیوں ہوئی جبکہ ہندوستان میں جگہ جگہ قوم پرستوں نے ان کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا تھا۔

سرسید احمد خاں نے اسباب بغاوتِ ہند میں ہند برطانوی تعلقات کے حوالے سے اس بات کا ایک اجمالی جائزہ لیا ہے کہ بغاوت ہند کے اصل اسباب کیا تھے۔لیکن شکست کے اسباب کا ذکر نہیں کیا گیا۔کئی ایک دوسرے مصنفین نے بھی شکست کے اسباب کا جائزہ لینے کی کوشش تو ضرور کی ہے لیکن یہ سب جائزے ہندوستان کے دائرہ کار کے اندر ہی گھومتے ہیں۔من حیث المجموع برطانوی سلطنت کی بین الاقوامی سطح پر کیا حیثیت تھی،اس پر کم توجہ دی گئی ہے۔

ہمیں یہاں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس وقت عالمی منظر پر برطانیہ کی کیا آب وتاب تھی اور وہ کیا معاشی،سماجی اور سیاسی عوامل تھے جن کی بنا پر برطانوی قوم نے دنیا کے بڑے خطوں کو زیر نگیں کر لیا تھا۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں اور مارکس نے بھی کہا تھا کہ اس وقت عظیم مغلیہ سلطنت کو تو ان کے گورنروں نے بھی الوداع کہہ دیا تھا اور رہی سہی کسر مرہٹوں نے پوری کر دی اور پھر مرہٹوں کو افغانیوں نے آ کر تہس نہس کر دیا،تو یہ ایک عجیب افراتفری کا منظر نامہ تھا جو انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستان میں دیکھنے میں آ رہا تھا۔

گو قوم پرست تاریخ دان حب وطنی کے زیر اثر اور بہت سی دلیلیں سامنے لاتے ہیں لیکن ہندوستان کے کمزور سماج کا پورا منظر نامہ پیش کرنے سے کتراتے ہیں۔آیئے ہم دیکھتے ہیں کہ ایک فاتح قوم یعنی برطانیہ کی انیسویں صدی کے وسط میں کیا صورتِ حال تھی تا کہ ہمیں یہ اندازہ ہو سکے کہ ان کی فتح میں شامل دیگر عوامل کیا تھے۔

کے ایم پانیکر کا کہنا ہے کہ اگر چہ ہندوستان کی فتح صرف 1858ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی لیکن 1818 تک یہاں برطانیہ کے قدم جم چکے تھے۔برطانیہ میں صنعتی انقلاب آ چکا تھا۔نپولین کے بعد کے دور میں وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ بحرالکاہل تک اپنا اثر ورسوخ بڑھا لے۔(Pannikar 1953.95)

دنیا کے چار براعظموں میں وسیع علاقے اس کے مقبوضات میں شامل تھے۔ پورا جنوبی ایشیا بشمول سری لنکا اور برما، اس نوآبادیات کا حصہ تھے۔ اس کے علاوہ آسٹریلیا، کینیڈا، کرے بین، لاطینی امریکہ اور افریقہ کے بہت سے ممالک پر اس کا قبضہ تھا۔ گو برطانیہ میں بھی سامراج دشمن مکتب فکر کے حامی موجود تھے اس کے باوجود مقبوضات میں ایک اندازے کے مطابق 1815ء سے لے کر 1865ء تک ہر سال ایک لاکھ مربع میل کا اضافہ ہوا۔ ان میں کچھ تو فوجی اہمیت کے حامل علاقے تھے جیسے سنگاپور، عدن، فاک لینڈ، ہانگ کانگ، لاگوس۔ دوسرے زیادہ تر وسیع زمینوں پر قبضہ کرنے والے سفید فام مہاجرین کی ہوسِ کشور کشائی کا نتیجہ تھے۔ (Shaw 1970-2)

صنعتی انقلاب کے بعد برطانیہ نے پوری دنیا میں ایک مقتدر قوت کے طور پر خود کو تسلیم کروالیا۔ معاشی میدان میں جو اعداد و شمار ہمارے سامنے آتے ہیں اگر ان کا موازنہ باقی مغربی طاقتوں کے ساتھ کیا جائے تو وہ منظر نامہ سامنے آجاتا ہے جس کی وجہ سے وہ ایک مستحکم نوآبادیاتی طاقت کے طور پر خود کو منوا رہا تھا۔

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ 1850ء سے 1873ء کے عرصہ میں برطانیہ میں غیر معمولی صنعتی ترقی ہوئی۔ وہ ایک بڑی صنعتی طاقت بن گیا تھا اور اکثر اس کے لیے یہ کہا جاتا تھا کہ وہ دنیا کی ورکشاپ ہے۔ اس دوران برطانیہ میں کوئلے، ٹیکسٹائل، جہاز سازی، لوہے اور فولاد کی پیداوار میں بہت اضافہ ہوا۔ اکتوبر 1851ء میں مئی اور اکتوبر کے مہینوں کے درمیان ہائیڈ پارک لندن میں تمام اقوام کی صنعتی اشیاء کی بڑی نمائش کا انعقاد کیا گیا۔ اس نمائش سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ برطانیہ صنعتی پیداوار کے حوالے سے سب سے آگے ہے۔

اگر ہم اس کا جائزہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے لیں تو یہ پتہ چلے گا کہ صنعتی مزدوروں میں 1851ء سے لے کر 1871ء کے سالوں میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

	1851ء	1871ء
کوئلے کی کان کن	193111	315398
لوہے اور فولاد کی صنعت	95350	191291
سوتی کپڑے کی صنعت	414998	509715

انجینئرنگ اور جہاز سازی	80528	172948

(Taylor 1989.42)

آر ہیم (R. Hyam) کہتا ہے

''شمالی امریکہ اور روس کے میدان ہمارے غلے کے کھیت ہیں۔ شکاگو اور اوڑیسہ غلے کے گودام ہیں جبکہ کینیڈا اور بالٹک کے جنگل ہمارے لیے لکڑی مہیا کرتے ہیں۔ آسٹریلیا میں ہمارے بھیڑوں کے فارم ہیں۔ جبکہ ارجنٹائن اور شمالی امریکہ میں ہمارے بیل پلتے ہیں۔ پیرو ہمیں چاندی بھیجتا ہے اور سونا ہمیں جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا سے آتا ہے۔ ہندوستان اور چین ہمارے لیے چائے پیدا کرتے ہیں۔ جبکہ کافی، مصالحہ جات اور شکر ہمیں انڈیز سے آتے ہیں۔ سپین اور فرانس ہمارے لیے انگور پیدا کرتے ہیں جبکہ بحیرہ روم ہمارے لیے پھلوں کا باغ ہے اور کپاس، جس کے لیے جنوبی امریکہ کے خطے مخصوص تھے۔ اب دوسرے گرم علاقوں میں بھی پیدا ہو رہی ہے۔ (Kennedy 1995.194)

اینگلز نے برطانیہ کی ترقی کے بارے میں جو اعداد و شمار دیئے ہیں وہ بھی اسی پہلو کو نمایاں کرتے ہیں۔

1771-75 کے دوران انگلینڈ پچاس لاکھ پاؤنڈ سے بھی کم خام روئی درآمد کرتا تھا جبکہ 1844 میں یہ درآمد 60 کروڑ پاؤنڈ سے بھی زیادہ ہوگئی۔ 1834 میں انگلینڈ نے 55 کروڑ 60 لاکھ کی بنی ہوئی اشیا درآمد کیں جبکہ اس کے علاوہ 76 کروڑ 50 لاکھ پاؤنڈ کا سوتی دھاگہ اور ایک کروڑ بیس لاکھ پاؤنڈ مالیت کی ہوزری درآمد کی۔ اس وقت روئی کی صنعت کے ساتھ 15 لاکھ کے قریب مزدور منسلک تھے۔

شہروں کی آبادی میں بھی یک دم اضافہ ہوگیا۔ اس وقت مانچسٹر اور لیورپول میں کل آبادی 7 لاکھ سے تجاوز کرگئی تھی۔ آبادی میں جو اضافہ ہوا دوسرے شہروں میں کچھ یوں تھا۔

(Mark-Engeles 1962. 41-43)

	1801ء	1831ء
ہیلی فیکس	63000	1110000
بریڈفورڈ	29000	77000

ہڈرس فیلڈ	15000	34000
لیڈز	53000	123000

1851-81ء کے دوران لندن کی آبادی میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ وہ 25 لاکھ سے بڑھ کر 39 لاکھ ہوگئی۔ برلن کی آبادی 1849ء میں چار لاکھ کے قریب تھی جو 1875ء میں دس لاکھ ہوگئی۔ پیرس کی آبادی 1851 میں دس لاکھ تھی یہ 1881ء میں 19 لاکھ ہوگئی۔ (Hobsbawn 2004. 248)

شہروں میں آبادی میں اضافے کی بڑی وجہ صنعتی اداروں میں اور پیداوار میں اضافہ تھا۔ برطانیہ میں کوئلے کی پیداوار 1855ء میں 60 ملین ٹن تھی جو 1870ء میں بڑھ کر 109 ملین ٹن ہوگئی۔

لوہے کی پیدوار 1855ء میں 2.9 ملین ٹن تھی جو 1875ء میں بڑھ کر 5.9 ملین ٹن ہوگئی۔

اسی طرح سوتی کپڑے کی پیداوار میں بھی اضافہ ہوا۔ 1851ء میں 46 ملین پاؤنڈ مالیت کا کپڑا تیار ہوتا تھا جس کی مالیت 1871ء میں 105 ملین پاؤنڈ ہوگئی۔ ریلوے کی پٹڑی جس کی طوالت 1850ء میں 9500 کلومیٹر تھی 1875ء میں بڑھ کر 22000 کلومیٹر ہوگئی۔ اسی طرح بحری جہازوں کی Tonnage اسی عرصہ کے دوران 2.9 ملین ٹن سے بڑھ کر 4.9 ملین ٹن ہوگئی۔

1870 میں صنعتی پیداوار میں ہر سال % 3.5 کے حساب سے اضافہ ہوا۔ (Taylor 1989.419-20)

1760ء اور 1830ء کے درمیان یورپ کی صنعتی پیداوار میں برطانیہ کا حصہ دو تہائی تھا اور دنیا کی پیداوار میں اس کا حصہ 1.9% سے بڑھ کر 9.5% ہوگیا تھا۔ اگلے تیس سالوں میں اس کا حصہ 19.9% ہوگیا۔ 1860ء میں صورت حال کچھ یوں تھی کہ برطانیہ پوری دنیا کی پیداوار کا 53% لوہا اور 55% کوئلہ اور لگنائٹ پیدا کر رہا تھا جبکہ اس وقت خام روئی کی کل پیداوار کا 50% اپنے تصرف میں لا رہا تھا۔ اس وقت اس کی آبادی دنیا کا کل 2% تھی اور یورپ کی آبادی کا صرف 10% تھی۔ ان شماریات کی کوئی حد نہیں۔ لیکن پھر بھی یہ بتانا ضروری

ہے کہ دنیا کہ تجارت کا 1/5 حصہ اس کے قبضے میں تھا جبکہ مصنوعات میں یہ شرح 2/5 تھی اور دنیا کے ایک تہائی بحری جہازوں پر برطانوی جھنڈا لہراتا تھا۔

GNP - PER Capita

	1860	US. DOLLAR
Braitain برطانیہ	558	US. DOLLAR
Italy اٹلی	301	US. DOLLAR
France فرانس	365	US. DOLLAR
Germany جرمنی	354	US. DOLLAR
Russia روس	178	US. DOLLAR

سماجی اور سیاسی صورتِ حال:

صنعتی انقلاب کے بعد سماجی ڈھانچہ بدل چکا تھا لیکن جاگیردارانہ دور کے بہت سے ادارے ابھی تک پرانے نظام کے تحت چل رہے تھے۔ برطانوی پارلیمنٹ اپنے چناؤ کے لحاظ سے اقلیت کی نمائندہ رہی تھی۔ یہ پس منظر میں جانے والا طبقہ ابھی پارلیمنٹ پر قابض تھا۔ 1815ء تک ووٹ کا حق صرف آبادی کے 3% لوگوں کو حاصل تھا۔ دستکاروں اور مزدوروں کی ایک کثیر تعداد ووٹ کے حق سے محروم تھی۔ بعض مقامات پر پورے کے پورے نئے صنعتی شہروں کو پارلیمنٹ میں کوئی نمائندگی حاصل نہیں تھی۔ مثلاً انیسویں صدی کی اولین دہائیوں میں لیڈز، بریڈ فورڈ، شفیلڈ کا پارلیمنٹ میں کوئی نمائندہ نہیں تھا۔ زرعی جنوبی علاقے کے پاس پارلیمنٹ میں 50% نمائندگی تھی۔

یہ صورتِ حال اس بات کا تقاضہ کرتی تھی کہ پارلیمنٹ میں نمائندگی کے تناسب کو بدلا جائے اور نئے سرمایہ دارانہ نظام کے تحت ابھرنے والے طبقات کو پارلیمنٹ میں نمائندگی دی جائے۔ ایک عوامی ابھار کے تحت اس بات کا تقاضا کیا گیا کہ پارلیمانی نظام میں اصلاحات کی ضرورت ہے۔

انیسویں صدی کی پہلی دہائیوں میں بہت سی ایسی اصلاحات کی گئیں جو پارلیمانی نظام اور جمہوریت کی نشوونما کے لیے سازگار تھیں۔ 1833ء میں غلامی کو ختم کر دیا گیا۔ اسی سال فیکٹری

ایکٹ بھی منظور کیا گیا۔ چائلڈ لیبر کے لیے اوقات کار میں کمی کی گئی اور یہ بھی کہا گیا کہ کارخانوں کے اوقات کار کے بعد ان بچوں کی تعلیم کے لیے سہولتیں مہیا کی جائیں۔ غریب بچوں کی تعلیم کے لیے فنڈ مخصوص کیے گئے۔ 1850ء میں مزدوروں کے اوقات کار کے طور پر ½ 10 گھنٹے کا دن منظور کیا گیا۔

انہی سالوں میں پریس کی آزادی کی طرف مناسب قدم اٹھائے گئے اور The Poor Man's Guardian کی شکل میں جو اخبار نکالا گیا وہ بہت مقبول ہوا۔ سستے سیاسی کتابچے چھاپنے کی اجازت بھی مل گئی۔ (Code 1965-308.9)

1832-1901ء کے دوران میں جو ادب تخلیق ہوا وہ اپنے سماجی حالات کی صحیح عکاسی کرتا تھا۔ اس دور میں سائنسی علوم، ایجادات اور جمہوریت کے استحکام کے لیے جو کام ہوا اس نے ادب کے مزاج کو بھی بدل ڈالا۔ ڈارون کی Origion of Species بھی اسی دور کی پیداوار ہے۔ چارلس ڈکنز جو انگریزی ادب کا سب سے بڑا ناول نگار سمجھا جاتا ہے، اسی دور میں اپنی تخلیقات کو عوام کے سامنے لا رہا تھا اور بدلتے ہوئے سماج کے مختلف رنگ اس میں نظر آ رہے تھے۔ اس کے علاوہ برونٹے سسٹرز (Bronte Sisters)، تھیکرے (Thackery)، کنگزلے (Kingslay) اور ریڈ بھی پیدا ہوئے۔ صنعتی انقلاب کے منفی پہلوؤں کو ڈکنز نے خوب نمایاں کیا۔ اس کے ادب پاروں میں ایک عام آدمی کی تصویر کشی کی گئی جو اشرافیہ سے علیحدہ اپنی شناخت رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ نئی سائنسی اور عقلی اقدار کی ترجمانی کی گئی۔

عسکری قوت:

جہاں تک عسکری قوت کا تعلق ہے، 1816 سے لے کر 1866 تک کے پچاس سالوں میں برطانوی عسکری قوت میں بھی بے پناہ اضافہ ہوا۔ 1816 میں برطانوی افواج کی کل تعداد 255000 تھی جو کہ 1860 میں بڑھ کر 347000 ہو گئی۔ جبکہ روس اور فرانس کی فوج کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی لیکن رقبے کے لحاظ برطانوی مقبوضات ان دونوں طاقتوں سے کہیں زیادہ تھیں۔

Michigan University Corelation of war cited in

Kennedy 1995. 729 گوان دنوں جنگی اور عسکری اخراجات معاشی نشوونما کی نسبت کم تھے پھر بھی 1860 کی دہائی میں یہ (1840)15 ملین پاؤنڈ سے بڑھ کر 27 ملین پاؤنڈ ہو گئے تھے۔ افواج میں اس عسکری قوت کے علاوہ دیگر نوآبادیات میں بھی مقامی فوجیوں کی ایک کثیر تعداد انگریز فوجیوں کے ساتھ منسلک تھی۔

یہ صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ برطانیہ بین الاقوامی سطح پر ایک طاقتور قوت کے طور پر اُبھر کر سامنے آ رہا تھا۔ گو یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے اس کی معاشی طاقت کے پیچھے نوآبادیات کی لوٹ کھسوٹ کے عناصر غالب تھے۔ پھر بھی اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ برطانیہ کی سائنسی اور تکنیکی ترقی کے علاوہ پیداواری قوتوں نے جو سماجی اور سیاسی تبدیلیاں کیں وہ نوآبادیات میں اس کے دیرپا قیام اور ایک استبدادی قوت کے طور پر قائم رہنے کا باعث بنیں۔ اس دوران ہم مسلسل اپنے زوال کی نوحہ گری کرتے رہے۔

Bibliography کتابیات

1- Pannikar, K.M. Asia and Western Dominance, London 1953.

2- Kennedy, Paul The Rise and Fall of the Great Powers, Seres Book Club Lahore. Reprint of Fontana Press. 1989.

3- Shaw, A.G.L. Great Britain and the Colonies, (1815-1865) London. 1970.

4- Hobsbawm, E. The Age of Capital (1848-1875), London. 1975.

5- Crafts, N.F.R. British Economic Growth During the Industrial Revolution, Oxford 1985.

6- Taylor, W.D Economic and Social History, Macmillan, London 1988.

7- Trevelayn, G.M. Shortened History of England, Penguin Books Harmond & worth 1965.

8- Southgate G.M. Modern English History (1714-1980), J.M. Deul & Sons. London 1965.

ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی اور مارکس

محمد ابوالفضل

جب ہوچی منہ ستائیس سال کے سن میں پہلی بار فرانس گئے تو ان کو یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ ویت نام کے فرانسیسیوں کے برعکس، فرانس کے لوگ مغرور اور بدتمیز نہیں تھے بلکہ فرانسیسی سوشلسٹ ان کو ''کامریڈ'' کہہ کر مخاطب ہوتے تھے اور سوشلسٹ لیڈر ژاں لونگے نے، جو مارکس کے نواسے تھے، ان کے مضامین اپنے ہفتہ وار اخبار ''پوپولیئر'' (Le Populaire) میں چھاپے۔ ہاں فرانسیسی نوآبادیات کی آزادی کے بارے میں فرانسیسی سوشلسٹوں میں اختلاف تھا۔ اس کا دایاں بازو، بشمور لونگے، یہ سمجھتا تھا کہ نوآبادیات کی رجعت پسند قوم پرستی کی حمایت سامراجی ممالک کے مزدور طبقے کے مفادات کی قیمت پر نہیں کی جاسکتی۔ جبکہ اس کا بایاں بازو، جس کے لیڈر وئیاں کوتوریئے (Vaillant Couturier) تھے کہتا تھا کہ یہ بات قومی آزادی کی ہے جس کی حمایت سوشلسٹوں کو کرنی چاہیے۔

مارکس ہندوستان کی آزادی کے حامی تھے لیکن ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کو آزادی حاصل کرنے کے لیے اندرونی اتحاد کی ضرورت ہے اور یہ اتحاد بورژوا طبقہ ہی پیدا کرسکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۸۵۳ء میں نیویاک ڈیلی ٹریبیون میں لکھا تھا کہ انگریزوں نے ہندوستان میں ریلوے، ٹیلیگراف، آزادصحافت اور زمین کی نجی ملکیت کی بناء ڈال کر وہاں کے عوام کی سماجی ترقی اور ذہنی آزادی کے لیے مادی بنیادیں فراہم کردی ہیں۔ سب سے اہم دیسی فوج کی تخلیق ہے جو اس کی آزادی حاصل کرنے کے لیے لازم شرط ہے۔ لیکن ہندوستانی ان جدتوں کا فائدہ صرف دو صورتوں میں اٹھا سکتے ہیں۔ یا تو اپنے کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرلیں یا خود انگلستان میں پرولتاری انقلاب آجائے۔ اس کے بعد ۱۸۵۸ کے شروع میں جب ابھی ہندوستان میں بغاوت جاری تھی، انہوں نے اینگلز کو لکھا کہ اگر ہندوستان کی بغاوت کی وجہ سے انگلستان کو سپاہی اور نقد وہاں بھیجنا پڑ رہا ہے تو ہندوستان انگلستان کے مزدور طبقے کا بہترین حلیف ہے۔

جنگِ آزادی کے دوران مارکس اور اینگلز نے ٹریبیون میں جون ۱۸۵۷ اور ستمبر ۱۸۵۸ کے درمیان اس موضوع پر اٹھائیس مضامین لکھے۔ یہ تبصرے عموماً واقعے کے ڈیڑھ یا دو ماہ بعد چھپتے

تھے کہ باوجود تار برقی کے بچھ جانے کے پریس کی مفصل رپورٹیں ابھی دخانی کشتیوں ہی سے جاتی تھیں۔ ان مضامین میں ہندوستان کے واقعات پر تبصرہ اور تجزیہ بھی ہوتا تھا لیکن کوئی تھیوریٹیکل بحث نہیں ہوتی تھی کہ غالباً روزناموں کے پڑھنے والوں کو اس سے دلچسپی نہ ہوتی۔

مارکس کے زمانے میں ہندوستان سے تجارت شروع ہوئے ساڑھے تین سو سال ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود ہندوستان سے متعلق سماجی نوعیت کی معلومات یورپ میں کم تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مثلاً مارکس کی ''ایشیائی طریقِ پیداوار'' کی تھیوری اتنی حقائق پر مبنی نہیں تھی جتنی کہ حقیقی معلومات کی کمی کے خلاء کو پر کرنے کی ایک منطقی کوشش تھی۔

صحارہ مغربی افریقہ سے لے کر ہندوستان کے قلب تک پھیلا ہوا ہے۔ وہاں زراعت کے لیے، جہاں جہاں وہ ہوتی ہے، پانی کی فراہمی آبپاشی کے مشکل اور پھیلے ہوئے نظام پر منحصر ہے۔ اس نظام کی تعمیر اور نگہداشت سخت انتظامی مرکزیت کی متقاضی ہے جس کے لیے وہاں استبدادی طرزِ حکومت کی بنیاد پڑی۔ یہ اس قدر قوی ہے کہ اس کے ماتحت سماج میں کوئی خود اختیار تبدیلی ممکن نہیں رہی۔ نتیجتاً ہندوستان ابھی ابتدائی سماج سے نکلنے کی کوشش میں اٹکا ہوا ہے۔

اس نظام کی بنیاد مارکس نے ہندوستان کے خود کفیل گاؤں کو قرار دیا جہاں، بقول ان کے زراعت اور صنعت ابھی علیحدہ نہیں ہوئے تھے۔ ان کے مطابق ہندوستان میں مرکزی اقتدار گاؤں پر حاکم تھا لیکن گاؤں کے اندرونی ڈھانچے میں دخل نہیں دیتا تھا اور یہ گاؤں خود مختار تھے۔

خود مختار گاؤں کی تھیوری انہوں نے پرتگالیوں سے لی تھی جو ہندوستان میں پہلے یورپی تاجر تھے لیکن جو بڑی تعداد میں ہندوستان کے اندرونی علاقوں میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ مارکسیوں کو ایشیائی طریق پیداوار کی بہت تلاش رہی۔ بیسویں صدی میں شمالی ویت نام کے ایک حصے میں اور اس کے ملحقہ چین کے علاقے میں اس کا کچھ سراغ ملا۔ آخر روسی مورخ اس پر راضی ہوئے کہ عہد وسطیٰ میں ہندوستانی معاشرہ جاگیردارانہ دور میں تھا لیکن چونکہ اس کی بہت سی منفرد خصوصیات تھیں اس لیے اس کو ہندی جاگیرداری کا نام دیا گیا۔ بہرحال اس سے یہ ضرور ثابت ہوا کہ ہندوستان ابتدائی سماج کے دور میں نہیں اٹکا تھا بلکہ وہاں سماجی تبدیلیاں ہوئی تھیں۔

مارکس نے ٹریبیون میں ہندوستان پر جو مضامین ۱۸۵۳ء میں لکھے تھے انہیں انہوں نے ہندوستان پر سامراجی یلغار کا تجزیہ کہا تھا۔ ایک مضمون میں انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی تاریخ

اور ہندوستان میں اس کی حکومت کے بارے میں کہا کہ انگریز ہندوستان میں جو غربت لائے وہ وہاں پر موجود غربت سے بنیادی طور پر مختلف تھی کہ اب نئی غربت کا منبع کاریگر سے ذرائع پیداوار چھن جانے میں تھا۔

نیز انگریزوں نے ہندوستانی سماج کو تہس نہس کر کے اس کی جگہ کوئی تعمیر نہ کی۔ ہمیشہ سے حکومت میں تین اہم محکمے ہوتے تھے: مالیات، جنگ، رفاہ عامہ۔ چونکہ ۱۸۵۷ء تک ہندوستان میں انگریزی کمپنی کی حکومت تھی جس کو صرف زیادہ سے زیادہ پیسہ کھینچنے سے دلچسپی تھی۔ اس لیے اس نے مالیات اور جنگ کا کام تو اپنا لیا لیکن رفاہ عامہ کے کسی کام سے تعلق نہ رکھا۔ اس طرح ہندوستانی معاشرے کی اپنے معاشی ڈھانچے کو دوبارہ وجود میں لانے کی سکت کمزور ہوتی گئی۔ اقتصادی طور پر انہوں نے ہندوستانی کپڑے کو یورپ سے نکالا، پھر انگریزی کپڑا ہندوستان لائے اور اس طرح ہندوستانی دستکار کو زراعت میں واپس دھکیل دیا۔

بقول مارکس، ایسٹ انڈیا کمپنی انگلستان میں تجارتیت کے دور میں بنی تھی۔ یہ انگلستان کے جاگیردار طبقے کے خلاف تجارتی دولت کی فتح تھی۔ ہندوستان میں کمپنی کو علاقائی بالادستی یورپ کی سات سالہ جنگ (۶۳-۱۷۵۵) کے دوران حاصل ہوئی جب ۱۷۵۷ میں پلاسی کی لڑائی کے بعد بنگال کے وسائل پر قبضے کی بدولت ہندوستان میں کوئی اس کے مقابلے کے قابل نہ رہا۔ ۱۷۹۹ء میں میسور کی فتح کے بعد یہ بالادستی مکمل ہوگئی۔

(رنجیت سنگھ کا پنجاب طفیلی ریاست تھا، جیسے اودھ)

انیسویں صدی کے شروع میں جب کہ صنعتی انقلاب طاقت پکڑ چکا تھا۔ انگلستان میں صنعتی بورژوا طبقے کی طاقت بڑھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہندوستان سے تجارت کی اجارہ داری کے خلاف تھا۔ چنانچہ ۱۸۳۴ء میں کمپنی کا تجارتی کردار ختم کر دیا گیا اور اب اس کا سارا منافع صرف ہندوستان کے زرعی محصولات سے آتا تھا، اس کے علاوہ وہ ہندوستانی افیون چین میں بیچتی تھی۔

مگر اب انگریز صنعتی سرمایہ دار کو ضرورت محسوس ہوئی کہ ہندوستان میں کپڑا سازی کی صنعت کی تباہی کے بعد کوئی ایسی پیداوار ہونی چاہیے جس سے وہ انگریزی کپڑے کی درآمد کے لیے ادائیگی کر سکے۔ تب ہندوستان میں عام ذرائع حمل و نقل، تار برقی، آبپاشی، اور دیگر ترقیاتی کام شروع کیے گئے۔

خود جنگِ آزادی پر مارکس اور اینگلز نے اپنے مضامین میں کوئی تھیوریٹیکل تجزیے پیش نہیں کئے کہ وہ روزنامے کے لیے لکھ رہے تھے جس کے زیادہ پڑھنے والوں کو تبصرے سے دلچسپی ضرور تھی لیکن کسی گہرے تجزیے سے نہیں۔

ہندوستان کی جنگ آزادی پر اپنے پہلے تبصرے میں مارکس نے لکھا کہ انگریزوں نے ہندوستان کو فتح کرنے اور بعد میں اس پر حکومت کرنے کے لیے دیسی فوج تشکیل دی جو کہ مزاحمت کا پہلا عام مرکز بن گئی۔ مگر انہوں نے یہ نوٹ کیا کہ میرٹھ سے جو فوج دہلی پہنچی اس کی نہ کوئی سیاسی مرکزی قیادت تھی اور نہ ہی فوجی۔ انہوں نے کہا کہ بغاوت بے ساختہ ہوئی تھی اور اس میں ہندو مسلمان سکھ سبھی متحد تھے اور ان کے پاس گولہ بارود وغیرہ وافر تھا۔ ان کی سب سے اہم کمزوری جو بعد میں فیصلہ کن ثابت ہوئی، تنظیم کا فقدان تھی۔

باغی فوجیوں کے دہلی پہنچتے ہی، جہاں انگریزی فوج نہیں تھی، انگریزوں نے تین ہزار فوج دہلی کے مغرب میں ایک پہاڑی پر جمع کر دی۔ کہا گیا کہ یہ دہلی کا محاصرہ ہے حالانکہ تین ہزار فوج تیس ہزار کا محاصرہ کیسے کر سکتی تھی۔ پھر بھی یہ تین ہزار نہ ٹلے جب تک پنجاب سے محاصرے کی توپیں اور تین ہزار سکھ نہ آ گئے۔ جس کے بعد انگریزوں نے دہلی پر یورش کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔

مارکس نے شروع میں انگریزوں کی فوجی حکمت عملی پر تنقید کی کہ ان تین ہزار سپاہیوں سے انگریز دہلی کو فتح نہیں کر سکتے لہذا ان کو وہاں رکھنا فوج ضائع کرنا ہے۔ ان کو اس کی بجائے متحرک کالم کے طور پر استعمال کرنا چاہیے۔ دہلی کی فتح کے بعد مارکس نے تسلیم کیا کہ ان کا اعتراض غلط تھا۔ دہلی ہندوستانیوں کا ہیڈ کوارٹر نہ تھا۔ دراصل کوئی بھی ان کا ہیڈ کوارٹر نہ تھا لیکن ہندوستان کے پرانے پایۂ تخت کی حیثیت سے اس کی جذباتی اور تاریخی اہمیت بہت تھی۔ اگر انگریز وہاں سے فوجیں ہٹا لیتے تو ہندوستانیوں کی ہمت بڑھتی اور جگہ جگہ بغاوت پھوٹ پڑتی۔

اودھ کے بارے میں مارکس نے کہا کہ پورے شمالی ہندوستان میں عوام کی، خاص کر کے کسانوں کی، ہمدردیاں باغیوں کے ساتھ تھیں لیکن صرف اودھ میں بغاوت نے ایک عوامی جنگ کی صورت اختیار کی۔ وجہ یہ تھی کہ جس منطق کے تحت دیسی ریاستوں کو انگریز ہڑپ کر رہے تھے، یعنی اب جب کہ کمپنی کے منافع کا تمام تر مدار مال گزاری پر تھا، جواب دوگنی کی جا چکی تھی، تو جتنی زمین کمپنی کے پاس ہوتی اتنا ہی اس کا منافع زیادہ ہوگا۔ اسی منطق کے تحت انہوں نے مروجہ نجی

جائیداد کو بھی منسوخ کر دیا۔ اس کا اطلاق ۱۸۵۶ء کے بعد اودھ پر اس وقت ہوا جب کمپنی نے اس کو ضم کر لیا۔ اس نے وہاں تعلق داروں اور دوسرے زمینداروں کو متنفر کیا نیز جب سپاہیوں نے بغاوت کی تو یہ اہل جائیداد بھی ان سے مل گئے۔ پھر ان کے ساتھ امیر اور متوسط کسان بھی شامل ہو گئے کہ کمپنی کے سپاہی، جن کی تین چوتھائی اکثریت اودھ سے بھرتی کی جاتی تھی، وہ کسانوں کے انہی طبقوں سے تھے۔ (یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء تک اودھ کے باشندے مارشل ریس تھے کہ اس وقت تک کرائے کے سپاہیوں کی بھاری اکثریت وہی انگریزوں کو مہیا کرتے تھے اور جنہوں نے انگریزوں کی فوج کے سپاہیوں کی حیثیت سے اپنے دوسرے ہم وطنوں کو غلام بنانے میں انگریزوں کے آلہ کار کا کردار ادا کیا۔ جب انگریزوں پر ۱۹۰۷ء میں واضح ہوا کہ ان میں بھی سیاسی شعور آ چکا ہے تو ان کو مارشل ریس کے منصب سے معزول کر دیا گیا۔)

ان تبصروں میں اینگلز خالص فوجی امور پر لکھتے تھے کہ وہ حرب وضرب کے موضوع کے ماہر تھے۔ نیز خود بھی جرمنی میں مسلح بغاوت میں حصہ لے چکے تھے۔

اینگلز نے دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہوں پر لڑائیوں کے بارے میں لکھتے ہوئے اس بات پر حیرت بلکہ حقارت کا اظہار کیا کہ جتنے بھی ہندوستانی سپاہی ہوں اور وہ جتنی بھی اچھی طرح لیس ہوں ان کو مٹھی بھر انگریز ہرا دیتے تھے۔ بلکہ بعد کے دنوں میں تو لال کوٹوں کو دیکھ کر ہی ہندوستانی بھاگنے لگتے تھے۔ اس بات پر اس لیے زیادہ تعجب ہوتا تھا کہ یہ سپاہی کمپنی کی فوج کے تھے اور ان کو انگریز افسروں نے تربیت دی تھی اور انہی سپاہیوں نے انگریزوں کی کمان میں نیپالی فوج کو اور پنجاب کی سکھ فوج کو ہرا کر کمپنی کی کشور کشائی کی خدمت انجام دی تھی۔ لیکن وہ انگریزوں کے خلاف لڑائی میں ان جدید حربوں کو استعمال نہ کر سکے۔

مثلاً اینگلز نے بتلایا کہ لکھنؤ کے جنوب میں عالم باغ کی لڑائی میں باغیوں نے اسی طرح دمدمے بنائے جیسے انگریز بناتے تھے لیکن ایک تو ہر دمدمے میں ضرورت سے زیادہ سپاہی رکھے، دوسرے ایک اور دوسرے دمدمے کے بیچ میں باہمی تفنگ اندازی کے لیے امداد کا انتظام نہیں رکھا۔ لہٰذا انگریزوں نے دمدموں کے بیچ سے نکل کر باغیوں کے عقب میں موجود پیدل فوج پر حملہ کیا۔

اسی طرح دلکشا کی لڑائی میں باغیوں نے محل کی مناسب توپ بندی کی لیکن اس کے سامنے

کی زمین پر چھوٹی عمارتوں اور پیڑوں کو منہدم نہیں کیا۔ انگریز انہی کی آڑ میں توپوں کو دلکشا کی دیوار تک لے آئے۔ سکندر باغ میں باغی جم کر لڑے۔ لیکن جب ایک مرتبہ انگریزوں نے ان کی لائین توڑ دی تو وہ بالکل بے جان سے ہو کر مارے جانے کا انتظار کرنے لگے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہندوستانی ورثے میں حرکت کی جنگ صرف رسالے کا مذہب تھا۔ جب اٹھارہویں صدی میں نئے یورپی ہتھیاروں نے پیدل فوج کو بالادستی دی تو وہ چوکھٹا بنا کر لڑنا تو سیکھ گئے لیکن پیدل فوج کی متحرک لڑائی پر عبور حاصل نہ کر سکے۔ تیکنیک کی منتقلی کے مشکل مسئلے پر تھیوری بعد میں آئی۔ اصل بات یہ ہے کہ لینن کی غیر مساوی ترقی کی تھیوری (Theory of Unequal Development) منطقی طور پر جتنی بھی مکمل ہو، اس میں کلچر کی پسماندگی کے عنصر کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ نیا اوزار یا نیا ہتھیار استعمال کرنا تو سیکھا جا سکتا ہے لیکن اس کی ایجاد کے پیچھے اور استعمال کے مقصد کے پیچھے جو کلچر ہے وہ اتنی جلد منتقل نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے ٹروتسکی کی مخلوط ترقی کی تھیوری (Theory of Combined Development) جس کے پیچھے روسی انقلاب اور خانہ جنگی کا تجربہ ہے، زیادہ عملی معلوم ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب کوئی معاشرہ بدلتا ہے تو وہ کچھ نئے عناصر جذب کرتا ہے اور کچھ پرانے عناصر اپنے ساتھ لاتا ہے۔ (اس کی مثال ہم روسی انقلاب میں صاف دیکھتے ہیں) چنانچہ جب کوئی نیا اوزار، ہتھیار، تیکنیک یا تنظیم، ترقی یافتہ لوگوں سے پسماندہ لوگوں کو ملتی ہے تو آخر الذکر اس کا استعمال سیکھتے ہیں لیکن اپنے کلچر کی پسماندہ حد بندیوں کے اندر رہتے ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی فوج نے جو حربے ہندوستانی سپاہیوں کو سکھائے وہ ہندوستانیوں نے ناقص طور پر سیکھے اور استعمال کیے۔ اس کے علاوہ مارکس نے انگریزی فوج کی جس پھرتی (Dash) کا ذکر کیا ہے وہ ایک صنعتی تنظیم میں دباؤ کے نیچے کام کرنے کا ورثہ ہے جو کسان فوجی میں مفقود ہوتا ہے۔

مارکس نے یہاں ایک اور اہم نقص کی شکایت کی جو انہوں نے پندرہ سال بعد پیرس کمیون کی پالیسی کے بارے میں بھی کی کہ کوئی لڑائی صرف کامیاب دفاع کے ذریعے نہیں جیتی جا سکتی۔ چنانچہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ باغی فوجوں نے انتظار کیوں کیا کہ انگریز فوجیں جمع ہو کر ان پر حملہ کریں اور یہ کہ باغی جب تعداد میں بھی زیادہ تھے اور ہتھیاروں سے بھی خاطر خواہ طور پر لیس تھے، ان پر حملہ آور کیوں نہ ہوئے۔

ایک اور جگہ انہوں نے خود ہی اس کی وجہ بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ باغی فوجوں کی تربیت انگریز افسروں نے کی تھی لیکن کمان ہمیشہ انگریز افسروں کے ہاتھوں میں رہتی تھی۔ ہندوستانی افسر زیادہ سے زیادہ کمپنی کی کمان تک پہنچتے تھے لہذا جب بغاوت ہوئی تو باغی فوج سپاہیوں پر یا بہت چھوٹے افسروں پر مشتمل تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ باغی فوجی اعلیٰ کمان کی تشکیل نہیں کر سکے اور ان کی فوجی منصوبہ بندی کمپنی سے اوپر کی سطح پر نہ پہنچ سکی۔ لہذا کہیں بھی وہ پورے محاذ کے بارے میں سوچنے کے قابل نہ تھے کہ طے کرتے کہ بڑے پیمانے پر منظم ہو کر حملہ کریں۔

لکھنؤ میں ہارنے کے بعد باغی سارے اودھ میں پھیل گئے اور ان کی مزاحمت تقریباً ۱۸۵۹ء کے آخر تک جاری رہی لیکن اس بیچ میں انگریزوں نے زمین ضبط کرنے کے بارے میں اپنی پالیسی بدل لی۔ اب جن زمینداروں اور تعلق داروں نے انگریزوں کو حقیقتاً قتل نہیں کیا تھا ان کی جائیدادوں کے بحال ہونے کا امکان پیدا ہو گیا۔ لہذا انہوں نے باغیوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور سپاہیوں کی گوریلا جنگ، جس کو اب بھی کسانوں کی اکثریت کی حمایت حاصل تھی، آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔

دراصل مزاحمت کے عروج پر بھی صاحبان جائیداد اور عام کسانوں کے بیچ میں تضاد ختم نہیں ہوا تھا کہ ایک میٹنگ کے دوران تعلق داروں نے علماء، تاجر اور دوسرے طبقوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے اُن کو مراعات کی پیش کش کی لیکن لگان کم کرنے سے قطعاً انکار کر دیا۔

مارکس نے جھانسی، کالپی اور گوالیار کی مزاحمت کا ذکر صرف سرسری طور پر کیا ہے۔ مثلاً رانی جھانسی اور تانتیا ٹوپی کے اختلاف کا ذکر بالکل نہیں کیا۔ نہ ہی رانی جھانسی کی اس تجویز کا کہ وہ بیگم اودھ سے مل جائیں جس کو تانتیا اور دوسری مرہٹہ قیادت نے مسترد کر دیا تھا۔

اودھ کی بغاوت شروع ہوئی غدر کی طرح لیکن چونکہ اس کی وجہ بنیادی طور پر معاشی تھی اس لیے وہ انگریزی تسلط سے آزاد ہونے کی جنگ بن گئی۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ایسٹ انڈیا کمپنی کا منافع ۱۷۵۷ء تک تو خالص تجارتی تھا حالانکہ اس میں ایک عنصر دور دراز کی تجارت کا بھی تھا لہذا منافعے کے ایک حصے کی نوعیت آمدنی کی تھی۔ ۱۷۵۷ء یعنی جنگ پلاسی کے بعد، اس منافعے میں زمین کی مال گزاری کا حصہ بہت اہم ہو گیا اور

اس زمینی آمدنی کو بڑھانے کے لیے کمپنی نے بنگال میں مستقل بندوبست کیا جس کی رو سے کسان بغیر کسی تحفظ کے زمین کے ٹھیکیداروں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیئے گئے۔ ۱۸۳۴ء میں کمپنی کو انگلستان کی حکومت نے تجارت کرنے سے روک دیا۔ اب اس کے منافعے کا تمام تر انحصار مال گزاری پر تھا لہٰذا اس نے ایک تو مال گزاری کی شرح دوگنی کر دی دوسرے دیسی ریاستوں کو جو کہ اس وقت کمپنی کی طفیلی بن چکی تھیں، تیزی سے ضبط کرنے لگی کہ جتنی زمین پر وہ براہِ راست ٹیکس لگا سکتی تھی اتنا ہی اس کا منافع بڑھتا۔

اودھ کی پوزیشن اس اسکیم میں دوسری دیسی ریاستوں سے مختلف تھی۔ چونکہ ۱۸۵۶ء تک وہ ضم نہیں ہوا تھا اس لیے ایک تو اس کی مجموعی پیداوار کا زیادہ حصہ اس کی سرحدوں کے اندر خرچ ہوتا تھا دوسرے بنگال آرمی کے دو لاکھ سپاہیوں میں سے لاکھ سے لے کر ڈیڑھ لاکھ تک سپاہی، اودھ سے بھرتی کیے جاتے تھے۔ ان کی تنخواہیں بھی اودھ کی آمدنی میں اضافے کا باعث تھیں۔

اودھ کے ضم ہونے کے سبب وہاں صورت ایک دم بدل گئی اور وہاں بیروزگاری اور غربت ایک دم بڑھ گئی۔ بادشاہت کے خاتمے کی وجہ سے دربار کے ہزاروں ملازم، جن میں اعلیٰ عہدوں والے بھی تھے اور بڑی تنخواہیں پاتے تھے، نکال دیئے گئے۔ دوسرے ستر ہزار کی اودھی فوج برخواست ہوگئی۔ جو تاجر دربار اور درباریوں کے لیے تعیش کا اور دوسرے سامان مہیا کرتے تھے وہ دیوالیہ ہوگئے۔ پھر ایک طرف تو مال گزاری دگنی ہوگئی، دوسری طرف نجی جائیدادوں کی دوبارہ تصدیق کی ضرورت ہوئی۔ آخر میں خود کمپنی کے اودھی فوجی ملازموں کی مراعات ختم کر دی گئیں کہ اب وہ برطانیہ کی رعایا بن گئے تھے۔

اس امر کی وضاحت تلمذ خلدون نے پی۔سی۔جوشی کی ادارت میں شائع ہونے والی کتاب ''۱۸۵۷ء'' میں کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جنگ کے زمانے میں لکھنؤ کے سقوط کے بعد گوریلا جنگ کے دوران باغی سپاہی رسد کے بغیر حرکت کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ عوام ان کے ساتھ تھے۔ لیکن آخر میں وہ اس لیے ہار گئے کہ دوسرے ہندوستانیوں نے، خاص کر پنجاب اور نیپال کے سپاہیوں نے، انگریزوں کا ساتھ دیا۔

ان دو علاقوں کے باشندوں کو اودھ والوں سے غالباً اس لیے بھی ہمدردی نہیں تھی کہ کمپنی کی جس فوج نے ان علاقوں کو فتح کیا اس میں تمام تر سپاہی اودھ کے تھے اور بعد میں کمپنی کی

چھاؤنیوں میں بھی یہی تھے، جس سے باہمی منافرت بڑھی۔ ہندوستانیوں میں چاہے ہندوستانیت کا تصور رہا ہو لیکن ہندوستانی قوم پرستی کا کوئی نشان نہیں ملتا۔

مارکس کے زمانے میں مقبوضات کے استحصال کا علم تو تھا کہ مارکس نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی جو وجہیں بیان کیں ان میں سب سے اہم یہ بیان ہے کہ ہندوستان کی سامراجی لوٹ نے انگلستان کے حکمران جتھے کو دولت مند بنایا۔ لیکن اس سے ہندوستان کی معیشت کو جو نقصان ہوا اس سے وہاں کی غربت میں نوعیتی فرق پیدا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی وہاں انگریزوں نے کوئی رفاہی کام نہیں کیا۔ ہندوستان کی تباہی کی ذمہ دار محض یہ لوٹ کھسوٹ ہی نہ تھی بلکہ خاص طور پر وہ وحشیانہ انداز تھا جس میں یہ کی گئی۔

دراصل مارکس نے تسلیم کیا کہ ہندوستان نے انگلستان کے ابتدائی ارتکاز کے عمل میں حصہ لیا۔ فرق یہ تھا کہ انگلستان میں کسانوں کی بیدخلی کے نتیجے میں جو دولت بورژوا کو منتقل ہوتی تھی وہ انگلستان کے اندر ہی رہتی تھی اور سرمایہ کاری کے کام آتی تھی جبکہ ہندوستان سے لوٹی ہوئی دولت ملک سے باہر چلی جاتی تھی جس سے ہندوستان کے عوام اور حکمران طبقہ دونوں غریب ہوئے۔ اس عمل میں مارکس نے ہندوستانی حکمران طبقے کو انگریزوں کا ہمکار گردانا ہے کہ اس سے پہلے کہ کسی ملک کے عوام کو باہر کے لوگ لوٹیں خود وہاں کے حکمران لوٹتے ہیں۔

مگر مارکس نے مقبوضاتی استحصال کو ابھی ابتدائی ارتکاز ہی کی صورت میں دیکھا کہ ابھی تک مقبوضات سے غیر مساوی تبادلے کا تصور صاف نہ ہوا تھا۔ یہ دراصل بیسویں صدی میں لاطینی امریکا سے آیا۔

مارکس اور اینگلز کو بیشک جنگ آزادی میں ہندوستانیوں سے ہمدردی تھی لیکن ان کو زیادہ دلچسپی اس سے تھی کہ وہ ملک کتنی تیزی سے سرمایہ داری کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ پیسے کے رشتے جہاں پہنچتے ہیں وہ پرانے انحصاری یا دوسری طرح کے غیر زریں رشتوں کو پگھلا دیتے ہیں۔ وہ اس عمل کی توقع ہندوستان اور چین میں بھی کر رہے تھے۔

یہ تو بہت بعد میں پتہ چلا کہ سامراجیت کا استحصال تو پورے معاشرے سے ہوتا ہے لیکن اس کا رشتوں کو پگھلانے کا عمل صرف ایک خاص بالائی طبقے تک جاتا ہے۔ اس کے نیچے پرانے رشتے قائم رہتے ہیں۔ ان کا استحصال بالائی سرمایہ دار طبقہ کرتا ہے اور پھر مالیت سامراج کو منتقل کرتا

ہے۔ نیز یہ کہ تیسری دنیا کی سرمایہ داری محیطی سرمایہ داری (Peripheral Capitalism) ہوتی ہے۔ نیز محیطی خطے میں محوری ترقی، یعنی صحیح معنوں میں ترقی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کوئی ملک سیاسی اور معاشی طور پر اپنے آپ کو سامراجیت کی گرفت سے آزاد نہ کرلے۔ جس کی ضرورت پر مارکس نے اپنے ۱۸۵۳ء کے مضمون میں زور دیا تھا۔

مارکس کی کچھ جزویات سے مورخوں کو اختلاف ہوسکتا ہے لیکن جو بنیادی اصول ان کی تھیوری کے ہیں وہ اب بھی سامراجیت اور سامراجی استحصال کی تھیوری کی مستقل بنیاد ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہندوستان میں غربت میں نوعیتی فرق تب ہی ممکن ہوا جب یہاں کاریگروں کو ذرائع پیداوار سے الگ کیا گیا۔ چنانچہ مارکس کے بعد آنے والی غیر مساوی تجارت کی تھیوری کی جو کہ اصلاً نوسامراجی دور کی پیداوار ہے، مستقل بنیاد یہی ہے کہ کاریگر کے ذرائع پیداوار سے الگ ہونے پر اس کی قوت ومحنت کی بحالی کے دام گر جاتے ہیں۔ جس کی بنیاد پر غیر مساوی تجارت کے علاوہ اور کسی شرح پر ترقی یافتہ اور پسماندہ ممالک میں تجارت ہو ہی نہیں سکتی۔ گویا کہ دونوں دنیاؤں کے بیچ میں تجارت کی غیر مساوی نوعیت ایک معروضی قانون بن جاتی ہے۔

1857ء: پاکستان درسی کتب میں

روبینہ سہگل

قومی شناخت اور ماضی کا علم:

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان 1857 کے واقعات کو قطعی طور پر فراموش کر چکا ہے۔ ہماری قومی یادداشت میں 1857 کے اہم واقعات کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں تاریخ کا مضمون کئی سالوں سے زوال پذیر ہے۔ تاریخ کے شعبے علمی اداروں میں بند ہو رہے ہیں اور لوگوں میں تاریخ کے علم کی اہمیت کا شعور نہیں ہے۔ تاریخ پر باضابطہ تحقیق کی بھی کوئی جامع روایت موجود نہیں ہے کیونکہ عام طور پر تاریخ کو غیر ضروری قرار دیا جاتا ہے اور اس کے مطالعہ سے مالی فوائد حاصل نہیں ہوتے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ تاریخ کو پڑھنا گڑھے مُردے اکھیڑنے کے برابر ہے۔ ملک کے تعلیمی رہنما بھی تاریخ کے مطالعے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ نتیجتاً تاریخ کے شعور کا فقدان بھی ہے اور اس پر مالی وسائل خرچ کرنے کا رجحان بھی بہت کم ہے۔(1)

تاریخ کے مضمون اور اس کے مطالعہ میں زوال اس وقت آیا جب 1959 کی مشہور تعلیمی پالیسی ''شریف رپورٹ'' میں اس مضمون کو جغرافیہ اور شہریت کے ساتھ ضم کر دیا گیا اور ان تینوں کو ملا کر ''معاشرتی علوم'' کے نام سے ایک نیا مضمون تشکیل دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ کی علیحدہ حیثیت ختم ہو گئی اور وہ معاشرتی علوم کا ایک تہائی حصہ بن کر رہ گئی۔(2) اس فعل کے پیچھے جو دلائل پیش کیے گئے وہ یہ تھے کہ ایک نئی ریاست کو ماضی کے بارے میں علم کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ ایک عظیم الشان مستقبل کی جانب گامزن ہے اور اسے ایک جدید، ترقی یافتہ اور سائنسی قوم بننے کے لیے تاریخ کی بجائے سائنس، ٹیکنالوجی اور جدید علوم کی زیادہ ضرورت ہے۔ یہ سوچ، جو امریکی مفکرین کے خیالات سے ہم آہنگ تھی، ایوب خان کے دور میں عروج پر تھی۔

چنانچہ نہ صرف یہ کہ تاریخ کی علیحدہ حیثیت ختم کر دی گئی اور اس کے مطالعے میں کمی واقع ہوئی بلکہ اس مضمون کو محض سیاسی مقاصد کی نذر کر دیا گیا۔ تاریخ کا مقصد صرف اتنا رہ گیا کہ وہ قومی شناخت کی تعمیر کرے جو کہ اجتماعی یادداشت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ مقصد یہ تھا کہ ماضی کو اس

انداز سے پیش کیا جائے کہ پاکستان کا وجود میں آنا ناگزیر معلوم ہو اور اس کے قیام کی جڑیں ماضی کے ہر واقعہ میں چھپی ہوئی نظر آئیں۔ اس طرح تاریخ کے مضمون کو قوم پرستی کا اوزار بنا دیا گیا اور اس کے مطالعے سے جو تاریخی شعور پیدا ہوتا ہے وہ وقت کے ساتھ ساتھ کم ہوتا چلا گیا۔ تاریخی شعور کے فقدان کی وجہ سے سیاسی شعور میں بھی بدستور کمی واقع ہوتی رہی۔

تاریخ اس حد تک قوم پرستی کے تابع ہوگئی کہ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ایک رہنمائے اساتذہ میں مندرجہ ذیل ہدایات دی گئیں۔

بچوں کو پنجاب کی تاریخ اس طرح پڑھایئے کہ مندرجہ ذیل حقائق بالکل واضح ہو جائیں:

(1) ہندوؤں اور مسلمان کے طرزِ زندگی، رسومات، روایات، عقائد اور ثقافت میں بہت فرق ہے اور یہ ایک دوسرے سے قطعی طور پر علیحدہ ہیں۔

(2) ان اُمور اور عوامل پر خصوصی توجہ دیجئے جنہوں نے مسلمانوں کو مجبور کیا کہ وہ ایک علیحدہ ملک بنالیں، اس ضمن میں خاص طور پر اس امر پر روشنی ڈالئے کہ ہندوؤں نے کس طرح مسلمانوں کا اقتصادی اور تعلیمی اور سماجی استحصال کیا اور اس بات پر بھی زور ڈالئے کہ برطانوی حکمرانوں کا رویہ ہندوؤں کی نسبت مسلمانوں کے ساتھ بہت برا تھا اور اس بات کو اجاگر کیجئے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں سے امتیازی سلوک روا رکھا۔ (3)

1975 میں دی گئیں ان ہدایات سے واضح ہو جاتا ہے کہ تاریخ کے مضمون کو دو قومی نظریے کے پھیلاؤ کی غرض سے استعمال کرنا مقصود تھا۔ تیسری سے آٹھویں جماعت تک تاریخ کو معاشرتی علوم میں ضم کر دیا گیا اور نویں جماعت سے لے کر انٹرمیڈیٹ تک تاریخ کو ایک نئے مضمون ''مطالعہ پاکستان'' کا حصہ بنا دیا گیا۔ مطالعہ پاکستان کا مقصد بھی دو قومی نظریے کا فروغ تھا اور تاریخ کو قومی نظریاتی بنیادوں پر استوار کرنا مدنظر تھا۔ قومی شناخت کی تعمیر کا تقاضا تھا کہ ماضی کو دو قومی نظریے کے زاویئے سے دیکھا جائے۔ ایک ایسی ریاست جو مذہبی فرق اور علیحدگی کی بنیادوں پر وجود میں آئی، اس کی نظریاتی جڑوں کا تقاضا ہے کہ تاریخ کے کسی دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہم آہنگی، دوستی، رواداری اور یک جہتی کا اعتراف نہ کیا جائے اور ماضی کی متحدہ جدوجہد اور تحریکوں کو جھٹلایا جائے۔ چنانچہ پاکستان کی قومی کہانی دو قوموں کی ٹوٹی ہوئی کہانی بن

گئی، دو کہانیوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی۔ ماضی کی یکساں اور اکٹھی یادیں ٹوٹ کر رہ گئیں اور مخلوط تحریکیں علیحدہ علیحدہ تحریکیں بن گئیں۔

اگر چہ پاکستان کی مختلف قوموں نے اپنی علیحدہ پہچان کا دعویٰ بار ہا کیا۔ مشرقی پاکستان، بلوچستان، سندھ، سرائکی بیلٹ اور صوبہ سرحد میں علیحدہ قومیت کے دعوے شروع ہی سے ہوتے رہے، تاہم ریاست کے حکمرانوں کو مرکزیت کی ضرورت تھی اور خاص طور پر آمر حکمرانوں کو مرکز کے بہت طاقتور ہونے کی ضرورت ہوتی ہے لہذا انہوں نے مسلسل اس نظریے کو فروغ دیا کہ پاکستان میں صرف ایک قوم بستی ہے اور وہ ہے مسلمان۔ لسانی، علاقائی اور زبان کی بنیادوں پر خود کو تشکیل دینے والی قوموں کی نفی کی گئی اور ان کے جائز حقوق کی نفی کی گئی۔ صوبائی خود مختاری کے اصولوں کو نظر انداز کیا گیا اور مرکز کی ساخت کی ہوئی قومیت کے نام پر علاقائی جدوجہد کو فوج کے استعمال کے ذریعے کچل دیا گیا۔

جب تاریخ قوم پرستی کی بنیادوں پر لکھی جاتی ہے تو اس میں سے تمام ایسے واقعات اور حقائق کو خارج کر دیا جاتا ہے جو قومیت کے تصور میں نہیں سما پاتے۔ ایسی باتوں کو چھپا دیا، نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا پھر جھٹلا دیا جاتا ہے جو حکمرانوں کے قومیت کے تصور کے برعکس ہوتی ہیں۔ 1857 کی جنگ آزادی بھی ایسا ہی واقعہ ہے۔ اس میں ملاوٹ کے عناصر شامل ہیں جو درسی کتابوں کے لکھنے والوں کے لیے المیہ بن جاتے ہیں۔ انہیں یہ ہدایات دی جاتی ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ازلی و ابدی دشمن کے طور پر پیش کیا جائے، یہ تاثر دیا جائے کہ ان دونوں میں کبھی بھی کوئی دوستی نہیں تھی اور اتحاد نہیں تھا۔ یہ ہمیشہ سے دشمن تھے اور جب تک یہ دنیا باقی ہے یہ دونوں کبھی مل نہیں سکتے اور دشمن ہی رہیں گے۔

لیکن 1857 میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر جدوجہد کی اور سامراجیت کے آگے اکٹھے کھڑے ہو گئے۔ قوم پرستی کا تقاضا ہے کہ صرف مسلمانوں کو دلیر اور جرأت مند ثابت کیا جائے اور ہندوؤں کو کمزور، بزدل اور عیار و مکار ثابت کیا جائے۔ لیکن 1857 میں ہندوؤں نے دلیری اور شجاعت کا مظاہرہ بھی کیا اور اپنا مضبوط کردار بھی دکھایا۔ مثال کے طور پر منگل پانڈے نے گولی چلا کر انگریزوں کو خوفزدہ کر دیا اور اس کے نتیجے میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ کئی ہندو سپاہیوں کو بھی توپوں کے دہانوں پر باندھ کر اڑا دیا گیا۔ اور مزید سخت سزائیں دی گئیں۔ لیکن یہ

سب کچھ دوقومی نظریے کی ساخت میں نہیں سماتا تھا۔ دوقومی نظریے کے مطابق صرف مسلمانوں کی بہادری اجاگر کرنا ضروری تھا اور ہندوؤں کی مکاری اور عیاری کو عیاں کرنا اہم تھا۔ چند تعلیمی رہنماؤں کا یہ مطالبہ بھی تھا کہ تاریخ کے تمام واقعات کو پاکستان کا پیش خیمہ بنا دیا جائے۔ مثال کے طور پر ہر واقعہ کچھ اس طرح پیش کیا جائے کہ وہ پاکستان کے قیام کی ہی ایک کڑی لگے۔ 1857 کے واقعات کو بھی اس انداز میں پیش کرنا مقصود تھا کہ وہ قیام پاکستان کی جانب ایک پہلا قدم نظر آئیں، چنانچہ اس لیے ہندوؤں کا اخراج اور بھی اہم تھا۔

چنانچہ 1857 کو ہر کتاب کے ایسے باب میں شمار کرلیا گیا جو ''تحریکِ پاکستان'' کے بارے میں تھا۔ 1857 کو تحریکِ پاکستان کا آغاز بنا دیا گیا۔ اس کی تاریخ کو کچھ اس انداز سے لکھا گیا کہ مسلمان مردوں کے کارنامے، بہادری، دلیری اور جانثاری واضح ہوجائے اور انگریزوں اور ہندوؤں کا ان کے خلاف اتحاد نظر آئے۔ 1857 کی تاریخ کو حالیہ دور کے سیاسی تقاضوں کے نقطۂ نظر سے لکھا جانے لگا۔ قوم پرستی کے تحت لکھی گئی تاریخ کا ایک اور تقاضا یہ ہے کہ قوم کی مردانگی کی تصویر کشی کی جائے۔ قوم کی خواتین کا یہ کام تھا کہ وہ خود کو دشمن سے بچا کر رکھیں، پردے میں رہیں اور قوم کے جانثاروں اور سپاہیوں کی خدمت کریں۔ نسوانیت کا یہ تصور قابل قبول نہیں تھا کہ عورتیں گھوڑوں پر سوار ہو کر جنگیں لڑیں اور بہادری کے کارنامے سرانجام دیں۔ 1857 اس اعتبار سے بھی ایک المیہ تھا۔ ہندو اور مسلمان خواتین، مثلاً جھانسی کی رانی، لکشمی بائی اور اودھ کی بیگم حضرت محل نے 1857 میں نمایاں کردار ادا کیا اور بہادری سے جنگوں میں شامل ہوئیں۔ درسی کتب لکھنے والوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس امر کو بھی اس قدر کم اہمیت دیں تاکہ 1857 مسلمانوں مردوں کی شجاعت اور قربانی ہی کی داستان نظر جائے۔

ان تمام مشکلات کا حل درسی کتابیں لکھنے والے مصنفین نے یہ نکالا کہ 1857 کو بہت مختصر انداز میں پیش کیا جائے اور جوں جوں اونچی جماعتوں کی کتابوں تک پہنچا جائے مزید اختصار سے کام لیا جائے۔ اس دور کے بارے میں بہت زیادہ تفصیل سے نہ لکھا جائے تاکہ صرف ایک ہی پہلو، مسلمانوں کی بہادری، کو اجاگر کیا جاسکے۔ تمام ایسے حقائق اور واقعات جو عورتوں کی دلیری سے متعلق ہیں اور ہندوؤں کی شجاعت کی گواہی دیتے ہیں، ان کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا جائے۔ جو سرکاری کتابیں اس مطالعے کے لیے منتخب کی گئیں اُن میں 1857 کو صرف ایک یا دو صفحات

میں بیان کیا گیا ہے یا پھر ایک دو پیراگراف تک محدود کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک یک طرفہ کہانی اُبھر کر سامنے آتی ہے جس میں سے بہت سے حقائق غائب ہیں۔

مظلوم اور ہیرو: سرکاری کتب میں مسلمانوں کی عکاسی

سرکاری سکولوں میں عموماً محروم طبقات کے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان بچوں کو ریاست اپنی کہانیوں سے نوازتی ہے اور یہ ریاستی نقطۂ نظر کے پابند کر دیئے جاتے ہیں۔ 2004 میں ترتیب دی گئی معاشرتی علوم کی چھٹی جماعت کی کتاب 1857 کو مسلمانوں اور انگریزوں کے مابین کشمکش کے طور پر پیش کرتی ہے لیکن پھر ایک دم اس میں ہندو نام داخل ہو جاتے ہیں جو کہ پہلے لکھے گئے جملوں سے متضاد نظر آتے ہیں۔ اس کتاب میں مسلمان کبھی ہیرو کے روپ میں اور کبھی مظلوم عوام کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ 1857 کو جنگِ آزادی کے عنوان سے لکھا گیا ہے اور اس کے مصنف کے مطابق انگریز ہندوستان میں کاروبار کی غرض سے داخل ہوئے اور مقامی حکمرانوں کو ہٹا کر اُن کی زمینوں پر قابض ہو گئے۔ بقول مصنف:

> جہاں پر بھی نو آبادیاتی حکمران تھے وہاں کے مقامی لوگ شدید استحصال کا شکار تھے۔ لوگ انگریزوں کی پالیسیوں سے تنگ آ چکے تھے اور اُن سے نفرت کرنے لگے تھے کیونکہ انہیں غیر قانونی حکمرانی ناپسند تھی۔ یہ تو ایک فطری بات تھی۔ (صفحہ 120)

اُس کے بعد یہ کہانی ایک دم نیا موڑ لیتی ہے اور مسلمانوں کی کہانی بن جاتی ہے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ:

> مسلمانوں نے انگریزوں سے جان چھڑانے کے لیے اپنی کوششیں تیز کر دیں۔ جنگِ آزادی سے قبل پلاسی، بکسر اور میسور کی جنگیں اس جنگ کا پیش خیمہ تھیں۔ لوگ کمپنی کے دور میں مفلس اور نادار ہو چکے تھے۔ انگریزوں نے ہندوستان سے لوٹی ہوئی دولت برطانیہ منتقل کر دی تھی۔ (صفحہ 121)

شروع میں تو مصنف مقامی لوگوں کی بات کرتے ہیں لیکن پھر یہ تاثر دیتے ہیں کہ صرف مسلمان سامراجیت کی زنجیروں سے آزاد ہونے کے خواہاں تھے۔ دوسرے مذاہب کے لوگ

تاریخ کے اوراق سے غائب ہو جاتے ہیں۔ پلاسی اور میسور کی جنگوں کا حوالہ نواب سراج الدولہ اور سلطان ٹیپو کی طرف ہے۔ مصنف کا مقصد یہ ہے کہ جنگِ آزادی کو صرف مسلمانوں سے منسوب کر دیا جائے اور یوں لگے گویا مسلمان بہت پہلے سے انگریزوں سے لڑ رہے تھے اور ان کی مزاحمت کی کہانی تو جنگِ آزادی سے سو برس قبل 1757 میں پلاسی کے میدان میں ہی شروع ہو گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو ایک دم سے مسلمان سامراجیت کا احساس ہوا ہو کیونکہ اگلے چند جملوں میں وہ انگریزوں اور مسلمانوں کی سامراجیت کا تقابلی جائزہ لیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> انگریزوں نے مسجدوں اور مندروں کی زمینیں چھین لیں۔ انہوں نے جاگیرداروں کی ملکیت سے بھی انہیں محروم کر دیا۔ اس کے مقابلے میں مغل حکمرانوں نے مقامی لوگوں کو عزت سے نوازا اور ان کو زندگی کی تمام تر سہولیات مہیا کیں۔ (صفحہ 121)

اس کے بعد مصنف ان اقتصادی، سیاسی اور سماجی وجوہات کا ذکر کرتے ہیں جو 1857 کی بغاوت کا سبب بنیں۔ اُن کے مطابق انگریز بہت زیادہ ریونیو (لگان) لیتے تھے جس کے باعث کسان شدید غربت و افلاس کا شکار ہو چکے تھے۔ سرکاری ملازمتوں میں ہندوستانیوں کا حصہ نہیں تھا۔ ہندوستانیوں کو انگریزوں کے مقابلے میں بے ایمان اور جھوٹا سمجھا جاتا تھا، یورپی مشنری لوگوں کو عیسائیت کی طرف مائل کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ان وجوہات کے بیان کے بعد یہ مصنف وہ کہانی بیان کرتے ہیں جو بغاوت کے شروع ہو جانے کی وجہ بنی۔ یہ کہانی اُن نئی رائفلز، لی اینفیلڈ، کے بارے میں ہے جنہیں لوڈ کرنے کے لیے دانتوں کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ نئے کارتوس پر سور اور گائے کی چربی چڑھی تھی جو کہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے مذہبی عقائد کے خلاف تھا۔ ایسی کوئی درسی کتاب نہیں ملتی جو اس کہانی کا ذکر نہیں کرتی حالانکہ یہ واقعہ محض ایک ٹریگر کی حیثیت رکھتا ہے جس کی وجہ سے برسوں سے چھپا ہوا غم و غصہ، بغاوت کی صورت اختیار کر گیا لیکن یہ بات قابلِ ستائش ہے کہ چھٹی جماعت کی یہ کتاب معاشی، سماجی اور سیاسی وجوہات کی نشاندہی کرتی ہے۔ کئی ایسی کتابیں بھی ہیں جن میں ان وجوہات کا ذکر ہی نہیں ملتا اور یوں لگتا ہے کہ ایک دم سے چربی والے کارتوسوں کی وجہ سے بغاوت ہو گئی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ چھٹی کتاب کی یہ کہانی ایک دم سے نیا موڑ لیتی ہے اور ہندو اس

بغاوت میں نمایاں کردار ادا کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اگرچہ مصنف شروع میں کہہ چکے ہیں کہ مسلمان انگریزوں کی حکومت سے چھٹکارا چاہتے تھے لیکن اب وہ ہندوؤں کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک مختصر سی بات میں سے تضاد نمایاں ہو جاتا ہے۔ مصنف سپاہیوں کے غم و غصہ کے تذکرہ کے بعد لکھتے ہیں کہ:

> چنانچہ سپاہی باغی ہو گئے اور انہوں نے 29 مارچ کو بغاوت کر دی جب منگل پانڈے نے ایک انگریز سپاہی پر گولی چلا دی۔ (صفحہ 122-121)

یہ واحد درسی کتب ہے جس میں منگل پانڈے کا نام ملتا ہے۔ اس کے بعد مصنف جھانسی کی رانی کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> جھانسی کی رانی نے بھی بغاوت کی۔ انہوں نے 30,000 حریت پسندوں کی فوج تیار کی۔ وہ کچھ عرصہ تک لڑتی رہیں۔ اُن کے پاس جنگ کے وسائل محدود تھے لہذا وہ لڑتی ہوئی ماری گئیں۔ وہ میدان جنگ میں دلیری سے لڑیں۔ (صفحہ 123-122)

یہ کتاب اُن چند کتابوں میں سے ہے جو سرکاری نصاب کا حصہ ہونے کے باوجود جھانسی کی رانی اور منگل پانڈے کا ذکر کرتی ہیں۔ باقی کتابوں میں یا تو ان کا ذکر ملتا ہی نہیں یا پھر محض ایک چھوٹے سے جملے میں ان کا ذکر مکمل کر دیا جاتا ہے۔ لیکن ایک قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس کتاب میں بیگم حضرت محل کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ ممکن ہے کہ مصنف مسلمان عورتوں کو جنگ و جدل سے منسوب نہ کرنا چاہتے ہوں۔

اس کتاب کے بقیہ حصوں میں بغاوت کی کہانی دونوں قوموں کی یکساں کہانی سے ہٹ کر صرف مسلمانوں کی مظلومیت کی داستان بن جاتی ہے۔ شروع میں تو دونوں پر مظالم کا تذکرہ ملتا ہے لیکن پھر صرف مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم نظر آنے لگتے ہیں۔

مصنف کے مطابق:

> انگریزوں نے ہندوستان کے لوگوں بشمول ہندوؤں اور مسلمانوں سے انتقام لیا۔ مغل شہزادوں کو قتل کر دیا گیا۔ بے حد قتل عام ہوا اور ہر طرف لاشیں نظر آنے لگیں۔ عام لوگوں نے انگریزوں کے ہاتھوں بہت ظلم

برداشت کیے۔(صفحہ 123)

بہت سارے سپاہیوں کو نظر بند کر دیا گیا اور انگریزوں نے سارے کا سارا الزام مسلمانوں کے کاندھوں پر ڈال دیا۔(صفحہ 123)

یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ پہلے تو تمام لوگوں پر ظلم وستم کی داستان بیان کی جاتی ہے لیکن پھر صرف مسلمانوں کو مظلوم قرار دے دیا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مقصد یہ ثابت کرنا ہو کہ مسلمانوں کو بالآخر ایک علیحدہ ملک کی ضرورت صرف اس لیے محسوس ہوئی کہ اُن پر ظلم وستم زیادہ ہوا اور وہ انتقام کا نشانہ بنے۔ باقی کا باب بھی صرف مسلمانوں پر ڈھائے گئے مظالم کا ذکر کرتا ہے اور بالآخر اُن کی فتح کا اعلان ملتا ہے کہ انہوں نے اپنے لیے ایک علیحدہ مسلمان مملکت حاصل کر لی۔ بات کے آخر میں انگریزوں کی سختی اور ظلم اور مسلمانوں کی عظمت اور رحم دلی کا موازنہ کیا گیا ہے۔ بقول مصنف:

> انگریزوں نے ہندوستان پر 89 برس تک حکومت کی۔ مسلمانوں نے ایک ہزار سال سے زائد عرصہ تک حکومت کی۔ مسلمانوں کا نظام اور انتظام بہت اعلیٰ تھا۔ مسلمان دلیر تھے، عظیم تھے اور انہوں نے بہت سے اچھے کام کیے..... جب جنگِ آزادی میں مسلمانوں کی شکست ہوگئی تو انگریزوں نے انہیں بے دردی سے مارا، ان کی زمینیں چھین لیں، انہیں ملازمتوں سے برخاست کر دیا اور مسلمانوں کو تباہ حال کر دیا۔ وہ بھوکے مرنے لگے اور غربت اُن کا نصیب بن گئی..... انگریزوں نے مدرسوں کا نصاب تبدیل کر دیا اور درسی کتب بدل دیں اور انہیں اپنی مرضی کے مطابق ڈھال دیا۔ فقہ اور حدیث کی تعلیم بند کر دی گئی۔ عیسائیت کا مواد ہر جگہ پھیلا دیا گیا۔ مدرسوں اور مسجدوں سے منسلک زمینوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ نتیجے کے طور پر اِن اداروں کی آمدنی ختم ہوگئی۔ انگریزوں نے عیسائی مذہب کی تبلیغ کو فروغ دیا۔ مسلمان محض نوکر بن کر رہ گئے اور انگریز مالک بن بیٹھے۔ ریونیو کی شرح بڑھا دی گئی۔ ایسے ٹیکس پھر سے رائج کر دیئے گئے جو پہلے ختم ہو چکے تھے۔ اب مسلمان سر پر پگڑی نہیں باندھ سکتے

تھے..... انگریزوں نے مسلمانوں کی ثقافت اور اثاث کا مذاق اڑایا۔
مسلمان ہر قسم کے ظلم کا نشانہ بن گئے اور انہوں نے بدترین مشکلات کا
سامنا کیا۔ (صفحہ 124-123)

اب اس باب سے ہندو مکمل طور پر خارج کئے جا چکے ہیں۔ اس کی وجہ بالکل واضح ہے کہ اب کہانی نے قیامِ پاکستان کی جانب موڑ اختیار کرنا ہے۔ پاکستان کی کہانی میں ہندو، جدوجہد کے ساتھی کے طور پر قدم بہ قدم نہیں چل سکتے۔ اب راستے الگ ہو چکے ہیں اور دو قومی نظریئے کا تقاضا ہے کہ مسلمان مملکت کا جواز فراہم کیا جائے۔ اب ہندو دشمن کا روپ اختیار کر چکے ہیں کیونکہ آزادی کو انگریزوں اور ہندوؤں دونوں کی زنجیروں سے چھٹکارے کے طور پر پیش کرنا ہے۔ لہذا مصنف اب ایک دم ہی سر سید احمد خان کی طرف کہانی کا رُخ موڑتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ کیسے انہوں نے مسلمانوں کو بیدار کیا اور اُن کی ابتر حالت سے انہیں نکالنے کی کاوش شروع کی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان تو ہمیشہ سے بننا ہی تھا اور اب تک کی کہانی محض ایک پسِ منظر تھی جو اِس کہانی کے پہلے سے طے شدہ نتیجے کی طرف جا رہی تھی۔ 1857 اِس عظیم کہانی کا پہلا باب تھا۔ اس طرح دونوں قوموں کی جڑی ہوئی تاریخ اور سانجھی جدوجہد کو جھٹلا کر دو علیحدہ اور عداوت سے بھرپور کہانیاں بنا دی گئیں۔

معاشرتی علوم کی آٹھویں جماعت کی کتاب مزید اختصار سے کام لیتی ہے اور 1857 کو کل دو پیراگراف میں نمٹا دیتی ہے۔ اس کتاب میں بھی 1857 پاکستان کی طرف ایک پہلا قدم تھا اور ہندو انگریزوں کے ساتھ مل گئے تھے۔ اس کتاب میں ''1857 کی جنگِ آزادی'' والا حصہ ایک آفاقی نظریئے سے شروع ہوتا ہے۔ مصنف کے مطابق ہر انسان کے اندر آزادی اور خود مختاری کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔ یہ بات لکھنے کے بعد وہ لفظ ''ہر انسان'' بھول جاتے ہیں اور صرف مسلمانوں کا تذکرہ شروع کر دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> مسلمانوں نے کئی صدیوں تک برصغیر پر حکومت کی۔ اب وہ ایک غیر قوم کی حکمرانی سے نفرت کرتے تھے۔ لہذا ہمیں چاہیے کہ 1857 کے واقعات کو مسلمانوں کی آخری کوشش سمجھیں۔ جس میں کہ چند دوسری قومیں بھی شامل تھیں۔ اِن کوششوں کا مقصد تھا آزادی کو یقینی بنانا۔ (صفحہ 71)

مصنف دوسری قوموں کا ذکر نہ صرف مسلمانوں کے بعد کرتے ہیں بلکہ یہ بھی نہیں بتاتے کہ یہ دوسری قومیں کون سی تھیں۔ اگر یہ بتا دیتے کہ ہندو اور مسلمان مل کر لڑے تھے تو دو قومی نظریئے کی نفی ہو جاتی جس کے تحت یہ دونوں ازلی و ابدی دشمن تھے۔ اس کے بعد وہ مسلمانوں کی تباہی کی داستان چھیڑ دیتے ہیں جو بغاوت کی ناکامی کے بعد ہوئی۔

1857 کی بغاوت کے اختتام پر انگریزوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔ انہوں نے مسلمانوں کے اتحاد کو قطعی طور پر تباہ کرنے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے لال قلعہ پر حملہ کیا اور بہادر شاہ ظفر کو اس وقت حراست میں لے لیا جب وہ ہمایوں کے مزار میں چھپے ہوئے تھے۔ میجر ہڈسن نے بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کو قتل کر کے ان کے سر ایک طشتری میں مغل بادشاہ کو پیش کئے۔ جنرل نکلسن نے حکم دیا کہ مقامی باشندوں کا قتلِ عام کیا جائے اور ان کے گھروں کو نذرِ آتش کر دیا جائے۔ بہادر شاہ ظفر کی موت رنگون میں ہوئی۔ جنگ کے اختتام پر ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈالی گئی۔ ہندوؤں نے انگریزوں کو یقین دلایا کہ وہ وفادار رہیں گے اور ان کے انگریزوں سے گٹھ جوڑ کے نتیجے میں مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھائے گئے۔ ان پر سرکاری ملازمت، تجارت اور کاروبار کے دروازے بند کر دیئے گئے اور انہیں معمولی نوکریاں کرنا پڑیں۔ وہ کسان، مزدور، ماشکی اور کاریگر بن کر رہ گئے۔ (صفحہ 72-71)

اس کتاب میں مسلمان بنیادی طور پر مظلوم نظر آتے ہیں۔ ہندوؤں کی مزاحمت اور جنگجوئی کی مکمل نفی ملتی ہے اور ہندو صرف انگریزوں کے وفادار کے طور پر اُبھر کے سامنے آتے ہیں۔ وفاداری کی یہ کہانی بار بار دہرائی گئی ہے جو کہ ہمیں بیشتر نصابی کتابوں میں بھی ملتی ہے۔ آخری حصہ میں ہندو مزید بربریت پر اُتر آتے ہیں اور انگریزوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر ظلم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بقول مصنف:

> جنگِ آزادی میں شکست کے بعد مسلمان آرام سے نہیں بیٹھے۔ وہ ہندوؤں اور انگریزوں کے ظلم و ستم سے حوصلہ ہارنے والے نہ تھے۔ انہوں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی اور بالآخر 1947 میں انہوں نے پاکستان کا سنگِ بنیاد رکھا۔ (صفحہ 73)

ان مختصر جملوں میں مصنف نے یہ طے کر دیا کہ مسلمان نڈر تھے اور خوفزدہ نہیں تھے بلکہ بہادر تھے۔ وہ مظلوم ضرور تھے لیکن جرأت مند اور حوصلہ مند بھی تھے۔ انہی جملوں میں یہ بھی طے ہو گیا

کہ ہندو انگریزوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے اور انہوں نے مل کر مسلمانوں کو بربریت کا نشانہ بنایا۔ ان مختصر جملوں میں مصنف نے یہ بھی طے کر لیا کہ پاکستان کا قیام جنگِ آزادی سے ہی شروع ہوا۔ 90 سال کا وقفہ جو 1857 اور 1947 کے درمیان میں ہے وہ گویا خالی تھا۔ اُس دوران کچھ نہیں ہوا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتحاد بھی کہیں ان اوراق میں کھو گیا اور ہندو سپاہی بھی بچوں کی یاداشت سے نکال دیئے گئے۔

انگریزی میں لکھی گئی درسی کتب میں مصنفین کو کچھ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ انگریزی پڑھنے والے بچے شاید ان باتوں کو حتمی سچ کے طور پر قبول نہ کریں۔ اس لیے وقتاً فوقتاً ہندو سپاہیوں، رہنماؤں اور دلیر لیڈروں کا ذکر مل جاتا ہے۔ ہندوؤں کے لیے اختیار کیے گئے الفاظ بھی بہت زہریلے نہیں ہوتے۔ لیکن اردو میں لکھی ہوئی کتابوں میں ہندوؤں کو بے حد منفی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ اردو پڑھنے والوں کو قدرے زیادہ رجعت پسند یا مذہبی تصور کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ضروری نہیں ہے کہ یہ بات سچ ہو لیکن اردو میں درسی کتابیں لکھنے والے زیادہ سخت لہجہ استعمال کرتے ہیں اور مذہبی تفریق کا عنصر ان کے ہاں نمایاں دکھتا ہے۔ مذہبی قوم پرستی کا اثر بھی اردو میڈیم کے بچوں پر زیادہ ڈالا جاتا ہے کیونکہ یہی بچے کل کے سپاہی یا مجاہد بنتے ہیں۔ معاشرتی علوم کی آٹھویں جماعت کی کتاب جو کہ اردو میں ہے، 1857 کی کچھ یوں عکاسی کرتی ہے:

> 1857 کی جنگِ آزادی ناکام ہوئی تو انگریزوں نے برصغیر کے مقامی باشندوں، بالخصوص مسلمانوں سے زبردست انتقام لیا۔ آزادی کے مجاہدین سے گن گن کر بدلے لئے گئے۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو مجرم قرار دیا گیا اور اسے جلاوطن کر کے قید کر دیا گیا..... اگرچہ آزادی میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر حصہ لیا تھا لیکن ہندو اپنی عیاری سے انگریزوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ انگریزوں کے خلاف بغاوت میں حصہ لینے والے صرف مسلمان تھے۔ بیشتر انگریز مصنفین نے بھی صرف مسلمانوں کو باغی قرار دیا۔ اس کے نتیجے میں انگریزوں کی حکومت مسلمانوں کو اس قدر کمزور کر دینے پر تل گئی تھی کہ وہ دوبارہ کبھی برسر اقتدار آنے کے متعلق نہ سوچ سکیں اور نہ ہی کبھی اس

بارے میں کوئی کوشش کر سکیں..... مسلمانوں کو سیاسی طور پر تباہ کرنے کے باوجود انگریز، مسلمانوں سے خوفزدہ تھے۔ وہ انہیں اپنی سلطنت کے لیے مستقل خطرہ سمجھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے مسلمانوں کو سیاسی، معاشرتی، تعلیمی اور اقتصادی طور پر تباہ کرنے کے لیے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ انیسویں صدی کے آخر تک انگریز حکمرانوں نے جو قدم بھی اُٹھایا، اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ مسلمانوں کی اکثریت کو سرکاری ملازمتوں سے برطرف کر دیا گیا۔ نیز آئندہ کے لیے ان پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ جب کسی دفتر میں کوئی اسامی خالی ہوتی تو حکومت کی طرف سے دیئے جانے والے اشتہار میں خاص طور پر درج ہوتا کہ مسلمان اس اسامی پر درخواست دینے کے اہل نہیں۔ اس طرح مسلمانوں کو ہر قسم کی سرکاری ملازمتوں سے محروم کیا جاتا رہا اور یہ ملازمتیں دوسری قوموں اور خاص طور پر ہندوؤں کو دی جاتی رہیں۔ اس سے انگریز حکمرانوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کو ہر اعتبار سے اس قدر کچل دیا جائے کہ وہ انگریزوں کے سیاسی حریف کی حیثیت سے دوبارہ اُٹھنے کے قابل نہ رہیں.....

سرکاری ملازمتوں کے علاوہ مسلمانوں کا صدیوں سے عام پیشہ کاشت کاری تھا..... انگریزوں نے تمام تر زمینیں ضبط کر لیں اور ہندوؤں کو دے دیں۔ اس طرح مسلمانوں میں جاگیردار اور عام کاشتکار دونوں طبقے کوڑی کوڑی کے محتاج ہو گئے..... مسلمانوں کے اوقاف اور رفاہی اداروں سے بھی یہی سلوک روا رکھا گیا۔ مسلم اوقاف کی آمدنی جو پہلے مسلمانوں کی تعلیم پر خرچ ہوتی تھی اب انگریز حکمرانوں کی مرضی سے غلط کاموں پر خرچ ہونے لگی۔ بیشتر اسلامی مدرسے بند ہو گئے۔ اس طرح مسلمانوں کے ثقافتی مراکز کو بھی انگریزوں نے جی بھر کے لوٹا۔ حکمرانوں نے مسلم کتب خانوں کی نادر کتابیں انگلستان بھیج دیں اور اس طرح سوچی

سمجھی سکیم کے مطابق مسلمانوں کے نظام تعلیم اور تعلیمی اداروں کو نا قابلِ تلافی نقصان پہنچایا گیا۔ (صفحہ 90 تا 91)

مندرجہ بالا اقتباس میں مسلمان مظلوم کی صورت اختیار کرتے ہیں اور انگریزوں کی اُفتاد صرف مسلمانوں پر ہی نہیں بلکہ مجاہدین پر گرتی ہے۔ لفظ ''مجاہدین'' کے استعمال سے ایک ایسی مزاحمتی تحریک جو کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے مشترکہ طور پر چلائی، مذہبی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ اب یہ تحریک معاشی، سیاسی اور سماجی وجوہات کی بجائے مذہب کی بنیاد پر لڑی جانے والی جنگ معلوم ہوتی ہے۔ مذہبی رنگ دے کر اس کتاب کے مصنف ہندوؤں اور ان کے کارناموں کو تاریخ سے خارج کر دیتے ہیں۔ اور لفظ ''عیاری'' کے استعمال کی بنا پر مذہبی تعصب مزید فروغ پاتا ہے۔

اگر چہ مصنف کی کوشش ہے کہ 1857 کو مذہبی رنگ میں پیش کیا جائے، لیکن وہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ یہ جنگ دونوں مذاہب کے لوگوں نے مل جل کر لڑی پھر وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ہندو اس قدر چالاک اور مکار تھے کہ انہوں نے انگریزوں کو یہ باور کروا دیا کہ باغی صرف مسلمان تھے۔ جب مصنف کو مسلمانوں کی بہادری اور دلیری ثابت کرنا ہوتی ہے تو 1857 صرف ایک جہاد بن کر رہ جاتی جو جانثار اور شجاعت مند مسلمانوں نے لڑی۔ تاہم جب انگریزوں کے انتقام اور مظالم کا ذکر آتا ہے اور ہندوؤں کی مکاری کو عیاں کرنا مقصود ہوتا ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ جنگ دونوں نے مل کر لڑی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مصنف مختلف تعصّبات اور نظریات کے تحت تاریخ لکھ رہا ہے اور وہ موقع کی ضرورت کے مطابق اپنا موقف تبدیل کر لیتا ہے۔ لیکن ان تبدیلیوں سے تحریر کے اندر جو تضادات پیدا ہوتے ہیں۔ ان پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔

اس باب کے آخر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرق کو اجاگر کیا گیا ہے تا کہ دو قومی نظریے کا جواز پیش کیا جائے اور یوں معلوم ہو کہ 1857 قیامِ پاکستان کی تحریک کی ہی ایک کڑی تھی۔

اب مصنف اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ 1837 میں فارسی کو ہٹا کر انگریزی کو سرکاری زبان قرار دے دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں مسلمان بتدریج کمزور ہوتے چلے گئے۔ کیونکہ وہ فارسی زبان سے آشنا تھے لیکن انگریزی تعلیم سے دور رہتے تھے۔ بقول مصنف:

> اس سے ہندوؤں کو تو کوئی فرق نہ پڑا کیونکہ ان کے لیے تو محض ایک غیر ملکی زبان کی جگہ دوسری غیر ملکی زبان کی تبدیلی تھی، اس لیے انہوں نے

بلا تامل انگریزی کو اختیار کرلیا، لیکن مسلمان انگریزی زبان کو قبول کرنے پر تیار نہ تھے۔ ان کے نزدیک زبان کی تبدیلی ان کی ثقافت کو ختم کرنے اور ان کے مذہب کو نقصان پہنچانے کی ایک دانستہ کوشش تھی۔ اس لیے وہ انگریزی زبان کی تعلیم حاصل کرنے سے گریزاں رہے۔ یوں وہ تعلیمی پسماندگی کا شکار ہو گئے۔ ان کے مقابلے میں ہندوؤں نے انگریزی زبان سیکھ کر مسلمانوں پر اپنی تعلیمی برتری قائم کرلی۔ چنانچہ ہندوؤں کے لیے وکالت، ڈاکٹری، انجینئرنگ اور دوسرے شعبوں میں نئی راہیں کھلنا شروع ہوگئیں۔ اس طرح زندگی کے ہر شعبے میں قیادت ہندوؤں کے ہاتھ میں آنے لگی..... مسلمانوں کے دورِ اقتدار میں اسلامی قانون رائج تھا لیکن اب اس کی جگہ بتدریج برطانوی قانون رائج ہو رہا تھا۔ اسلامی قانون آہستہ آہستہ ختم کر دیا گیا اور اس کی جگہ ضابطہ تعزیرات ہند کا نفاذ عمل میں آ گیا۔ اس سے وہ ہزاروں مسلمان جو فقہ اسلامی کا علم رکھنے کی بنا پر عدالتوں میں قاضی کے عہدے پر فائز تھے، برطرف کر دیئے گئے اور ان کی جگہ ہندوؤں کا تقرر عمل میں لایا گیا..... 1857 کی جنگِ آزادی کے بعد مسلمانوں کی معاشرتی، معاشی اور تعلیمی ترقی کی حالت بڑی مایوس کن تھی، وہ مسلسل زوال کا شکار ہوتے جا رہے تھے۔
(صفحہ 92-91)

مندرجہ بالا اقتباس دوقومی نظریے کے تقاضوں کے تحت لکھا گیا ہے۔ ہندوؤں کا عروج مسلمانوں کا زوال تھا۔ ہندوؤں کی ہر کامیابی مسلمانوں کی ناکامی تھی۔ اس باب کے آخر میں مصنف سرسید احمد خان کی کاوشوں کی تعریف کرتے ہیں کہ انہوں نے مسلمانوں کو بیدار کیا۔ انگریزی علوم سے روشناس کروایا اور بالآخر ایک دن ہندوستان کے مسلمان ایک علیحدہ مملکت کا قیام کرنے میں کامیاب ہوئے۔ آٹھویں جماعت کی اس درسی کتاب میں 1857 کو مکمل طور پر مذہبی تعصب اور دوقومی نظریئے کی ضروریات کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ دونوں کی مشترکہ جدوجہد کا ذکر بمشکل ہی ملتا ہے۔ اردو زبان میں لکھے جانے کے باعث ایسی تاریخ کا اثر اُن طلبہ پر ہوتا ہے

جو انگریزی سکولوں میں جانے سے قاصر ہوتے ہیں اور عام طور پر غریب طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے اندر مذہبی تعصب کو فروغ دیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں 1857 میں عورتوں کے نمایاں کردار کا ذکر تک نہیں ملتا۔

جیسے جیسے ایک طالب علم تعلیم کی اعلیٰ سطح پر پہنچتا ہے تو تعصب سے بھرپور مواد میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور حقائق پر انحصار کم ہو جاتا ہے۔ مطالعہ پاکستان کی درسی کتابیں لکھنے والے حضرات بے حد اختصار سے کام لیتے ہیں اور تفصیل طلب واقعات کو اتنا مختصر بیان کرتے ہیں کہ تاریخ اور سچائی دونوں کہیں روپوش ہو جاتے ہیں۔ مزید وہ ایک وسیع تاریخی مواد میں سے صرف وہ حقائق منتخب کر لیتے ہیں جو اُن کے نظریات سے ہم آہنگ ہوں اور تمام ایسے واقعات کو چن لیتے ہیں جو تعصّبات کے مطابق ہوں اور ایک مخصوص نظریہ تاریخ پیش کرنے میں مدد دیں۔ جو واقعات اور حقائق قوم پرستی کی سوچ سے مطابقت رکھتے ہیں، انہیں مبالغے سے پیش کیا جاتا ہے۔ اور اختلافی واقعات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

مطالعہ پاکستان کی نویں اور دسویں جماعت کی کتاب، جو کہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی تیار کردہ ہے، تاریخ کو مکمل طور پر مسخ کر دیتی ہے اور تمام ایسے حقائق اور واقعات کو فراموش کر دیتی ہے جو پاکستان کے حاوی قوم پرست جذبات کے منافی ہوں۔ اس کتاب میں 1857 کی جنگِ آزادی ایک طویل باب کا ایک بہت ہی مختصر حصہ ہے۔ اس باب کا عنوان ہے۔ ''قیامِ پاکستان'' اور اس میں چند سطریں 1857 کو دی گئی ہیں۔ مصنف لکھتے ہیں کہ:

> 1857 کی جنگِ آزادی مسلمانوں کی کھوئی ہوئی سیاسی طاقت کا احیاء کرنے کی کوشش تھی۔ اس میں علماء کی ایک بہت بڑی تعداد نے حصہ لیا۔ انہوں نے مولانا محمد قاسم نانوتوی کی قیادت میں ایک علیحدہ لشکر تیار کیا ..... بعد ازاں ان میں سے بیشتر علماء نے دیوبند کی تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا۔ بدقسمتی سے برطانوی فوج نے یہ جنگ جیت لی اور مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ (صفحہ 16-15)

اس تحریر میں ہمیں ایک خاموشی ملتی ہے۔ نہ تو سپاہیوں کا کوئی ذکر ہے نہ غدر، نہ بغاوت، نہ موت، نہ بہادری، نہ عورتیں اور نہ کوئی ہندو۔ یہ تمام حقائق خارج کر کے ہمیں محض علماء نظر آتے

ہیں اور یہ جنگ صرف ایک مذہبی جنگ بن کر اُبھرتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ایک متبادل کہانی سنا کر اصل کہانی کو فراموش کر دینا چاہتے ہیں۔ پاکستان کے قیام کی کہانی میں ہندوؤں اور مشترکہ جنگوں کی ملاوٹ نہیں کی جاسکتی تاکہ یہ کہانی ایک سیدھی، سادھی اور پاک کہانی معلوم ہو۔ ہندوؤں کے ہمراہ مل کر مزاحمت کی یادداشت کو ختم کرنا ضروری ہے کیونکہ ایسا کرنے سے ہماری شناخت قائم رہتی ہے لہذا ہمیں اجتماعی طور پر بھول جانا ہوگا کہ ہم کبھی ایک تھے، اکٹھے تھے اور مل کر جدوجہد کرتے تھے۔

ہماری مستقبل کی پود کے لیے ضروری ہے کہ وہ تاریخی یک جہتی اور بھائی چارے کو بھلا دے تاکہ ہمارے بچوں کے ذہنوں پر صرف دوری، علیحدگی اور دشمنی کے تاثرات قائم رہیں اور وہ ہمیشہ کے لیے بھول جائیں کہ ایک ایسا ماضی تھا جس میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے دوست، غمگسار اور رازدار تھے۔ ان کے پاس ہماری تاریخی پہچان کا ایک حصہ موجود ہے اور ہمارے پاس ان کے ماضی کی یادوں کا ایک ذخیرہ محفوظ ہے۔ یہ بات ناقابلِ قبول ہے چنانچہ بھول جانے پر بہت محنت کرنا پڑتی ہے اور قوت اور طاقت خرچ کرنا پڑتی ہے۔ ہمارے بچوں کے شعور کی حدود کے باہر ایک اپنا ہے جو پرایا ہوگیا ہے ایک دوست ہے جسے غیر بنا دیا گیا ہے۔ کل کے شہریوں کے دلوں میں اس غیر، اس پرائے کے لیے دوری اور اجنبیت کے احساسات پیدا کرنا ضروری ہے کیونکہ عام لوگوں کی عام یادداشت، ریاست کی مصنوعی یادداشت کی حدود کو پار کر کے بچھڑے ہوئے ساتھیوں سے ملا دیتی ہے۔ درسی کتابوں سے آزاد ایک یادداشت ایسی ہوتی ہے جو لوگوں کے دلوں پر انمٹ لکیر کی طرح ہوتی ہے۔ یہ تمام دروازے اور دیواریں توڑ کر شعور میں داخل ہوسکتی ہے۔ چنانچہ ماضی کو بھلانے کے لیے ریاست اس کی تعمیرِ نو پر، بہت پیسہ اور وقت اور طاقت صرف کرتی ہے۔ ماضی کی یہ تعمیرِ نو حال کے تقاضوں کے تحت کی جاتی ہے۔ عسکریت پسند ریاستیں تو تاریخ کی از سرِ نو تشکیل میں بے حد دلچسپی لیتی ہیں تاکہ لوگوں کے دلوں میں جنگ اور نفرت کے جذبات ابھارے جاسکیں اور جنگ کے لیے جواز ہر دم تیار ہو۔ ہمارا حال ہم پر حاوی ہوتا ہے۔ وہ ایک طرف ماضی کو توڑ پھوڑ کر اس کی نئی تشکیل کرتا ہے تو دوسری طرف ایک مشترکہ مستقبل کے امکانات کو بھی ختم کر دیتا ہے۔ آج کے تقاضے گزرے ہوئے کل اور آنے والے کل دونوں کو اپنی زد میں لے لیتے ہیں۔ چھٹی کے طلبہ نے تو پھر بھی عورتوں اور ہندوؤں کے کارناموں کے بارے

میں کچھ سیکھا لیکن دسویں کے طلبہ نے کچھ نہ سیکھا۔

نوآبادیاتی نظام کے خلاف مزاحمت

نجی اور غیر سرکاری نصاب میں 1857 کی عکاسی

ایک تقابلی جائزہ لینے کی غرض سے سرکاری درسی کتب کے علاوہ نجی اور غیر سرکاری اداروں کی چند کتابوں کا مطالعہ بھی کیا گیا۔ ایک ایسی کتاب کا مطالعہ بھی شامل کیا گیا جو برطانوی نقطۂ نظر کی غمازی کرتی ہے۔ عمومی طور پر جو بات سامنے آئی وہ یہ تھی کہ سرکاری، غیر سرکاری اور نجی شعبوں کی تیار کردہ درسی کتب میں کوئی خاطر خواہ فرق یا واضح فرق نہیں تھا، سوائے ایک کتاب کے جس کے مصنف مشہور مورخ ڈاکٹر مبارک علی ہیں۔

ایس۔ ایف محمود کی لکھی ہوئی ''تاریخ ہندو پاکستان'' آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی شائع کردہ کتاب ہے جو نجی سکولوں میں او لیول یا اے لیول کی سطح پر پڑھائی جاتی ہے۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں عورتوں اور ہندوؤں دونوں کو مثبت انداز میں پیش کیا گیا ہے اور 1857 کی بغاوت کے معاشی اور سیاسی اسباب بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں رانی لکشمی بائی جو جھانسی کی مشہور رانی تھیں اور اودھ کی بیگم حضرت محل دونوں کا ذکر ملتا ہے۔ تاہم مذہبی تعصب کا ہلکا پھلکا عنصر ہمیں اس کتاب میں بھی ملتا ہے۔

ایس۔ ایف محمود کے مطابق 1857 کی کہانی 1856 سے شروع ہوتی ہے جب انگریزوں نے اودھ پر قبضہ کر لیا اور نواب واجد علی شاہ کو تخت سے اتار کر کلکتہ میں قید کر دیا۔ یہاں ہمیں نظریہ الحاق (Doctrine of Lapse) کا ذکر بھی ملتا ہے جس کے مطابق اگر کسی ریاست کے راجہ یا نواب کی وفات ہو جاتی اور اُس کا کوئی جائز ولی عہد یا جانشین نہ موجود ہوتا تو وہ ریاست کمپنی کی ملکیت بن جاتی ہے۔ اس قانون کے تحت انگریزوں نے ستارا، جھانسی اور ناگپور پر قبضہ حاصل کر لیا تھا۔ تاہم محمود کی تحریر جلد ہی مذہبی تعصب کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> سب سے زیادہ اثر مسلمانوں پر ہوا کیونکہ انہیں محسوس ہوتا تھا کہ اُن کے ساتھ بدسلوکی ہوئی ہے۔ یہ درست ہے کہ شروع میں انگریز ان سے خوفزدہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں پر قدرے زیادہ سختیاں کی

تھیں۔ پہلے انہوں نے سندھ پر قبضہ جمایا۔ خاص طور پر اودھ پر قابض ہو گئے اور آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو معمولی وظیفہ دے کر دلی کے لال قلعے میں قید کر دیا۔ بادشاہ کی تمام سرگرمیوں پر انگریزوں کے پہرے داروں کی کڑی نظر ہوتی تھی اور ان وجوہات کی بنا پر مسلمان تکلیف محسوس کرتے تھے۔ ہندو راجا نظریہ الحاق (Doctrine of Lapse) کو اپنے مذہبی عقائد کے برعکس تصور کرتے تھے۔ لوگوں کی اکثریت ناخوش تھی اور اس کے باوجود کہ امن وامان تھا، ایک باضابطہ حکومت موجود تھی، آمدورفت کے ذرائع موجود تھے، کاروباری سرگرمیاں قائم تھیں، سکول اور کالج موجود تھے جو انگریزوں نے بنائے تھے، لوگوں میں غم وغصہ بہت ہو چکا تھا۔ (صفحہ 222)

اگرچہ ایس۔ ایف محمود اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوؤں میں بھی بے چینی کی کیفیت تھی، وہ بھی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مسلمانوں پر زیادہ اثر ہوا تھا اور ان کے ساتھ بدسلوکی ہوئی تھی۔ انگریز ان سے خوفزدہ تھے۔ مسلمان بیک وقت مظلوم اور ہیرو دکھائی دیتے ہیں کیونکہ انگریز ان سے ڈرتے تھے۔ محمود ایک دفعہ پھر اس امر کو اہمیت دیتے ہیں کہ مسلمانوں کے خلاف زیادہ زیادتی ہوئی کیونکہ انگریزوں کو اُن سے زیادہ ڈر تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> لوگ کچھ عرصہ سے کھسر پھسر کر رہے تھے اور کسمپرسی کے عالم میں تھے۔ مسلمان خاص طور پر بہت نالاں تھے۔ انہیں معلوم ہوتا تھا کہ انہیں اعلیٰ عہدوں سے اس لیے دور رکھا جا رہا ہے کہ برطانوی باشندے انہیں بے حد آزادی پسند تصور کرتے ہیں۔ ہندو سپاہی ملک سے باہر جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ انہیں بیرونِ ملک جانا اپنے مذہبی عقائد کے خلاف لگتا تھا۔ مزید لوگوں کو لگتا تھا کہ مشنریوں کے نئے جذبے کے پیچھے بھی لارڈ کیننگ (Lord Canning) کا ہاتھ ہے۔ (صفحہ 222)

جہاں محمود یہ لکھتے ہیں کہ انگریزوں کو مسلمان بہت آزادی پسند لوگ معلوم ہوتے تھے، وہاں اس بات پر غور نہیں کرتے کہ اگر ہندو سپاہی بیرونِ ملک جانے سے انکار کرتے تھے تو وہ بھی

بہت آزادی پسند تھے۔ اس تضاد کا احساس مصنف کو نہیں ہے کہ شاید تمام قومیں خود مختاری چاہتی تھیں نا کہ صرف مسلمان۔ بعد ازاں محمود سور اور گائے کی چربی والے کارتوسوں کا ذکر کرتے ہیں اور تقریباً ہر کتاب میں یہ کہانی بطور وجہ دہرائی گئی ہے۔ حالانکہ اس بغاوت کی متعدد وجوہ تھیں۔ البتہ محمود نانا صاحب اور جھانسی کی رانی کا ذکر کرتے ہیں اور ہندوؤں کے کردار کو قطعی طور پر نظر انداز نہیں کرتے۔ بقول مصنف:

> سر ہیوروز (Sir Hugh Rose) کی سربراہی میں سپاہیوں کو جھانسی روانہ کیا گیا جہاں پر جھانسی کی رانی نے مردانہ لباس میں اُن کا بھرپور مقابلہ کیا۔ وہ اپنے فوجی دستوں کی سپہ سالار تھی اور ان کے شانہ بشانہ لڑی۔ 1858 میں جھانسی فتح ہو گیا لیکن رانی اور ان کا وفادار سپاہی تانتیا ٹوپی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ رانی گوالیار پہنچی اور وہاں سے یلغار کی لیکن دوران جنگ موت کے گھاٹ اتر گئی۔ (صفحہ 224)

اس کے باوجود کہ محمود ہندو لیڈروں کا ذکر کرتے ہیں، ان کی کہانی کے آخر میں مسلمانوں کی عظمت و ہمت اور ان پر ظلم منظر عام پر آ جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> چونکہ مسلمانوں نے نمایاں اور رہنمائی کا کردار ادا کیا تھا اور بہادر شاہ ظفر کو شہنشاہ قرار دے دیا تھا، بغاوت کے اختتام پر انگریزوں نے مسلمانوں سے بہت سخت سلوک کیا۔ نتیجتاً مسلمان انگریزوں سے دور ہو گئے اور ان سے تعاون کرنے سے انحراف کرنے لگے۔ انہوں نے اعلیٰ عہدوں پر تعیناتی سے انکار کر دیا اور انگریزی تعلیم سے اجتناب کیا۔ انہوں نے انگریزوں کے تمغے حاصل کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ہندوؤں نے انگریزوں سے خوب تعاون کیا اور تعلیم کے میدان میں ترقی کی، اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے اور کاروباری اور سیاسی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لینے لگے۔ (صفحہ 225)

ایس۔ ایف محمود بھی بالآخر یہی لکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے نمایاں کردار ادا کیا اور ان پر مظالم ڈھائے گئے۔ ان کے ہاں بھی مسلمان ہیرو اور مظلوم کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ ہیرو اور

مظلوم کے تصورات عموماً قوم پرستی کے بنیادی اجزاء تصور کیے جاتے ہیں۔ ظلم سہنا اور عظیم کارنامے سرانجام دینا قوم پرستی کی کہانیوں میں مقبول مواد ہوتا ہے اور اپنے مقابلے میں دشمن یا حریف قوموں کے افراد کو کمتر، کمزور یا نااہل اور غدار تصور کرنا بھی قوم پرستی کے عناصر میں شامل ہوتا ہے۔ چنانچہ 1857 کی کہانی، جو کہ قوم پرستی سے ہٹ کر ایک مختلف کہانی ہو سکتی تھی، اس نظریئے کی بھینٹ چڑھا دی گئی ہے۔ ہندوؤں کو انگریزوں کا وفادار اور دوست بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور یہ تاثر قائم کیا جاتا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں سے بے وفائی کی۔ اس بے وفائی کو ایک علیحدہ ریاست قائم کرنے کے جواز میں شامل کر لیا جاتا ہے۔

سینٹ اینٹونی ہائی سکول کی تیار کردہ O Level کی مطالعہ پاکستان کی کتاب، تاریخ پڑھانے کے نقطۂ نظر سے قدرے بہتر کتاب ہے لیکن اس میں بھی مذہبی تفریق کا عنصر اُبھر آتا ہے۔ اگرچہ یہ ایک مسیحی ادارے کی اشاعت ہے، اس میں بھی دیگر کتابوں کی مانند 1857 کو قومیت کے زمرے میں دیکھا گیا ہے۔ تاہم مصنف کا انداز سنبھلا ہوا ہے اور الفاظ کے استعمال میں احتیاط برتی گئی ہے۔ کمپنی کی سامراجی پالیسیوں پر تنقید ملتی ہے اور نظریہ الحاق کا ذکر بھی موجود ہے۔ اس میں ہمیں ایسٹ انڈیا کمپنی کی دیگر ایسی پالیسیوں کی طرف اشارہ بھی ملتا جن کی بنا پر ہندوستان کے لوگ کمپنی کی حکومت سے خفا تھے۔ مثال کے طور پر مقامی راجے اور نواب، کمپنی کی اجازت کے بغیر تجارتی معاہدے نہیں کر سکتے تھے اور کاروباری معاملات میں آزاد نہیں تھے۔

اس کتاب میں سیاسی اور معاشی وجوہات کی نشاندہی کی گئی ہے جو بالآخر سرکشی کا سبب بنیں۔ مثال کے طور پر زرعی پیداوار پر لگان کا مسئلہ اور بنگال میں زرعی اراضی کو مستقل طور پر وفاداروں کے نام کرنا (Permanent Setllement of Bengal) اور دیگر ایسے امور زیر بحث آئے ہیں۔ مزید دستکاروں کی آمدنی میں شدید کمی کا ذکر ہے جو کہ صنعتی پیداوار کی بنا پر تباہ ہوئے۔ ہندوستانی تاجروں پر پابندیاں، بھاری ٹیکس جو کہ تاجروں پر لگائے گئے، ہندوستانیوں کی سرکاری ملازمتوں میں عدم شمولیت، زبردستی مذہب تبدیل کروانے کی کوششیں اور لازمی غیر ملکی سروس جیسی پالیسیوں کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی مقامی باشندوں میں بے حد غیر مقبول تھی۔ اس کتاب میں وجوہات کے علاوہ ان لوگوں کا بھی ذکر ملتا ہے جنہوں نے اس مزاحمت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ خاص طور پر جھانسی کی رانی اور حضرت محل کا ذکر موجود ہے۔

> بیگم حضرت محل جو کہ اودھ کے کالعدم حکمران کی اہلیہ تھیں اس بغاوت میں سرگرم تھیں۔ بریلی میں رائے بہادر خان انگریزوں کے خلاف لڑے۔ جون 1858ء میں جھانسی کی رانی لکشمی بائی نے آزادی کی خاطر اپنی جان قربان کردی۔ (صفحہ 21)

اس کتاب میں اگرچہ ہمیں خواتین کے کردار کا سرسری ذکر ملتا ہے لیکن کوئی تفصیل نہیں ہے کہ جس سے عورتوں کے کردار کی ایک مکمل تصویر اُبھر کر سامنے آئے۔ مثال کے طور پر مورخ بتاتے ہیں کہ بہت سی دلت عورتوں نے اس بغاوت میں بھر پور حصہ لیا لیکن ان دلت عورتوں کا ذکر کسی بھی کتاب میں نہیں ملتا۔ اس کے باوجود کہ اس کتاب میں ہمیں ہندوؤں کی شمولیت کا ذکر ملتا ہے اور تعصّبات کی جھلک قدرے کم نظر آتی ہے، مسلمان یہاں بھی مظلومیت کی تصویر بن کر اُبھرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مصنف لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی زمینیں چھین کر ہندوؤں کو دے دی گئیں اور بنگال، بہار اور اڑیسہ میں مسلمانوں کی زمینیں ہندو ریونیو جمع کرنے والے اہلکاروں کو دے دی گئیں۔ اس طرح مسلمان زمیندار مفلس ہو گئے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے معاشی بدحالی نے صرف مسلمانوں کو ہی متاثر کیا اور ہندو بدحالی کا شکار نہیں ہوئے۔ 1857 کی بغاوت کے نتائج کا ذکر کرتے ہوئے مصنف فرماتے ہیں کہ:

> جنگِ آزادی نے انگریزوں اور ہندوستانیوں کے مابین ایک دوری پیدا کردی۔ انگریزوں کو مسلمانوں پر شک وشبہات تھے کیونکہ انہوں نے مسلمانوں کو ہی اس بغاوت کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ کئی مسلمان رہنما دہلی میں سولی پر لٹکا دیئے گئے............ جنگِ آزادی کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں پر عائد کردی گئی۔ (صفحہ 28-27)

اس کتاب کے مصنف ماضی کے اتحاد کو تسلیم کرتے ہیں کیونکہ وہ لکھتے ہیں کہ جنگِ آزادی کے بعد مسلمانوں اور ہندوؤں کا اتحاد ٹوٹ گیا اور وہ ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ ماضی کے اتحاد سے ہمیں یہ دلیل ملتی ہے کہ ہندو اور مسلمان ہمیشہ سے ایک دوسرے کے دشمن نہیں تھے۔ ان کی دوری کوئی ازلی اور ابدی حقیقت نہیں تھی۔ لیکن دیگر کتابوں کی طرح اس میں بھی ہمیں یہ بات ملتی ہے کہ پنجاب نے باغیوں کا ساتھ نہیں دیا بلکہ انہوں نے انگریزوں کی مدد کی۔ تقریباً

تمام کتابوں میں سکھ عقیدے کے افراد انگریزوں کے وفادار نظر آتے ہیں لیکن کسی بھی کتاب میں طلبہ کو اس وفاداری کا سبب نہیں بتایا گیا۔ اگر تاریخ کو تمام زاویوں سے دیکھا جائے اور مذہبی تعصّبات سے بالاتر ہو کر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سکھوں کو انگریزوں سے اس قدر گلہ نہیں تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کی حکمرانی کے دور میں یہ ناخوش تھے اور ان کے ساتھ زیادتیاں ہوئی تھیں۔ ان کے لیے مسلمان حکمرانوں کی نسبت انگریزوں کی حکومت بہتر تھی۔ مزید یہ کہ پنجاب قدرے دیر سے نوآبادی بنا تھا اور یہ بغاوت ان ریاستوں میں ہوئی جہاں انگریزوں نے اپنا تسلط پہلے جمایا۔ چنانچہ سکھوں کو مسلمانوں کی حکمرانی سے کوئی رغبت یا وفاداری کا احساس نہیں تھا۔ تاریخی وجوہات بیان نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ غدار قرار دے دیئے جاتے ہیں۔ لہٰذا سکھ ہمیں 1857 میں غداروں کے روپ میں ملتے ہیں کیونکہ درسی کتب اس امر کی تاریخ پر روشنی نہیں ڈالتیں کہ بالآخر ایسا کیوں ہوا۔

مڈل کی سطح کے بچوں کے لیے اضافی مواد پر مبنی ڈاکٹر مبارک علی کی کتاب ''برطانوی ہندوستان'' میں 1857 پر دلچسپ مواد ملتا ہے۔ اگرچہ مبارک علی سیاسی، سماجی اور ثقافتی وجوہات کا بھی ذکر کرتے ہیں، ان کے تجزیئے میں معاشی اور اقتصادی وجوہ کو ترجیح دی گئی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں چند باتیں اہم ہیں جو اسے ایک منفرد حیثیت فراہم کرتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مبارک علی کی لکھی ہوئی تاریخ میں ہمیں رجعت پسندی، مذہبی تعصب اور تفریق کے پہلو نہیں ملتے۔ یہ کتاب اس قدر معروضی ہے جتنا کہ تاریخ معروضی ہو سکتی ہے۔ یہ قوم پرستی کے جذبات سے بالاتر ہو کر لکھی گئی ہے۔ لہٰذا کسی بھی ایک ریاستی نقطۂ نظر کی غمازی نہیں کرتی۔ ایک دوسرا پہلو جو اس کتاب کو ایک علیحدہ حیثیت فراہم کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں ایک سے زائد متبادل زاویئے بتائے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزوں نے 1857 کو کیسے دیکھا، ہندوستان کی مختلف قوموں اور مختلف تاریخ دانوں نے اس واقعہ کو کیونکر سمجھا۔ مزید اس کتاب میں بے شمار رنگین اور دلچسپ تصاویر کا استعمال اسے اتنا دلکش بناتا ہے کہ انسان کا جی چاہتا ہے کہ اس کتاب کو پڑھے۔ اس کے علاوہ روزمرہ کی عام فہم زبان استعمال کی گئی ہے تاکہ پڑھنے والوں کو دقت نہ ہو اور وہ باآسانی اس مواد کا مفہوم سمجھ لیں۔ ایک اور بات جو خاص طور پر قابلِ ذکر ہے وہ یہ ہے کہ مبارک علی کی کتاب سے پڑھنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ 1857 ایسٹ انڈیا کمپنی کی پالیسیوں کے خلاف پہلی سرکشی

نہیں تھی بلکہ اس سے پہلے 1764 سے لے کر 1793 تک کئی چھوٹی چھوٹی بغاوتیں ہوئیں جنہیں کچل دیا گیا چنانچہ وہ تاریخ کے اوراق میں اپنی صحیح جگہ حاصل کرنے سے قاصر رہیں۔ان بغاوتوں کی بنیادی وجہ سخت قسم کی ریونیو پالیسیاں تھیں اور انگریزوں کے سخت لگان کے باعث یہ مزاحمت ہوئی کیونکہ بنگال اور دیگر ریاستوں کے کسان لگان اور ریونیو اور ٹیکس کی وجہ سے بدحال ہو چکے تھے۔انہوں نے انگریزوں کے معاشی نظام کے خلاف آواز اٹھائی۔دلچسپ بات یہ ہے کہ اُس دور میں بھی گورنر وارن ہیسٹنگز نے باغیوں کو''دہشت گرد'' اور''شر پسند عناصر'' جیسے کلمات سے نوازا۔آج بھی اگر کوئی سامراجیت کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اور استحصالی پالیسیوں پر تنقید کرتا ہے تو اسے''دہشت گرد'' کہہ کر سزا دی جاتی ہے۔یہ روش چند صدیوں سے چلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔اس طرح ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ماضی اور حال کی سامراجی قوتوں کی سوچ میں ایک تسلسل تھا جو آج بھی قائم ہے۔

مبارک علی کے خیال میں 1857 کی بغاوت کی وجوہات بنیادی طور پر معاشی تھیں جبکہ چند سماجی اور سیاسی بھی تھیں۔ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں متواتر دور رس تبدیلیاں کی تھیں جن کی بنا پر بے یقینی کی کیفیت عام تھی۔صنعتی انقلاب کی وجہ سے مقامی دستکاری کی صنعت تباہ ہو چکی تھی۔جدید کپڑے کی فیکٹریوں کی وجہ سے جولاہوں کا بھی دیوالیہ ہو چکا تھا اور ان کا ہنر بے کار ہو گیا تھا۔نتیجتاً ان کی آزادی ختم ہو گئی اور وہ ملازمتیں اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔انہوں نے دیہاڑی پر کام کرنا شروع کر دیا۔کمپنی نے تجارتی سرگرمیوں پر قبضہ کر لیا اور اس کے نتیجے میں مقامی تاجر بے بس ہو گئے۔کسانوں اور دیہی آبادیوں کی زندگی تباہ ہو چکی تھی کیونکہ ان کا بے حد استحصال ہوا جس کی وجہ سے یہ بہت خستہ حال ہو گئی تھیں۔ریونیو کا نظام بہت کڑا تھا اور دیہی آبادیوں کی بدحالی کا سبب بن گیا۔کمپنی اس قسم کی فصل کو فروغ دیتی تھی جو بازار میں بک سکے اور اس سے منافع حاصل ہو جو کمپنی کے کھاتے میں جاتا تھا۔لہذا دیہی علاقوں کے لوگوں کے پاس سرمایہ نہیں رہا اور وہ مقامی ساہوکاروں کے ہاتھوں قرضوں میں جکڑے گئے۔

مبارک علی اس بغاوت کو طبقے اور ذات پات کی رو سے بھی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہندوؤں میں ذات پات کی تفریق عام تھی اور کمپنی کی کچھ پالیسیاں ایسی تھیں جن سے ان کے مذہبی جذبات مجروح ہوتے تھے۔مسلمانوں کے بھی مذہبی جذبات کمپنی کی پالیسیوں سے مجروح

ہوئے۔ مثال کے طور پر ترقی کے نام پر سڑکیں بنانے کی خاطر اکثر مندروں اور مسجدوں کو زمیں بوس کر دیا جاتا تھا۔ خواتین کو ہسپتالوں میں داخل کر دیا جاتا تھا جہاں وہ پردہ نہیں کر سکتی تھیں۔ مختلف ذات کے لوگ ریل گاڑیوں کے ایک ہی ڈبے میں سوار ہوتے تھے تو ذات پات کا نظام درہم برہم ہو جاتا تھا۔ اسی طرح جدید ہسپتالوں میں مختلف ذات کے ہندوؤں کو ایک ہی وارڈ میں رکھا جاتا تھا تو ان کے مذہبی جذبات متاثر ہوتے تھے۔ اگرچہ آج کی قدروں کی رو سے دیکھا جائے تو یہ تبدیلیاں ترقی پسند تھیں لیکن 1857 میں انہیں معیوب انداز میں دیکھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ انگریز بیواؤں کی دوسری شادی کے حق میں تھے اور ستی کی رسم کو غیر قانونی قرار دیتے تھے۔ ان تمام سماجی تبدیلیوں سے مذہبی لوگ پریشان تھے۔ مزید یہ کہ لڑکیوں کے لیے سکول کھولنے پر ہندو اور مسلمان دونوں سیخ پا تھے۔

مبارک علی کے مطابق مختلف طبقے مختلف وجوہات کی بنا پر انگریزوں سے نالاں تھے۔ جاگیردار طبقہ اس بات سے متنفر تھا کہ ان کی جاگیروں کو ضبط کر لیا گیا تھا۔ نظریہ الحاق (Doctrine of Lapse) کی وجہ سے ایسے راجا اور مہاراجہ ناراض تھے جن کے ہاں اپنی اولاد نہیں تھی اور انہیں ڈر تھا کہ انگریز ان کی ریاستوں پر قابض ہو جائیں گے۔ ہندوستان کے سپاہی جو کہ انگریزی فوج میں ملازم تھے، اس بات پر خفا تھے کہ یہ داڑھی اور مونچھ صاف کرنے پر مجبور تھے اور بال کٹوانے پر بھی زور دیا جاتا تھا جو کہ مقامی سپاہیوں کے مذہبی جذبات کے برعکس تھا۔ مزید تلک لگانے، کانوں میں بالیاں پہننے اور پگڑی باندھنے پر بھی پابندی تھی اور انگریزوں کا اصرار تھا کہ وہ چمڑے کی بنی ہوئی ٹوپی پہنیں۔ یہ تمام باتیں ان کے مذاہب کے خلاف تھیں۔ سور اور گائے کی چربی چڑھے کارتوس بھی اسی رجحان کی ایک کڑی تھے۔

ان سماجی پہلوؤں کے علاوہ لوگوں کی زندگی اجیرن تھی کیونکہ یکے بعد دیگرے قحط پڑے جن کی وجہ سے لوگ بھوکے مر گئے۔ جو طبقے پہلے ہی غریب، نادار اور مفلس ہو چکے تھے وہ مزید تباہی سے دوچار ہونے لگے۔ سخت ریونیو کی پالیسیوں کی وجہ سے افراطِ زر میں شدید اضافہ ہوا اور لوگ تباہی کی جانب گامزن ہونے لگے۔ زمیندار اور تعلقہ دار اپنی کھوئی ہوئی مراعات کی بنا پر ناخوش تھے۔ مبارک علی کا تجزیہ ایسا پہلا تجزیہ ہے جو نصاب کی کتابوں میں طبقاتی اور معاشی عناصر کی نشاندہی کرتا ہے اور رجعت پسند اور قدامت پسند نظریات سے ہٹ کر بغاوت کا جائزہ لیتا ہے۔

1857 کی بغاوت کی ناکامی پر روشنی ڈالتے ہوئے مبارک علی کا کہنا ہے کہ مقامی فوج کے سربراہوں کے پاس نہ تو تجربہ تھا کہ وہ اتنی بڑی جنگ لڑتے اور نہ ہی فوج میں نظم وضبط تھا۔ ان کے پاس جدید اور مؤثر اسلحہ بھی نہیں تھا اور نہ ہی ایک دوسرے سے رابطے رکھنے کے کوئی جدید مواصلاتی طریقے موجود تھے۔ مزید یہ ہوا کہ کئی مقامی سپاہیوں کی وفاداری انگریزی فوج کے ساتھ تھی اور وہ مخبر بن گئے۔ انہوں نے مقامی سپاہیوں کے بارے میں انگریزوں کو مخبری کی اور ان کو پکڑوا دیا۔ مقامی آبادی میں فی الحال قوم پرستی کے جذبات نہیں ابھرے تھے اور ہندوستان کے لوگ خود کو ایک قوم تصور کرتے تھے۔ انگریزی افسر مقامی باشندوں کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے جس سے ان میں احساسِ کمتری پیدا ہو گیا تھا۔ انگریز مشنری لوگوں کو بتاتے تھے کہ ان کا مذہب جھوٹا ہے اور صرف انگریزوں کا مذہب سچا ہے جس سے لوگوں میں غم وغصہ کی لہر دوڑ چکی تھی اور وہ اپنے آپ کو کمزور محسوس کرتے تھے۔

غدر کے آخری ایام میں لوگوں پر بے حد مظالم ڈھائے گئے کئی لوگوں کو صرف بغاوت میں شامل ہونے کے شبے پر سولی پر لٹکا دیا گیا۔ سپاہیوں کو توپ کے دہانے سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ مغل شہزادوں کو ظالمانہ انداز میں قتل کر دیا گیا۔ دہلی شہر میں بے انتہا لوٹ مار کی گئی اور گھروں اور ان میں مقیم افراد دونوں ہی کو بے دردی سے لوٹا گیا۔ جو بچ نکلے وہ فرار ہو کر روپوش ہو گئے۔ مخبر صرف 2 روپے کے عوض لوگوں کو انگریزوں کی حراست میں ڈلوا دیتے تھے۔

مبارک علی کی کتاب میں بغاوتِ ہند کے عورتوں پر اثرات کے بارے میں بھی کچھ معلومات ملتی ہیں۔ ظہیر دہلوی کی ''داستانِ غدر'' کا حوالہ دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ عورتوں نے بچوں سمیت کنویں میں چھلانگ لگا دی تا کہ وہ اپنی آبرو کی حفاظت کر سکیں۔ دہلی کے کنویں عورتوں اور معصوم بچوں کی لاشوں سے بھرے ہوئے تھے۔ عورتوں اور مردوں دونوں کو دہلی سے جبراً نکال دیا گیا۔ مردوں کو کشمیری دروازے اور عورتوں کو کابلی دروازے سے۔ ان کے نکالے جانے کے بعد مخبروں کا بازار گرم ہوا اور انگریزوں نے دہلی پر بھرپور یلغار کر دی۔ انہوں نے لوٹ کھسوٹ کی، اور دل کھول کر قتل وغارت گری کی۔

مبارک علی کی کتاب سے بچوں کو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تاریخ نویسی میں محض کوئی ایک نظریہ حاوی نہیں ہوتا بلکہ کئی متبادل نظریات ابھرتے ہیں جو ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس واقعہ کو فوراً غدر کا نام دیا اور ابتداء میں یہ سمجھا کہ شاید یہ صرف میرٹھ کے سپاہیوں تک محدود تھی۔ انگریزوں کے مطابق ان واقعات کی تمام تر ذمہ داری نوابوں، راجاؤں اور جاگیرداروں پر عائد ہوتی تھی جو اپنی جائیداد اور مراعات کھو چکے تھے اور اس وجہ سے انگریزوں سے متنفر تھے۔ چند برطانوی مورخوں کے مطابق یہ نانا صاحب، جھانسی کی رانی اور حضرت محل کی سازش تھی جبکہ عام لوگوں کو انگریزی حکومت سے کوئی خفگی نہیں تھی اور ہندوستانیوں کی اکثریت انگریزی دور سے خوش تھی۔ چند مورخ ایسے بھی تھے جن کا کہنا تھا کہ یہ واقعات مسلمانوں کے امراء کے طبقوں کی سازش کے نتیجے میں ہوئے کیونکہ یہ طبقے اپنے طاقت اور مراعات سے محروم ہو چکے تھے۔ ان مورخوں کا کہنا تھا کہ ہندوؤں نے اس بغاوت میں بعد میں شمولیت اختیار کی۔

ہندوستان کے تاریخ دانوں نے 1857 کو ایک مختلف زاویئے سے دیکھا اور 1909 میں ساورکر نے ایک کتاب لکھی جس میں اس نے یہ موقف اختیار کیا کہ یہ ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی تھی۔ اس کتاب میں باغیوں کو ہیرو کہا گیا اور اس بات پر زور دیا گیا کہ اس مزاحمت میں ہندو اور مسلمان دونوں مل کر لڑے تھے۔ کمپنی کی حکومت کے آخری دور تک بہادر شاہ ظفر کو ہندوستان کا جائز حکمران تسلیم کیا جاتا رہا۔ کمپنی نے بہتر ٹیکنالوجی اور دھوکے دے کر طاقت چھین لی تھی۔ چنانچہ مبارک علی کے مطابق اصولی موقف تو یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر چونکہ جائز حکمران مانا جاتا تھا لہذا اسے غدار نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ ہندوستان کا قانونی حکمران تھا۔

تاہم تاریخ میں واقعات کو اصولوں اور قدروں کے تحت نہیں بلکہ طاقت کے نقطۂ نظر سے دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔ تاریخ کون لکھتا ہے اور کیوں اور اس کی حیثیت اور طاقت کتنی ہے، اس کا اثر تاریخ کی تصنیف پر پڑتا ہے۔ اس قسم کی درسی کتب بچوں کے ذہن کو کشادہ بنانے میں مدد کرتی ہیں کیونکہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کو پرکھنے کا کوئی واحد اور سچا نظریہ نہیں ہے بلکہ اسے مختلف نقطۂ نظر سے دیکھنا ممکن ہے۔ یہ محض حقائق پر مبنی نہیں ہوتی حقائق کو کسی نہ کسی سانچے میں ڈال کر دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ خاکہ قوم پرستی پر بھی مبنی ہو سکتا ہے لیکن مارکسی، سامراجی یا پھر کچلے ہوئے اور پسے ہوئے عوام کے تجربات کے زاویئے سے بھی ہو سکتا ہے۔

مبارک علی، رانی لکشمی بائی، جنہوں نے جھانسی میں جنگ لڑی، کا ذکر بھی کرتے ہیں لیکن یہ حضرت محل کا تذکرہ زیادہ تفصیلی طور پر کرتے ہیں۔ یکم نومبر 1858 کو ملکہ وکٹوریہ نے کمپنی کی

حکومت کو ختم کرنے کا اعلان کیا اور ہندوستان برطانوی راج کا ایک حصہ بن گیا۔ حضرت محل نے ملکہ وکٹوریہ کے اعلامیے کا بہت ذہانت اور دانشمندی سے بھرپور جواب دیا جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف جنگجو خاتون تھیں بلکہ ایک جہاندیدہ اور دوراندیش عورت بھی تھیں جنہوں نے برطانوی سامراج کی چالوں کو سمجھ لیا تھا۔ مبارک علی حضرت محل کے اس خط کا اقتباس پیش کرتے ہیں:

> اس اعلان میں لکھا ہے کہ کمپنی نے جو وعدے اور عہد و پیماں کیے ہیں ملکہ انہیں منظور کرے گی۔ لوگوں کو چاہیے کہ وہ اس چال کو غور سے دیکھ لیں۔ کمپنی نے سارے ہندوستان پر قبضہ کر لیا ہے..... کمپنی نے بھرت پور کے راجہ کو پہلے اپنا بیٹا بنایا پھر اس کا علاقہ لے لیا۔ لاہور کے راجہ کو وہ لندن لے گئے اور پھر کبھی اسے ہندوستان لوٹنے نہیں دیا۔ نواب شمس الدین خان کو ایک طرف انہوں نے پھانسی پر لٹکا دیا دوسری طرف اسے سلام کیا۔ پیشوا کو انہوں نے پونا اور ستادا سے نکال دیا اور زندگی بھر کے لیے بھٹور میں قید کر دیا۔ بنارس کے راجہ کو انہوں نے آگرہ میں قید کر دیا۔ بہار، بنگال اور اڑیسہ کے راجاؤں کا انہوں نے نام و نشان تک نہ چھوڑا۔ خود ہمارے قدیم علاقے ہم سے یہ بہانہ کر کے لے لئے کہ فوج کو تنخواہیں دینی ہیں۔ ہمارے ساتھ جو عہد نامہ کیا اس کی دفعہ 7 میں قسم کھائی گئی تھی کہ ہم اب آپ سے اور کچھ نہ لیں گے، اس لئے جو انتظام کمپنی نے کر رکھے ہیں وہ اگر قائم رکھے جائیں گے تو اس سے پہلے کی حالت میں اور اب نئی حالت میں کتنا فرق ہوا؟ (صفحہ 71)

چنانچہ یہ بات واضح ہے کہ مبارک علی نے عورتوں کے نمایاں کردار کا اعتراف کیا ہے۔ مبارک علی کی لکھی ہوئی تاریخ کی درسی کتاب قوم پرست، مذہبی اور دیگر قسم کے تعصّبات سے پاک ہے۔ ان کی تحریر میں بنیادی طور پر 1857 کی اقتصادی اور معاشی وجوہات کو ترجیح دی گئی ہے۔ اس کتاب کا اردو زبان میں ہونا پاکستانی بچوں کے لیے ایک خوش آئند بات ہے کیونکہ اردو میں کم ہی ایسی کتابیں میسر ہوتی ہیں جو ان تعصّبات سے پاک ہوں۔ مبارک علی اس بات پر روشنی ڈالتے

ہیں کہ 1857 کوئی ایک اکیلا واقعہ نہیں تھا بلکہ بغاوتوں کی ایک لمبی کہانی کی ایک کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بغاوتیں انگریزی سامراج کے خلاف وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی تھیں لیکن انگریزوں کے جدید ہتھیاروں کے آگے یہ ناکام ہوجاتی تھیں۔ اس کتاب میں ہمیں ان بغاوتوں میں پنہاں طبقاتی اور ذات پات کی تفریق کے عناصر کے بارے میں بھی پتا چلتا ہے۔ اس طرح 1857 کی کہانی محض ایک مذہبی جنگ یا قوم پرست جدوجہد کی کہانی نہیں رہتی بلکہ بے انصافی اور استحصال کے خلاف انسانی جدوجہد کی ایک داستان بن جاتی ہے۔

آنے والے طوفان کی آہیں: 1857ء پر ایک انگریزی نظریہ

پاکستان میں شائع کردہ کتابوں سے موازنہ کرنے کی غرض سے برطانوی نقطۂ نظر سے ترتیب دی گئی کتاب کا مطالعہ بھی کیا گیا۔ یہ کتاب ٹریزا کرومپٹن (Teresa Crompton) نے لکھی اور یہ پاکستان کے نجی انگریزی سکولوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس تحریر میں ہمیں سامراجیت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور جن مصنفین کا حوالہ دیا گیا ہے وہ یا تو برطانوی افسر اور تجزیہ نگار ہیں یا ایسے افراد ہیں جو انگریزوں کے وفادار تھے مثلاً سرسید احمد خان کرومپٹن کی کتاب سے ہمیں 1857 کے بارے میں سامراجی ذہنیت اور سوچ کا عنصر ملتا ہے۔ انگریزوں کے جذبات، خدشات اور خوف کا احساس ہوتا ہے۔ ٹریزا کرومپٹن شروع میں اس بغاوت کے اسباب پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے ہندوستانی سپاہیوں کو تنقید کا نشانہ بناتی ہیں اور لکھتی ہیں کہ:

> برصغیر میں 45,000 برطانوی اور 232,000 ہندوستانی سپاہی تھے۔ چنانچہ یہ سپاہی مغرور ہوگئے تھے اور سمجھتے تھے کہ برطانوی کامیابیاں اور فتوحات ان کے ہنر اور جرأت مندی کا نتیجہ تھیں۔ انہیں برطانوی حکمرانوں کا خوف نہیں رہا تھا۔ (صفحہ 42)

یہ بات مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستانی سپاہیوں کو مغرور بیان کیا جارہا ہے جبکہ بہت سے مفکرین کا خیال تھا کہ بغاوت کی ایک بڑی وجہ کمپنی کے افسران کا رویہ تھا۔ وہ خود کو دوسروں سے اعلیٰ اور افضل تصور کرتے تھے اور مقامی لوگوں کو حقیر مانتے تھے۔ اگر مقامی سپاہیوں کی تعداد 232,000 تھی اور انگریز افسر صرف 45,000 تھے تو اس بات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انگریزوں

کی فتوحات اپنے سپاہیوں کی بدولت تھیں۔ کرومپٹن کی تصنیف سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریز افسران کی برتری پر یقین رکھتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ انگریزی فتح کی وجہ انگریز افسروں کی اعلیٰ کارکردگی تھی۔ اسی قسم کے جملے نسلی برتری کے تصورات کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ کرومپٹن کا یہ کہنا کہ ہندوستانی سپاہی اب برطانوی حکمرانوں سے خوفزدہ نہیں رہے تھے، اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ سمجھتی ہیں کہ انہیں انگریزوں سے ڈرنا چاہیے تھا۔ ان سے خوفزدہ نہ ہونا کوئی بری بات تھی۔ کرومپٹن کی تحریر میں نسلی برتری اور سامراجیت کا امتزاج واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں انگریزی تہذیب مقامی تہذیب سے برتر تھی اور دوسروں کو محکوم بنا کر ان کا استحصال کرنا ان کا حق تھا۔ مقامی باشندے وحشی تھے اور اس قابل تھے کہ انہیں زیر کرلیا جائے۔ یا یہ کہ ان پر تسلط حاصل کرنا انگریزوں کا حق تھا۔ یہ کتاب نوآبادی اور سامراجی سوچ کی غمازی کرتی ہے۔

کرومپٹن کی کوشش ہے کہ انگریزوں کی زیادتیوں اور ظلم کی کہانی کو ہلکا کیا جائے اور انہیں اس الزام سے بری کیا جائے کہ انہوں نے مقامی لوگوں کے مذہبی اور ثقافتی جذبات کو مدِ نظر نہیں رکھا۔ وہ لکھتی ہیں کہ اگرچہ انگریزوں نے متنازعہ کارتوس تبدیل کردیئے تھے مگر تب تک بات ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ اس کے علاوہ وہ سرسید احمد خان کے دلائل کا استعمال کرتے ہوئے دعویٰ کرتی ہیں کہ بغاوت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ انگریزوں کے بنائے ہوئے نئے قوانین وضوابط ہندوستانیوں کی سمجھ سے باہر تھے۔ ان کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ انگریزوں کے قوانین اور ضوابط غلط نہیں تھے بلکہ مقامی لوگوں میں ان کو سمجھنے کی عقل نہیں تھی۔ چنانچہ غلطی یہاں بھی ہندوستانیوں کی ہی تھی۔ ٹریزا کرومپٹن چند ایسے امور کی جانب بھی اشارہ کرتی ہیں جن سے مقامی عوام کے غم وغصہ کی جائز وجوہات کا اندازہ ہوتا ہے تاہم ان کا نقطۂ نظر عمومی طور پر برطانوی ہے۔

کرومپٹن کی تصنیف سے ہمیں انگریزی افسران کے خدشات اور خوف کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ان افسران کو ڈر تھا کہ مقامی سپاہی کسی بھی وقت سرکش ہوسکتے ہیں کیونکہ ان کے اندر بے چینی کی ایک کیفیت نظر آتی تھی۔ وہ ایک انگریزی کمپنی کے افسر کے خدشات بیان کرتی ہیں جو اس نے 5 مئی 1859 کو قلم بند کئے:

میں جانتا ہوں کہ اس وقت پوری مقامی فوج میں ایک بے چینی اور ہلچل

ہے لیکن میں یہ کہنے سے ڈرتا ہوں کہ اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔ مجھے آنے والے طوفان کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ مجھے ایک شدید آندھی کی پہلی آہیں سنائی دے رہی ہیں لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ طوفان کیسے، کب اور کہاں پھوٹ پڑے گا۔ (صفحہ 42)

کمپنی کے بیشتر افسران میں یہ احساس تھا کہ کچھ ہونے والا ہے اور وہ کسی حد تک اس آنے والی افتاد سے خوفزدہ تھے۔ ایک انگریزی افسر کی اہلیہ مسز کوپ لینڈ (Mrs. Coopland) نے مندرجہ ذیل الفاظ قلمبند کئے:

مجھے اپنے ملازموں کے رویئے پر بہت حیرت ہوئی..... وہ بڑی حد تک دلیر ہو چکے تھے اور سر اٹھانے لگے تھے۔ میری آیا میری جائیداد کو ایسی نگاہوں سے دیکھتی تھی گویا وہ لوٹ مار میں اس کا حصہ ہوگی۔ جب میں اپنا سنگھار کا ڈبہ کھولتی تو وہ مجھ سے متعدد سوال پوچھتی۔ وہ مجھ سے زیورات کے بارے میں پوچھتی اور جاننا چاہتی کہ عطر کی بوتلوں کے ڈھکن کیا واقعی اصلی چاندی کے بنے ہوئے تھے! وہ ہمیشہ غور سے دیکھتی کہ اپنی اشیاء کہاں رکھ رہی ہوں..... میرے شوہر نے پنکھا قلی ملازموں کی باتیں سن لیں۔ وہ باہر ہمارے بارے میں بہت کچھ کہہ رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ان فرنگیوں کا جلد ہی اب کوئی دوسرا گھر ہوگا اور ہندوستان کے لوگ اپنی سرزمین کے مالک بن جائیں گے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ یہ فرنگی اپنے ٹھنڈے ممالک میں تو بہت سخت جان ہوتے ہیں لیکن یہاں ہندوستان کے موسم میں یہ بے چارے ہر وقت پنکھے کے بغیر گزارا نہیں کر پاتے۔ (صفحہ 42)

یہ تمام باتیں آنے والے طوفان کا پیش خیمہ تھیں اور انگریزی افسران پریشان تھے۔ انہیں اپنے نوکروں کے بدلے ہوئے تیور میں آنے والی کل کی اصلیت دکھائی دینے لگی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ باغیوں کا حملہ ہوا تو مسز کوپ لینڈ کو ان کے مسلمان نوکر نے ہی بچایا لیکن مسز کوپ لینڈ کے مندرجہ بالا الفاظ سے سامراجی سوچ کی ایک واضح جھلک ملتی ہے۔ گھریلو ملازم ملکیت

تصور کرنے لگی تھی۔ یہ سوچ اس لیے مضحکہ خیز ہے کہ دراصل ہندوستان مقامی باشندوں کی سرزمین تھا اور اس پر انہی کا حق تھا۔ وہاں پر لٹیرے دراصل انگریز تھے۔ یہ بات گھریلو ملازمین کو اچھی طرح معلوم تھی لیکن ان کے اس چھپے ہوئے علم کو سرکشی اور بدتمیزی کہہ کر ان کے حق کی نفی کی گئی۔ برطانوی افسران کو عادت تھی کہ ان کے ملازمین فرمانبردار، تابعدار، محکوم اور وفادار ہوں۔ ان کے دلوں میں تبدیلی اس بات کی نشان دہی تھی کہ غیر قانونی اور غیر ملکی حکمرانوں کے لیے مشکلات کا وقت آنے والا ہے۔

ٹریزا کرومپٹن، سرسید احمد خان کی تحریر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتی ہیں کہ آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر لوگوں کی نظروں میں اپنی عزت کھو بیٹھا تھا۔ اس کی کچھ عجیب وغریب عادات تھیں اور اس کی دلچسپی کا مرکز صرف موسیقی، شاعری اور خطاطی تھے۔ اس کی توجہ ملک پر حکمرانی کرنے کی طرف نہیں تھی۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ مبارک علی آخری مغل شہنشاہ کی انہی باتوں کی تعریف کرتے ہیں جن کو کرومپٹن تنقید کا نشانہ بناتی ہیں۔ بقول مبارک علی بہادر شاہ ظفر نے فنونِ لطیفہ اور دیگر فنون کو فروغ دیا اور مرزا غالب اور ذوق جیسے شاعران کے دربار میں شاعری کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے، ظفر خود بھی شاعری کرتے تھے لیکن سامراجی شعور کے مطابق ایک بادشاہ تب تک اچھا حکمران نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ فتوحات نہ کرے اور امور حکمرانی پر توجہ نہ دے۔ ایک شاعر اور فنونِ لطیفہ کا شیدائی ہونا سامراجی نظریہ کے مطابق حکمرانی سے ہم آہنگ نہیں۔

تاہم ٹریزا کرومپٹن اس بات کا اعتراف کرتی ہیں کہ انگریزوں نے خود کو مہذب اور عاقل قوم کہنے کے باوجود بغاوت کے اختتام پر وحشیانہ انتقام کا مظاہرہ کیا۔ ان کی کامیابی میں سکھوں اور گرکھوں کا نمایاں ہاتھ تھا اور چند مقامی شہزادوں اور رہنماؤں نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا۔ وہ برطانوی کپتان فرانس موڈ (Frances Moude) کا حوالہ دیتی ہیں جو سپاہیوں پر ظلم اور بربریت کی انتہا کی ایک دردناک تصویر ہے:

> سب سے پہلے ایک خوش شکل نوجوان سپاہی کو لایا گیا۔ اس کے چہرے کے نقوش اچھے تھے اور اس کی شکل پر دلیری اور عزم نظر آتا تھا۔ اس نے بنتی کی کہ اسے باندھا نہ جائے لیکن اس کی اجازت دینا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اس کی کلائی کو زور سے بندھوا دیا۔ اس کی دونوں کلائیاں

توپ کے پہیئے کے اوپر کے حصے سے باندھ دی گئیں.....وہ قطعی طور پر گھبرایا نہیں۔ پھر میں نے توپ چلانے کا حکم دیا۔ اس کا جسم توپ سے آگے کی جانب ہلا اور فضا میں دھواں پھیل گیا۔ جیسے ہی یہ دھواں ہٹا ہم نے دیکھا کہ توپ کے سامنے دو ٹانگیں گری پڑی تھیں۔ لیکن ایک انسانی جسم کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ ایک بہادر انسان غائب ہو چکا تھا.....اس سے اگلا آدمی بے حد خوفزدہ تھا اور پورے زور سے کوشاں کہ وہ اس المناک موت سے بچ نکلے۔ (صفحہ 43)

اس اقتباس سے انگریزوں کے مہذب قوم ہونے کا دعوی مسترد ہو جاتا ہے۔ اس قسم کا وحشیانہ انتقام یہ ثابت کرتا ہے کہ مہذب ہونا کسی قوم کی فطری اساس نہیں ہے بلکہ کوئی بھی قوم ضرورت پڑنے پر تہذیب کا دامن چھوڑ کر وحشیانہ فعل کا ارتکاب کر سکتی ہے اور ہر قوم میں مہذب طور طریقے اختیار کرنے کی صلاحیت ہے۔

برطانوی زاویئے سے لکھی گئی اس کتاب میں عورتوں کے کردار کے بارے میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ نہ تو جھانسی کی رانی کا کوئی تذکرہ ملتا ہے اور نہ ہی حضرت محل اور ان بیشتر دلت عورتوں کا کوئی ذکر موجود ہے جنہوں نے 1857 میں نمایاں کردار ادا کیا اور فوج کشی کی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ کتاب سامراج کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔ مقامی بیروزگار کا ذکر سامراجی قوتوں کے حق میں نہیں جاتا۔ انگریز تو باغیوں کو دہشت گرد، شر پسند عناصر اور ایسے دیگر خطابات سے نوازتے تھے۔ ان کے ہاں یہ ہیرو نہیں تھے۔ انگریز اس مزاحمتی جنگ کو غدر کا نام دیتے تھے تا کہ اسے ناجائز قرار دیا جائے۔ ان کا اس جدوجہد کو دیکھنے کا انداز ہی بالکل مختلف تھا۔ ان کے نزدیک جھانسی کی رانی اور حضرت محل محض سازشی حکمران تھے جنہوں نے کمپنی کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی تھی۔

تاہم بیشتر جنگوں میں جو لوٹ کھسوٹ اور قتل وغارت گری ہوتی ہے اس کی مثال بھی ہمیں اس کتاب میں ملتی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگیں خواہ کسی بھی جواز کے تحت کی جائیں ان کی بنیاد لوٹ مار، قتل وغارت اور مالی فائدہ ہوتا ہے۔ کرومپٹن ایک انگریز رپورٹر کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتی ہیں:

مالٹوں کے باغوں کے بیچ کئی مرے ہوئے اور مرتے ہوئے سپاہی گرے

پڑے ہیں.....ایک برطانوی سپاہی جس کے گلے میں گولی لگی ہوئی ہے، زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے اور ہر سانس کے ساتھ اس کی زندگی تھوڑی اور ختم ہو جاتی ہے۔ ادھر ادھر افسران کسمپرسی کی حالت میں بھاگ رہے ہیں اور دھمکیوں اور دیگر طریقوں سے فوجیوں کو لوٹ مار سے روک رہے ہیں لیکن ان کا کوئی اثر نہیں ہو رہا.....ٹوٹے ہوئے کواڑوں اور دروازوں سے سپاہی لوٹا ہوا مال لے کر نکل رہے ہیں۔ شالیں، بیش قیمت کپڑا، سونا، چاندی اور بروکیڈ، جواہرات سے بھرے ہوئے ڈبے، اسلحہ اور عالیشان لباس، یہ سب کچھ لوٹا جا رہا ہے۔ طمع اور سونے کی حرص نے ان سپاہیوں کو بے قابو کر رکھا ہے۔ وہ لوٹ کھسوٹ کے نشے میں آپے سے باہر ہیں۔ (صفحہ 43)

اس اقتباس سے ہمیں ایسے شواہد ملتے ہیں کہ جنگ و جدل بالآخر مال غنیمت کے لیے ہوتی ہے۔ کچھ نہ کچھ چھین لینا، قبضہ کرنا اور دوسروں سے ان کی اشیا غصب کر لینے کے لیے نو آبادیاں بنائی جاتی ہیں اور انہیں فوجوں کی مدد سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔

مطالعے کے بنیادی نتائج

مندرجہ بالا درسی کتب کے تجزیئے سے چند جزوی نتائج سامنے آتے ہیں۔ یہ مطالعہ کیونکہ چند منتخب کتابوں پر مبنی ہے اس کے نتائج کو حتمی نہیں کہا جا سکتا، تاہم چند باتیں ابھر کر سامنے ضرور آتی ہیں۔ یہاں یہ دیکھا گیا ہے کہ 1857 سے ہمارے درسی مورخ کیونکر نمٹتے ہیں اور ان واقعات کو حال کی ضروریات کے مطابق کیسے ڈھالتے ہیں اور کس قسم کے قومی تصورات اور خیالات تعمیر کیے جا رہے ہیں، جو 1857 کو ایک طے شدہ ڈھانچے میں مقید کر سکیں۔

سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ سرکاری درسی کتب جو کہ وفاقی تعلیمی وزارت کی منظور شدہ کتابیں ہیں، سب سے زیادہ مذہبی تعصب کا شکار ہیں۔ ان میں تاریخی بدوجہد کو مذہبی تفریق کی رو سے دیکھا گیا ہے اور دو قومی نظریئے کے تقاضوں کے تحت سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو ایک اشتراک تھا اسے قطعی طور پر جھٹلا کر 1857

کو قیامِ پاکستان کا ایک حصہ بنا دیا گیا ہے۔

اس طرح سے ایک مشترکہ یادداشت کی تعمیر ناممکن ہو جاتی ہے اور تاریخ دو ٹکڑوں میں بٹ کر علیحدہ ہو جاتی ہے۔ سرکاری کتابوں میں یہ دو مذہبوں کی کہانی بن جاتی ہے۔ مشترکہ جدوجہد، مشترکہ تکالیف کا سامنا، مشترکہ شکست یا کامیابی کا عنصر ختم ہو جاتا ہے اور ماضی کی جڑی ہوئی یادیں حال کی علیحدہ یادوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس قسم کی اجتماعی یادداشت دو قومی نظریئے کو فروغ دیتی ہے اور قیامِ پاکستان کا جواز فراہم کرتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا یہ واقعات قیامِ پاکستان کا پہلا مرحلہ تھے۔

جہاں مسلمانوں کی تکالیف اور ان پر ڈھائے گئے مظالم کا ذکر آتا ہے وہاں سے ہندوؤں کو خارج کر دیا جاتا ہے اور دعویٰ کیا جاتا ہے کہ صرف مسلمانوں پر مظالم ہوئے۔ ہماری بقا اسی میں سمجھی جاتی ہے کہ ہم ہندوؤں کو اپنی کہانی سے خارج کر دیں۔ لیکن جہاں انگریزوں کی ناانصافی کو اجاگر کرنا مقصود ہوتا ہے وہاں یہ ضرور کہا جاتا ہے کہ اگرچہ ہندو بھی اس جنگ میں لڑے لیکن انگریزوں کی افتاد صرف مسلمانوں پر گری۔ تاریخ کی ہر کہانی کو نظریاتی ضروریات کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ کبھی ہندو ہمراہی اور دوست بن جاتے ہیں جو کہ ساتھ مل کر لڑے تو کبھی عیار و غدار، جنہوں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر مظالم ڈھائے۔ ان تضادات کو علیحدہ خانوں میں رکھ دیا جاتا ہے اور درسی مورخ ان کا سامنا عموماً نہیں کرتے۔ کبھی وہ اپنے اور کبھی غیر بن جاتے ہیں کیونکہ وہ قیامِ پاکستان کی کہانی میں اپنے نہیں پرائے مانے جاتے ہیں۔

1857 کی کہانی مردانہ صفات کی کہانی کے طور پر قلم بند کی گئی ہے۔ کیونکہ جنگوں میں اکثر دلیری، بہادری اور جرأت جیسی صفات کو سراہا جاتا ہے اور یہ صفات عموماً صرف مردوں کی میراث مانی جاتی ہے۔ عورتوں کا ذکر تاریخ کے اوراق سے غائب کر دیا جاتا ہے۔ جھانسی کی رانی، حضرت محل اور کئی دلت خواتین جنہوں نے کارنامے سرانجام دیئے، یا تو مطلق تاریخ سے باہر کر دی جاتی ہیں یا پھر ان کا ذکر صرف ایک یا دو سطروں پر مشتمل ہوتا ہے جب کہ انہوں نے جنگوں میں سپہ سالار کی حیثیت سے حصہ لیا اور فوج کی کمان کی۔ چونکہ ہمارا معاشرہ پدرانہ اقدار کا حامل ہے، عورتوں کی دلیری کے قصے شعوری یا لاشعوری طور پر فراموش کر دیئے جاتے ہیں۔

جیسے جیسے ہم اعلیٰ جماعتوں کی طرف بڑھتے ہیں تعصبات سے بھرپور مواد میں مزید اضافہ

ہوتا چلا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر چھٹی جماعت کے بچے تو پھر بھی خواتین اور ہندوؤں کے کردار کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرتے ہیں لیکن نویں اور دسویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے باقی سب کچھ مٹ جاتا ہے اور بچے صرف یہ سنتے ہیں کہ 1857 کی جنگ صرف مسلمان علماء نے لڑی۔ اعلیٰ سطح پر تاریخ کا حصہ مزید کم ہوتا چلا جاتا ہے اور پاکستان کا جغرافیہ اور شہریت جیسے مضامین نمایاں حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس چھوٹے سے، بے حد مختصر حصہ میں بھی طلبہ کو صرف سور اور گائے کی چربی والے کارتوسوں کی کہانی سنادی جاتی ہے اور 1857 کی معاشی، سیاسی اور ثقافتی وجوہات کے بارے میں کچھ بھی بتانا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یک دم ان کارتوسوں پر رنج وغم کی لہر دوڑ گئی اور بغاوت شروع ہوگئی۔ اس طرح ایک سطحی اور نامکمل تاریخ طلبہ پر ٹھونس دی جاتی ہے۔

غیر سرکاری اور نجی شعبے کی تیار کردہ درسی کتب میں مذہبی تعصب کا عنصر قدرے کم ملتا ہے۔ ان کتابوں میں بغاوت کی معاشی، سیاسی، ثقافتی اور دیگر وجوہات اور ان کے پیچیدہ نتائج کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ لیکن ان کتابوں میں بھی یادداشت کو تقسیم کر دیا گیا ہے یعنی ہندوؤں کو انگریزوں کا مددگار اور مسلمانوں کو ان کے باغی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مبارک علی کی کتاب اس ضمن میں خاص ذکر کی حقدار ہے کیونکہ یہ مذہبی، لسانی، قوم پرست اور دیگر تعصبات سے عاری ہے اور بغاوت کے معاشی، طبقاتی اور ثقافتی پہلوؤں پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالتی ہے۔ اس کتاب میں خواتین، خاص طور پر حضرت محل کا نمایاں ذکر ہے اور یہ ہندوؤں اور عورتوں کے کردار کی نفی نہیں کرتی۔

برطانوی نقطۂ نظر سے لکھی ہوئی ٹریزا کرومپٹن کی کتاب سامراجی اور نسل پرستانہ شعور کی علامت ہے۔ اس میں زبان کے استعمال سے ہی نسل پرستی کی بو آتی ہے۔ اس کتاب میں اصل لوٹنے والے یعنی انگریز اور کمپنی کو مثبت انداز میں پیش کیا گیا ہے اور جو جائز ہندوستانی باشندے تھے اور اپنے جائز حقوق کے لیے لڑ رہے تھے، انہیں باغی، دہشت گرد اور شر پسندوں کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں حقیقت کو اُلٹ دیا گیا ہے اور تاریخی حقائق کے برعکس نظریہ پیش کیا گیا ہے۔

ان تمام کتابوں میں کئی جگہ تاریخ ملتی ہے اور پھر علیحدہ ہو جاتی ہے۔ کہیں واقعات کی تشریح ایک ہی ہے اور کہیں بالکل مختلف جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کو صرف ایک ہی زاویئے سے

نہیں بلکہ بہت سے مختلف زاویوں سے پڑھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ فرق اس بات سے پڑتا ہے کہ آیا لکھنے والا سرکاری تقاضوں کے تحت لکھ رہا ہے۔ اس کا مقصد محض تاریخ کے علم کو آگے بڑھانا ہے یا پھر وہ سامراجیت کا جواز پیش کرنا چاہتا ہے۔ ریاستی غیر سرکاری، نجی اور برطانوی درسی کتابوں میں اس اعتبار سے فرق آ جاتا ہے کہ وہ کون سا نظریہ آگے بڑھانا چاہتی ہیں۔

یہاں یہ بات کہہ دینا ضروری ہے کہ طالبِ علم بالکل غیر متحرک طور پر دیئے گئے علم کو ذہن میں نہیں سما لیتے۔ طلباء سیکھنے کے علم کے دوران متحرک ہوتے ہیں اور غلط باتوں پر سوال اُٹھاتے ہیں اور ان کی تردید بھی کرتے ہیں۔ طریقہ تعلیم و تدریج کئی مرتبہ نصاب کو مسخ بھی کر دیتا ہے، چیلنج کرتا ہے اور بتائی گئی بات کو الٹ دیتا ہے۔ اگر تنقیدی طریقہ تدریس اپنایا جائے تو یہ نصابی اور درسی تعصّبات کا تدارک ہو سکتا ہے۔ طلبہ کو تحریر کے خلاف بھی پڑھایا جا سکتا ہے اور یہ بتایا جا سکتا ہے کہ ہر لکھا ہوا لفظ حرفِ قرآن نہیں ہوتا بلکہ علم کی تعمیر انسان کرتے ہیں اور اپنے تعصّبات کی روشنی میں کرتے ہیں۔ لہٰذا ایک جماعت کے اندر استاد اور طالب علم کتابوں میں دی گئی تشریح اور حقائق کو چیلنج کر کے رد بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ صرف اُس صورت میں ممکن ہے کہ کمرہ جماعت میں ایسا ماحول ہو اور تعلیم کی ایسی فضا ہو کہ طالبِ علم اور استاد خود کو اتنا قابل سمجھیں اور ان میں اتنا اعتماد ہو کہ وہ حقائق اور تشریح دونوں کو بلا خوف و خطر چیلنج کر سکیں۔ جتنی ایک درسگاہ کی فضا گھٹن والی ہوگی، آمریت پسند ہوگی اور متبادل نظریات کی حامل نہیں ہوگی اتنا ممکن ہے کہ طلبہ حاصل شدہ علم کو مسترد نہ کریں اور چپ کر کے اسے حفظ کر لیں اور امتحان میں لکھ دیں۔ لیکن اگر کسی درسگاہ میں متبادل نظریات کی جگہ ہوگی، کتابوں اور استاد کو چیلنج کرنے کا حق ہوگا اور تنقیدی نگاہ سے سوال کرنے اور بحث و مباحثہ کرنے کا حق ہوگا، اتنا ممکن ہے کہ غلط اور جھوٹی تاریخ کو مسترد کر دیا جائے اور سچ کی شکلیں باہر آئیں اور طلبہ اپنا ذاتی اور انفرادی نظریہ قائم کریں۔ تاہم مرکزی امتحانات اس کی اجازت نہیں دیتے۔ وہاں پر سوال اس طرح کئے جاتے ہیں کہ اگر طالب علم نے اچھی طرح رٹا نہیں لگایا اور درسی کتب کی تمام باتوں کو ویسے ہی نہیں لکھا جیسے وہ دی گئی ہیں، تو وہ طالب علم فیل ہو جائے گا۔ مرکزی امتحانات کا مقصد ہی یہی ہے کہ طلبہ کو مجبور کیا جائے کہ وہ سرکاری نظریئے کا رٹا لگائیں اور ان نظریات کو لکھ کر پاس ہو جائیں۔ کوئی متبادل نظریہ اس طرح گھر نہیں کر سکتا۔ چنانچہ مرکزی امتحانات کے ذریعے قومیں اور ریاستیں اپنی مرضی کے علم کو زبردستی قوم پر ٹھونس دیتی ہیں۔

اس علم کو یاد کر لینا قوم کی بقا کا ذریعہ مانا جاتا ہے۔ کوئی آزادانہ رائے رکھنا قوم کے لئے خطرہ بن سکتا ہے چنانچہ درسی کتب وہ ہتھیار بن جاتی ہیں جو قوم کی بقا اور دفاع کے لیے استعمال میں لائی جاتی ہیں۔ پاکستان میں بحث و مباحثے اور اختلافِ رائے کو برا سمجھا جاتا ہے لہذا ہر شخص وہی نظریات اپنا لیتا ہے جن میں اُسے فائدہ نظر آتا ہے۔ ٹیکسٹ بک بورڈ کی بنائی ہوئی طے شدہ کتابیں بغیر کسی تنقید کے ہر سکول میں آسانی سے پہنچ جاتی ہیں اور طالبِ علم انہیں وفاداری سے یاد کر لیتے ہیں۔ تعلیم حاوی نظریات کو عام کرنے کا سب سے سستا اور مؤثر طریقہ ہے۔

نجی سکولوں میں، جہاں امراء کے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں، متبادل نظریات سے واقفیت دلوانے کی روش قائم ہو رہی ہے۔ تاہم یہاں بھی سوال کرنے اور غلط باتوں کو رد کرنے کے مواقع قدرے کم ہیں اور صرف ایک محدود حد تک ہی بچوں کو سوال کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔

ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ کیونکہ اب بازار میں ایک سے زائد کتابیں موجود ہیں اور نجی اور غیر سرکاری شعبے بھی درسی کتب ترتیب دے رہے ہیں، طلبہ اور سکولوں کو انتخاب کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ نصاب ایک ایسی جگہ ہے جہاں مطلب، مفہوم اور معنی پر تصادم اور بحث ہو سکتی ہے۔ یہ جدوجہد کی ایک طرز ہے۔ جب دو کتابوں میں تضاد ملتا ہے یا کسی ایک ہی کتاب کے مختلف حصوں میں تضاد ہوتا ہے تو سچ کی جانب بڑھنے کا موقع وسیع ہو جاتا ہے۔ اس طرح حکمرانوں کی ترتیب دی ہوئی تاریخ کو مسترد کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ متبادل نظریات موجود ہوتے ہیں۔

بدقسمتی سے پاکستان میں 1857 کے بارے میں ڈرامے، فلمیں، دستاویزی مواد یا دیگر ثقافتی مواد بآسانی دستیاب نہیں ہے۔ نتیجتاً درسی کتابیں سچ کا واحد ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اگر ہندوستان کی طرح ہمارے ہاں بھی فلمیں اور ڈرامے بنیں تو درسی کتب سے ہٹ کر ایک اور انداز میں اس اہم تاریخی واقعے کو سمجھنے کا موقع مل سکتا ہے۔

چند غور طلب باتیں

اب وقت آ گیا ہے کہ ہم غور کریں کہ 1857 کی کہانیاں ہمیں اس مخصوص انداز میں کیوں سنائی جاتی ہیں۔ کہیں بے حد اختصار سے کام لیا جاتا ہے تو کہیں غیر ضروری تفصیل پیش کر دی جاتی ہے۔ 1857 کی کہانیوں کو کچھ اس طرح تراشا جاتا ہے کہ معلوم نہیں ہوتا کہ حقیقت

کیا تھی اور من گھڑت بات کون سی تھی۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ 1857 کی کہانیوں کو مسلمانوں اور ہندوؤں کی علیحدہ کہانیاں بنا کر کیوں پیش کیا جاتا ہے۔ مشترکہ جدوجہد کی نفی بالآخر کیوں کی جاتی ہے؟ ان سوالوں کا جواب ہمیں ہماری ریاست کی بنیادوں میں ملتا ہے اور ہماری تاریخ کے کچھ عوامل سے مربوط ہے۔ ان عوامل کو سمجھنے کے لیے ہمیں کچھ تاریخی جڑوں کو جھنجھوڑنا ہوگا تاکہ ہم جان سکیں کہ خاص طور پر ہماری ریاست ہمیں یہ کہانی اس خاص انداز میں کیوں سناتی ہے۔

پاکستان کے بنانے میں اگرچہ طبقاتی مفادات اہم تھے، لوگوں کی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے قیامِ پاکستان کو اسلام سے جوڑ دیا گیا۔ دوقومی نظریہ، جو کہ مذہبی تفریق اور امتیاز پر مبنی نظریہ ہے، پاکستان کا بانی نظریہ مانا جاتا ہے۔ دیگر قوموں کی مانند پاکستان میں بھی نصابی کتب کو حادی اور حکمران نظریات کی اشاعت اور پھیلاؤ کے لیے بروئے کار لایا جاتا ہے۔ معاشرتی علوم کا تقریباً سارا نصاب اور مطالعہ پاکستان کا نصاب دونوں اس حاوی اور غالب نظریئے کی تبلیغ کے لیے مختص کر دیئے گئے ہیں۔ جب 1971 میں مشرقی پاکستان ایک علیحدہ ملک بن گیا اور دوقومی نظریئے کی بنیاد کو ٹھیس پہنچی تو معاشرتی علوم کے مضامین میں اس نظریئے کو مزید مستحکم کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ نظریہ قوم کو محض مذہبی بنیادوں پر استوار کرتا ہے اور کسی دیگر شناخت کو نہیں مانتا۔ مثال کے طور پر لسانی یا علاقائی شناخت اس نظریئے کے دائرے میں نہیں سما سکتی۔ چنانچہ دوسری پہچان کی تردید کر دی جاتی ہے اور لوگوں کی زبان یا لسانی بنیادوں پر یک جہتی کو جھٹلا دیا جاتا ہے۔ 1857 کے واقعات کو دوقومی نظریئے کی ساخت میں مقید کرنا مشکل ہے۔ ہر قسم کی مشترکہ جدوجہد، ہم آہنگی، یک جہتی اور ملاوٹ دوقومی نظریئے کی نفی کرتی ہے۔ لہٰذا 1857 درسی کتب لکھنے والوں کے لیے ایک المیہ بن جاتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جدوجہد اور باہمی تعاون کو بالآخر کیسے قبول کیا جائے؟ اگر اس حقیقت کا اعتراف کر لیا جائے کہ یہ دونوں کبھی خود کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں مانتے تھے، تو پھر پاکستانی قومیت کی تشکیل کیونکر ہوگئی؟ یہ وہ معمہ ہے جس کا حل درسی کتب لکھنے والے صرف 1857 کو فراموش کر کے کر سکتے ہیں یا پھر ان واقعات کو قطعی طور پر تبدیل کر کے ان کی ناقابلِ قبول سچائیوں سے نظر چرا سکتے ہیں۔ اگر دوقومی نظریہ کمزور ہو گیا تو نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرق مٹ جائے گا جو کہ قوم کی بقا کے لیے ناگریز ہے بلکہ پاکستان کے اندر بسنے والی دیگر قومیں بھی ایک علیحدہ شناخت کا دعویٰ کر سکیں گی۔ یہ خوف تعلیم

دانوں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ دوقومی نظریئے کی سچائی کے دعوے متواتر کرتے رہیں خواہ اس عمل کے دوران تاریخ کو مسخ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ پاکستان میں رہنے والی قومیں یہاں اسلام کی آمد سے بہت پہلے سے آباد ہیں اور مذہبی شناخت انہوں نے بعد میں حاصل کی تھی۔

جب خالصتاً مذہبی شناخت کو دیگر طرز کی پہچان پر ترجیح دے دی جاتی ہے تو قدیم قوموں میں ایک خوف پیدا ہوتا ہے کہ اُن کی لسانی، علاقائی یا زبان پر مبنی قومیت کمزور پڑ جائے گی اور ان کی شناخت مٹ جائے گی۔ لہذا ان دیگر پہچانوں پر مبنی تحریکیں چلنے لگتی ہیں جیسا کہ مشرقی پاکستان میں ہوا اور سندھ اور بلوچستان میں بھی اس کے عناصر نظر آتے ہیں۔ تاہم حکمران طبقے اور حکمران لسانی قومیں انہیں دبانے کی غرض سے مذہب کا سہارا لیتی ہیں اور مذہب کو دیگر قسم کی شناخت پر فوقیت دیتی ہیں۔ ایک طبقاتی کشمکش اس طرح لسانی یا قومی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ اسی طرح کسانوں اور محنت کش طبقات کی تحریکوں کو کمزور کرنے کے لیے بھی مذہب بطور ہتھیار استعمال میں لایا جاتا ہے۔

دوقومی نظریئے کا تقاضا ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ ہندو اور مسلمان دونوں ہمیشہ سے دشمن تھے۔ یہ ازلی ابدی دشمن ہیں اور ان دونوں میں نہ تو کبھی کوئی بھائی چارے یا دوستی کے جذبات رہے اور نہ رہیں گے اور مستقبل میں بھی ان دونوں کے قریب آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ 1857 کے واقعات اس نظریئے کی نفی کرتے ہیں اور ان خیالات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں۔ 1857 تو کہانی ہے اشتراک کی، مل کر سامراجی قوتوں کا مقابلہ کرنے کی، دوستی اور بھائی چارے کی۔ تو یہ کہانی کیونکر ہمارے شعور میں داخل ہونے دی جا سکتی ہے۔ اسے جھٹلانا ضروری ہے تاکہ تاریخ پاک صاف رہے۔ اس میں غیروں اور دشمنوں کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ قومی یادداشت کی تعمیر میں یا تو اسے بھولنا ہوگا یا پھر اس قدر بدلنا ہوگا کہ یہ محض ایک دیومالائی قصہ بن کر رہ جائے اور اس کا تاریخ سے کوئی رشتہ نہ رہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی کہانیوں اور یادداشت کو کچھ یوں علیحدہ کرنا ہوگا کہ یہ کبھی پھر نہ مل پائیں۔

اجتماعی من گھڑت کہانیاں سنانے کی ضرورت ایک طرف تو ریاست کی نظریاتی بنیادوں سے پیدا ہوتی ہے، دوسری طرف اس قسم کی کہانیاں گھڑنے کی ضرورت ریاست کے ڈھانچوں میں پائی جاتی ہے۔ پاکستان ایک ایسا خطہ ہے جہاں پر بہت سی مختلف قومیں اور مختلف تہذیبی و ثقافتی گروہ بستے ہیں۔ یہاں پر مختلف زبانیں بولنے والے، مختلف مذاہب کے پیرو، مختلف طور طریقوں

اور روایات کے ماننے والے رہتے ہیں۔ چنانچہ ایسی صورت حال میں ضروری ہوتا ہے کہ ریاست نہ صرف جمہوری ہوتا کہ ہر قسم کے لوگوں کی نمائندگی ممکن ہو، بلکہ ریاست کا ڈھانچہ وفاقی طرز کا ہو تا کہ مختلف لوگوں کی تاریخی میراث کو تحفظ حاصل ہو سکے۔ اگر ملک میں مرکزیت کا رجحان بہت زیادہ ہو تو وفاق کو چھوٹے صوبوں اور مختلف تہذیبی گروہوں سے مزاحمت کا سامنا رہتا ہے۔ لوگ اپنی لسانی، زبانی یا علاقائی شناخت کو مٹنے سے بچانے کے لیے اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں۔ مختلف گروہوں اور ثقافتوں کو اکٹھا رکھنے کے لیے اگر بہت زیادہ طاقت کا استعمال کیا جائے تو علیحدگی پسند قوتیں مستعد ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ نظریات کی تعمیر اور تبلیغ کو بروئے کار لایا جاتا ہے تا کہ طاقت کے استعمال کے بغیر ہی لوگوں کو ''قوم'' کے تصور سے جوڑا جا سکے اور وہ اپنے حقوق کے مطالبات کو غداری سمجھنے لگیں۔ تعلیم کے ادارے کیونکہ دور دراز کے علاقوں تک پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، ان کے ذریعے نظریات کی اشاعت اور پھیلاؤ قدرے آسان ہو جاتا ہے۔ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں سکول ٹیچر اور درسی کتب اس بات کو آسان اور سستا بنا دیتے ہیں کہ حکمران اپنے خیالات کو دور دور تک پہنچا سکیں، اور مرکزی امتحانوں کے ذریعے یہ بات اور بھی آسان ہو جاتی ہے۔ کیونکہ کوئی ایسا بچہ جو درسی کتب سے ہٹ کر کچھ لکھ بیٹھے، فیل ہو جائے گا اور کوئی بھی سند حاصل کرنے سے قاصر رہے گا۔ نجی تعلیم بے حد مہنگی ہونے کے باعث بیشتر والدین اپنے بچوں کو سرکاری سکولوں میں تعلیم دیتے ہیں جہاں ایک ہی نظریہ ان کے گوش گزار کیا جاتا ہے تا کہ وہ کوئی دوسرا طریقہ سوچ، نہ اپنا سکیں۔ پاکستان میں مرکزیت کے رجحانات بے حد مضبوط ہیں اور تمام ایسے امور جن پر صرف صوبوں کی حکمرانی ہونی چاہیے، وفاق کے زمرے میں ڈال دیئے گئے ہیں۔ خصوصاً تعلیم جو کہ صوبوں کی خود مختاری کی علامت میں وفاقی وزارتِ تعلیم کے ماتحت ہے۔ اس مرکزیت کے نتیجے میں چھوٹے صوبے خود کو محروم محسوس کرتے ہیں اور ان میں لسانی اور علاقائی قومی جذبات مستحکم ہوتے رہتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً یہ صوبے اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر پانی، گیس اور خزانے میں یہ اپنا جائز حصہ طلب کرتے ہیں۔

1857: مزاحمت کی علامت

1857 کے واقعات ہمارے خطے میں سامراجی قوتوں کے خلاف مزاحمت کی ایک بہت

بڑی علامت بھی ہیں۔ جیسے انیسویں صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے مقامی وسائل کولوٹا، وہاں کے باشندوں کو غلام بنایا، وہاں کے لوگوں اور کسانوں کا استحصال کیا اور اُن پر مظالم ڈھائے اور ہندوستان سے خام مال حاصل کر کے برطانیہ کی فیکٹریوں میں منافع کمایا، اسی طرح آج بھی غیر ملکی ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے امیر ممالک کی مدد سے دنیا کے کئی خطوں پر قبضہ جمارہی ہیں۔ آج بھی فوج کے استعمال سے دوسرے ممالک پر قبضہ کیا جارہا ہے، وہاں کے عوام کو غلام بنایا جارہا ہے، اوران کے تیل اور گیس کے وسائل پر تیل کی امریکی اور یورپی کمپنیوں کا تسلط جمایا جارہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے کچھ نہیں بدلا۔ وہی سامراجیت وہی استحصال، وہی وسائل پر قبضہ اور وہی غلامی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انیسویں صدی میں برطانیہ، فرانس پرتگال اور ہسپانیہ اس کام میں پیش پیش تھے، آج امریکہ اوراس کے اتحادی بہت سی ایسٹ انڈیا کمپنیاں لے کر ہمارے خطے میں تاجر بن کر نمودار ہورہے ہیں اور سیاسی اور عسکری قبضہ کررہے ہیں۔ انیسویں صدی کی ہی طرح آج بھی ہمارے حکمرانوں کی صورت میں ان کو وفادار ملازم مل گئے ہیں جو اپنے لوگوں سے غداری کر کے قومی اثاثے ان کمپنیوں کو کوڑیوں کے بھاؤ بیچ دیتے ہیں۔ سامراجیت کے نظریات میں صرف اتنی تبدیلی آئی ہے کہ انیسویں صدی میں غاصبوں کا دعوی تھا کہ وہ وحشی اور قدامت پرست معاشروں کو مہذب بنانے کی غرض سے آئے ہیں۔ بیسویں صدی میں ان عالمی قوتوں کا دعوی تھا کہ وہ دنیا میں جمہوریت اور آزادی پھیلانے کی غرض سے سامراجی عمل میں ملوث ہیں اور اب اکیسویں صدی میں ان طاقتوں کا دعویٰ ہے کہ وہ ہمارے ممالک پر اس لیے قبضہ کررہے ہیں تاکہ جمہوریت کو فروغ دیا جاسکے اور انسانی حقوق اور اعتدال پسندی کی روایات قائم کی جائیں۔ اصل مقاصد کو چھپانے کے لیے سامراجی قوتوں نے ہر دور میں کوئی نیا بہانہ گھڑا ہے اور نئے بہانے کی آڑ میں لوٹ کھسوٹ کی ہے۔ تاریخ جتنا بدلتی ہے اس میں اتنا ہی تسلسل بھی رہتا ہے۔

آج کل سامراجی قوتوں کا من پسند لفظ ہے دہشت گردی اور ان کا دعوی ہے کہ وہ دہشت گردی کا خاتمہ کرنے کے لیے دنیا میں جنگ وجدل کررہے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ جو ممالک سب سے زیادہ دہشت گرد ہیں مثلاً امریکہ، برطانیہ، ہسپانیہ، آسٹریلیا اور اسرائیل، وہی دہشت گردی ختم کرنے کے نام پر ہمارے وسائل پر قبضہ کررہے ہیں۔ جن لوگوں نے 15 لاکھ سے زائد عراقی باشندے بے دردی سے قتل کردیئے اور لاکھوں کو افغانستان میں قتل کیا اور حماس کی منتخب

حکومت کو مسترد کر دیا، آج جمہوریت اور انسانی حقوق اور اعتدال پسندی کا جھنڈا لے کر دہشت گردی ختم کرنے نکل پڑے ہیں۔ وہ تاریخ کی یہ اہم بات فراموش کر چکے ہیں کہ 1980 کی دہائی میں انہوں نے یہی طالبان بنانے کے لیے سرمایہ دیا اور انہوں نے پوری دنیا میں یہی دہشت گرد بنائے اور ان کا دشمن کے خلاف استعمال کیا۔ آج نہ تو دہشت گرد اعتدال پسند ہیں اور نہ ان کو ختم کرنے والے نام نہاد روشن خیال حکمران اعتدال پسند ہیں۔ آج دونوں ہی دہشت گرد ہیں اور مذہبی دہشت گردی اور غیر مذہبی دہشت گردی کے اس خونی مقابلے میں عام لوگ آئے دن خود کش حملوں میں مارے جا رہے ہیں اور بے گناہ افراد دونوں گروہوں کی دہشت گردی کے درمیان پھنس کر رہ گئے ہیں۔ پاکستان کے حکمرانوں نے تو تمام ایسی قوتوں کو بے بس کر دیا ہے جو اعتدال پسند، روشن خیال، ترقی پسند اور دہشت گردوں کے خلاف تھیں۔ جج، وکلاء، انسانی حقوق کے علمبردار، صحافی، دانشور اور عام لوگ یا تو جیلوں میں ہیں، یا پھر سڑکوں پر دہشت گردوں کے ڈنڈے کھا رہے ہیں۔

اس صورت حال میں 1857 کی تاریخ پڑھنا بے حد ضروری ہو گیا ہے۔ تب کسان اور عام سپاہی ایک کمپنی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ آج بہت سی کمپنیاں ہیں۔ اس وقت بھی مقامی نواب اور راجے انگریزوں کے ساتھ مل گئے تھے، آج بھی ہمارے حکمران غیر ملکی کمپنیوں کے غلام ہیں۔ تب بھی کمپنی کے پاس بہت طاقت تھی اور ہندوستانی سپاہیوں کے پاس تھوڑا سا اسلحہ تھا، آج بھی ریاست بے پناہ طاقتور ہے اور لوگوں کے پاس صرف قلم ہے یا آواز ہے۔ لیکن اگر 1857 میں لوگ نڈر ہو کر کمپنی کی حکومت سے ٹکرا گئے اور قربانیاں دیں، تو آج بھی ایک غیر آئینی اور غیر قانونی حکومت کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ ججوں، وکیلوں اور انسانی حقوق کے علمبرداروں اور جمہوریت پسندوں نے قربانیاں دی ہیں اور آج بھی دے رہے ہیں۔ کیونکہ اب ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں رہا۔ ہمیں یا تو سامراجی تسلط قبول کرنا ہوگا، یا پھر اپنے قلم، اپنے علم و ہنر اور اپنی آواز کے ذریعے دونوں طرح کے دہشت گردوں سے جان چھڑانے کے لیے جدوجہد کرنا ہوگی۔ 1857 ہمارے لیے ایک مشعل راہ بھی ہے، ایک علامت بھی ہے، ایک راستہ بھی ہے اور ماضی کی ایک یادداشت بھی ہے۔

Footnotes:

1) Mubarak Ali. 'Development of the Discipline of History of Pakistan'. In Inayatullah, Rubina Saigol & Pervez Tahir (eds) *Social Sciences in Pakistan: A Profile.* 2005. Islamabad: Council of Social Sceinces. Pp. 237-254.

2) *Report of the Commission on National Education,* 1959. Government of Pakistan. Institute of Educational Research. University of the Punjab.

Books used for the Study:

Rubina Saigol, 1995. *Knowledge and Identity: Articulation of Gender in Educatonal Discourse in Pakistan.* Lahore: ASR.

Rubina Saigol. 'The Boundaries of Consciousness: Interface Between the Curriculum, Gender and Nationalism'. In Khan. N.S, Saigol, R. & Afiya S. Zia. (eds). *Locating the Self: Reflections on Women and Multiple Identities.* 1994. Lahore: ASR.

The two nation theory has been the underlying principle of history writing more urgently since the Fall of Dhaka in 1971 which punctured the two nation idea at its core. The need to reassert it became imperative for the reinforcement of a denuded State ideology. In 1975, a Teacher's Guide for social studies for Class 4 has the following instructions: 'Teach the children the history of the Punjab in such a way that the following facts become absolutely clear: 1) the complete difference between the way of life, customs and traditions, beliefs and culture of the Hindus and Muslims, 2) Give special emphasis to those aspects which forced the Muslims to create a separate country for themselves; here especially emphasise the economic, educational and soc al exploitation of the Muslims at the hands of the Hindus; the favourable and friendly attitude of the British towards Hindus as compared to Muslims; the unequal and discriminatory attitude of the Hindus towards the Muslims'. P. 11.

Kumar, Krishna. 2001. *Prejudice and Pride: School Histories of the Freedom Struggle in India and Pakistan:* New Delhi: Viking. In this book Kumar argues that the past is reconstructed based on the imperatives of the present.

1 Saigol, Rubina. *'Enemies Within and Enemies Without: The Besieged Self in Pakistani Textbooks'.* In Futures: *Journal of Policy, Planning and Futures.* Vol. 37, No. 9. November 2005. pp. 1005-1035. In this paper I have attempted to explain how the truth about Bangladesh is silenced by splurging on an alternative story that fits in wich State nationalism.

Textbooks Used:

Social Studies - Class 6. Punjab Textbook Board, Lahore. January 2004. Edition 1. Darsi Kutab Khana, Lahore.

Social Studies - Class 8, Punjab Textbook Board, Lahore. Revised by National Review Committee, Federal Ministry of Education, Govt of Pakistan. Code No. XLV/AL, 2nd Edition. p.71.

Muashrati Uloom (Social Studies), Class 8, No. XLV/AL, First Edition, Impression 31. Punjab Textbook Board, Lahore. Approved by Federal Ministry of Education, Islamabad. pp. 90-91.

Pakistan Studies - 9-10 , Punjab Textbook Board, Lahore. Code No. XLV/AL, Edition 2, Approved by Ministry of Education, Curriculum Wing, Islamabad, 2002.

A Concise History of Indo-Pakistan. S.F. Mahmud. 1998 (6th Impression). Karachi: Oxford University Press.

Pakistan Studies (History and Culture) for GCE O'Level and Higher Examinations. (Revised and Updated). Maqbool Rehmat, Saint Anthony's College, Lahore. Maqbool Sons.

Mubarak Ali, Bitish India, 2007. Lahore: Fiction House.

Teresa Crompton. *History in Focus 3.* 2004 UK: Peak Publishing.

ایک تہذیب کی موت

ڈاکٹر مبارک علی

1639ء میں جب مغل شہنشاہ شاہجہاں نے ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی تو اس وقت مغل سلطنت اپنے عروج پر تھی۔ اس کی شان وشوکت کی جھلکیاں اس کی عمارتوں سے ظاہر ہورہی تھیں، یہ عمارتیں اب اکبر کے دور کی سی مضبوط اور طاقت ور نہیں رہی تھیں، اب ان میں نفاست، خوبصورتی اور نزاکت آ گئی تھی۔ شاہ جہاں ایک ایسا شہر بسانا چاہتا تھا جو مغل سلطنت کی طاقت و قوت اور خوبصورتی کا سنگم ہو، ایک مثالی شہر کہ جس کی عمارتیں ایک بڑھتی اور پھیلتی تہذیب کو فروغ دے سکیں اور اسے اپنے اندر سمو سکیں۔

شاہی رہائش گاہ لال قلعہ تھی، جسے سرکاری دستاویزات میں ''قلعہ مبارک'' لکھا گیا۔ یہ ایک ایسی عمارت تھی کہ جس کا تعلق خاص و عام دونوں سے تھا۔ اس میں دربار عام، جھروکہ درشن اور نقار خانے کے ساتھ ساتھ دربار خاص، بارہ دریاں، باغات، برج، موتی مسجد اور حرم سرائے تھ۔ قلعہ شاہی دبدبہ، رعب اور اقتدار کی علامت تھا۔ ان فصیلوں کے اندر جو سرگرمیاں تھیں، لوگ دور سے ان کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتے تھے۔ جب خبریں نہیں ملتی تھیں تو بازاروں میں افواہیں گردش کرنے لگتی تھیں۔

قلعہ کے باہر جامع مسجد تھی، مذہب وعقیدت کی علامت۔ بعد میں شاہی بیگمات اور امراء نے مزید مساجد تعمیر کرائیں تا کہ ان کی مذہبی عقیدت کا اظہار ہو۔ ان میں فتح پوری مسجد، اکبر آبادی مسجد، اورنگ آبادی مسجد اور سنہری مسجد شامل تھیں۔ ان کے علاوہ محلوں اور بازاروں میں مساجد کی تعمیرات ہوئی تھیں۔

شہر کی رونق بازاروں سے ہوتی ہے کہ جہاں خرید وفروخت کے لئے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ یہاں لوگ سیر وتفریح کے لئے بھی آتے ہیں لہذا شاہجہاں آباد کے فیض بازار، اردو بازار، خانم بازار، خاص بازار کے علاوہ ہر اہل حرفہ و پیشہ کے بازار تھے۔ مگر ان سب میں مشہور چاندنی چوک تھا کہ جس کے بارے میں وہ سب رطب اللسان ہیں کہ جنہوں نے اسے دیکھا تھا۔ اس میں بہتے واں نہر بہشت، اس کے دونوں جانب درختوں کی قطاریں، سرسید نے اس کے بارے میں لکھا ہے

کہ: ''خوبی اور خوشنمائی اس کی بیان سے باہر ہے۔ آدمی کی طاقت نہیں کہ بیان کر سکے۔ تیسرے پہر کو اس چوک میں عالم طلسمات ہوتا ہے۔ اکثر جوانان جواں دار اور امراء اور شاہزادے سیر و تماشے کو آتے ہیں اور سیر کرتے پھرتے ہیں۔''(1)

وقت کے ساتھ ساتھ اس کے گلی کوچے، محلے اور کٹرے اپنی خصوصیات کی وجہ سے مشہور ہوتے چلے گئے۔ اہل حرفہ وصنعت نے شہر کو دور دور تک مشہور کیا۔ علماء، شعرا، مصور، خوش نویس، موسیقار اور رقاصوں نے شہر میں دلکش اور جاندار کلچر کو فروغ دیا۔

اگرچہ شاہجہاں آباد، جو عام لوگوں کے لئے دلّی رہا، نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں میں برباد ہوا، مگر اس نے جلد ہی دوبارہ سے اپنی زندگی کو بحال کرلیا۔ جب 1803 میں یہاں انگریز آئے اور شہر پر قابض ہوئے تو اس کے بعد سے بادشاہت سمٹ کر لال قلعہ میں محدود ہوگئی اور اقتدار کمپنی بہادر کے پاس آ گیا۔ اس صورت حال نے لوگوں کی نظر میں بادشاہ اور قلعہ کے بارے میں تصورات بدل دیئے۔

مغل بادشاہ کے پاس اب نہ تو سیاسی طاقت تھی اور نہ اقتدار، لہذا قلعہ بھی سیاست واقتدار کی علامت نہیں رہا۔ اس کی بجائے اب قلعہ معلّیٰ، مغل تہذیب اور کلچر کی علامت بن گیا۔ دلّی والوں کے لئے قلعہ ماضی کے ورثہ کو سنبھالے ہوئے، اسے زندہ رکھے ہوئے تھا۔ یہ عہد مغلیہ کا کلچر تھا جس کی تشکیل میں ہندوستان کے سب ہی لوگوں نے حصہ لیا تھا۔ سیاست واقتدار کی شان و شوکت اور ہیبت تو جاتی رہی تھی، مگر جاتی ہوئی تہذیب کی نفاست اور رنگینی ابھی باقی تھی۔ سیاست واقتدار کے کھونے کے بعد تہذیب وکلچر نے اس خلا کو پُر کر رکھا تھا۔

آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر، اپنی محدود آمدنی کے باوجود کہ جو اسے ایسٹ انڈیا کمپنی سے بطور وظیفہ ملتی تھی اور جسے مغل دستاویزات میں خراج کہا جاتا تھا، قلعہ معلّیٰ کی ساکھ کو سنبھالے ہوئے تھا۔ دربار میں اب تک اکبر کے عہد سے قائم شدہ ادب، آداب کا خیال رکھا جاتا تھا۔ بادشاہ اپنے معمولات کو پابندی سے ادا کرتا تھا۔ قلعہ معلّیٰ میں بادشاہ کی حیثیت ایک بڑے خاندان کے سربراہ کی تھی۔ یہاں شہزادے اور شہزادیوں کی ایک بڑی تعداد آباد تھی۔ ایک تخمینہ کے مطابق یہ تقریباً تین ہزار ہوں گے۔ ان کا خرچہ بادشاہ کے ذمہ تھا جو انہیں پابندی سے نہیں ملا کرتا تھا۔ اس لئے ان کی بڑی تعداد غربت ومفلسی اور تنگ دستی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔ ان لوگوں کو قلعہ

سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی اس لئے ان کا زیادہ وقت بیکاری اور فضول مشاغل میں صرف ہوتا تھا۔(2)

دلّی والوں کے لئے قلعہ معلّٰی کلچرل سرگرمیوں کا مرکز تھا''بزم آخر'' کے مصنف نے اس دور کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے قلعہ کے کلچر کا اندازہ ہوتا ہے۔ بادشاہ کا جلوس، جشن، رت جگا اور تقریبات کہ جن میں نوروز، محرم، آخری چہار شنبہ، رجب، شب برات، عیدین، دسہرہ، دیوالی اور ہولی، لیکن ان سب میں مشہور تھا''پھولوں والوں کی سیر''۔ ظہیر دہلوی نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ:''ایسا میلہ میری نظر سے نہیں گذرا۔''(3)

قلعہ معلّٰی میں بولی جانے والی اردو اب معیاری بن گئی تھی۔ خاص طور سے خواتین کی بول چال، محاورے اور کہاوتیں بطور سند استعمال ہوتی تھیں۔ یہاں ہونے والے مشاعروں میں غالب، مومن، فراق، آزردہ اور وحشت مشہور تھے۔ داغ کی شاعرانہ تربیت میں بھی قلعہ معلّٰی کا ہاتھ تھا۔

قلعہ معلّٰی سے باہر شہر میں اشرافیہ کا کلچر تھا۔ شعروشاعری، موسیقی، مصوری، خطاطی، رقص و سرور کے ساتھ ساتھ سیر وتفریح اور دوست احباب کی محفلیں تھیں۔ اشرافیہ کے نوجوانوں کی روزمرہ کی زندگی کے معمولات کیا تھے اس کا ذکر ظہیر دہلوی نے اس طرح کیا ہے:

> نو بجے صبح کے بعد دوست احباب فراہم ہوتے تھے اور اکثر طالب علم بھی ہمارے پاس آتے ہی تھے۔ دو گھنٹے کامل درس وتدریس کا شغل رہتا۔ اس اثنا میں شعرا شعار کا بھی تذکرہ ہو جاتا تھا۔ دادین فارسی اور تذکرہ جات کی اشعار خوانی رہتی تھی۔ گھنٹہ دو گھنٹہ استراحت کر کے بیدار ہوتا تھا۔ پھر احباب محلّہ آ بیٹھتے تھے۔ گنجفہ، چوسر کا شغل رہتا تھا۔ پانچ بجے دن کے، گھوڑے پر سوار ہو کر، بازار کی سیر کو چلا جاتا تھا۔ بعد مغرب مکان پر آتا تھا۔ پھر احباب کا مجمع رہتا تھا ہر طرح دل لگی رہتی تھی۔ ایک دو ستار نواز آ جاتے تھے۔ ستار، طبلہ وغیرہ سے دل کو فرحت ہوتی تھی..... کوئی بدوضع، بدپیشہ، بدمعاش ہماری صحبت میں باریاب نہ ہوتا تھا۔(4)

اب اس تہذیب کو کچھ بھی کہو، زوال شدہ، پس ماندہ، جاگیردارانہ یا طبقاتی مگر یہ ایک

تہذیب تھی۔ اگر چہ اس نے سماج کو ایک جگہ ٹھہرا رکھا تھا مگر اس میں شائستگی، نفاست، سلیقہ، ادب آداب، رواداری، لحاظ اور مروت تھی۔ یہ وہ تہذیب تھی کہ جس کی تکمیل میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا اشتراک تھا۔ یہ گنگا جمنی تہذیب تھی، اسی تہذیب کے رشتہ میں دلّی والے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ دلّی کی اشرافیہ اپنے حالات سے مطمئن تھی۔ ان کا گذارہ وظیفوں اور جاگیر کی آمدنی سے خوب ہو جاتا تھا۔ جب دلّی پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو انہیں ان کا آنا ناگوار نہیں ہوا۔ انہوں نے نئی صورت حال کو خوشی سے تسلیم کر لیا۔ ان میں سے کئی لوگ کمپنی بہادر کی ملازمت میں بھی چلے گئے۔ آنے والے انگریز بھی دلّی اور ہندوستان کے کلچر سے متاثر ہوئے اور انہوں نے اسے اپناتے ہوئے یہیں شادیاں کیں، حرم رکھے، حقہ پینا شروع کر دیا، موسیقی و رقص سے لطف اندوز ہوئے، فارسی اور اردو میں شاعری بھی شروع کر دی۔ شاید ایک اور نئے کلچر کی ابتداء تھی۔

جب مئی 1857 میں میرٹھ سے باغی دلی آئے تو اشرافیہ کو ان کی آمد ناگوار گذری کیونکہ انہوں نے ان کی روزمرہ کی زندگی کے معمولات میں دخل اندازی کی تھی۔ ان مہذب لوگوں کے لئے باغی گنوار، اجڈ اور غیر مہذب تھے۔ یہ مغل تہذیب اور اس کی صدیوں کی روایات سے واقف نہیں تھے۔ انہوں نے قلعہ معلّٰی کی روایات کو پامال کر کے رکھ دیا۔ انہوں نے قلعہ کے باغات میں درختوں سے گھوڑے باندھنا شروع کر دیئے، یہ نہ لال پردے سے گذرے ہوئے اپنے ہتھیار رکھتے تھے اور نہ ہی ادب آداب و تسلیمات کا خیال رکھتے تھے۔ اور تو اور یہ بادشاہ کی تکریم و تعظیم کے بجائے اسے اکثر ''اوبڈھے'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ چند ہی دنوں میں انہوں نے مغل روایات اور ورثہ کا خاتمہ کر دیا کہ جس کی حفاظت قلعہ معلّٰی اور اس کے باسی کر رہے تھے۔ ان میں اکثریت پوربیہ فوجیوں کی تھی، جو گنگا و جمنا میں دھلی صاف ستھری اور نازک اردو کے بجائے دیہاتی لہجہ میں بات چیت کرتے تھے، جو درباریوں اور اہل اشرافیہ کے کانوں پر گراں گذرتی تھی۔ دلّی میں باغیوں کی آمد نے قلعہ معلّٰی اور دلّی کی تہذیب پر حملہ کیا، یہ ایک بڑا المیہ تھا۔ یہ بھی ایک بغاوت تھی، اس تہذیب کے خلاف جسے صدیوں سے اشرافیہ نے پروان چڑھایا تھا۔

جب انگریزوں نے دلّی کو فتح کیا تو ایک طرف تو لوٹ مار کا سلسلہ شروع ہوا، قتل و غارت گری اور پھانسیوں نے شہر کی فضا کو سوگوار کر دیا۔ اس پر بس نہیں ہوا، شہر خالی کرا لیا گیا۔ اس کے بعد اس کی عمارتوں کو مسمار کیا گیا تا کہ ان سے لوگوں کے لگاؤ اور تعلق کو ختم کیا جائے۔ قلعہ معلّٰی کو فوجی ہیڈ

کوارٹر بنا کر اس کی سماجی اور کلچرل حیثیت کو ختم کر دیا گیا۔ جامع مسجد میں فوجی کیمپ بن گیا۔ دلّی کی مسجدیں ویران ہوئیں، بازار اجڑ گئے، باغات بے آب و گیاہ ہو گئے۔ ظہیر دہلوی لکھتے ہیں کہ:

''کابلی دروازے سے لے کر قلعہ تک اور دریبہ سے لے کر قلعہ تک اور جامع مسجد سے لے کر دہلی دروازے تک، بلاقی بیگم کا کوچہ، خانم کا بازار، خاص بازار، خاں دوراں خاں کی حویلی سے دریا گنج تک ہزار ہا مکانات منہدم اور مسمار کر دیئے گئے۔ دلّی کا چبوترا بنا دیا گیا۔'' (5)

غدر یا بغاوت کا خاتمہ ہو گیا۔ جو اس سے گذرے ان کے دلوں پر گہرے زخم تھے۔ یہ زخم وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ چھپے رہے، اندر ہی اندر رستے رہے۔ انہیں ڈھک کر رکھا گیا تا کہ ان کو دیکھا نہ جا سکے اور نہ ان کی تکلیف کو محسوس کیا جا سکے۔ کون تھا جو عہد برطانیہ میں اس المیہ کی تاریخ لکھتا؟ 1857 کا المیہ تو صرف انگریزوں کا تھا جو اس ہنگامہ میں مارے گئے تھے۔ ہندوستان کے لوگوں نے اپنے زخموں اور غم واندوہ کو خاموشی سے چھپائے رکھا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ حالؔی، داغ، آزردہ، اور میر مہدی مجروحؔ نے دلی کا مرثیہ لکھا۔ غالبؔ نے اپنے خطوط میں لوگوں کو اپنے رنج وغم اور اداسی سے آگاہ کیا مگر اس بغاوت میں ہندوستانیوں پر کیا بیتی، تاریخ کو اس پر خاموش کر دیا گیا۔

خواجہ حسن نظامی 1878 کو پیدا ہوئے۔ بغاوت کو گذرے بائیس سال ہو چکے تھے۔ اس عرصہ میں دلّی دوبارہ سے آباد ہو گئی تھی مگر اب یہ مغلوں کا شاہجہاں آباد نہیں تھا۔ اس کی کوکھ سے جنم لینے والی ایک اور دلّی تھی۔ 1857 کی خوں ریزی سے گزرنے والے کچھ لوگ ابھی زندہ تھے۔ ایک انقلاب تھا جو گذر گیا۔ دلّی کی اشرافیہ اور اس کا کلچر یادوں میں باقی رہ گیا تھا۔ خواجہ حسن نظامی نے ہوش سنبھالنے کے بعد یقیناً بزرگوں سے اس حادثہ کے بارے میں بہت کچھ سنا ہوگا۔ آگے چل کر انہوں نے اور معلومات اکٹھی کیں اور جب ''غدر'' پر لکھنا شروع کیا تو دوبارہ سے اس کی یاد ذہنوں میں تازہ کر دی۔ انہوں نے تاریخ اور افسانہ کی آمیزش سے 1857 کے المیہ کی جو تصویر کشی کی، اس نے واقعہ کو ایک نیا رنگ دیا۔ ان کی ان تحریروں میں جاتی ہوئی تہذیب کی کہانی بھی ہے اور ختم ہوتے ہوئے شاہی خاندان کا المیہ بھی ہے۔

تاریخ میں یہ ہوتا رہا ہے۔ کسی بڑے فساد، بغاوت یا خانہ جنگی کے بعد نہ صرف سماجی و سیاسی روایات ٹوٹتی ہیں، امن وامان تباہ ہوتا ہے، نظم وضبط ختم ہو جاتا ہے بلکہ عزت وآبرو، خاندانی حسب

ونسب یہ سب پامال ہو جاتے ہیں۔ جب ہنگامہ ہوتا ہے تو امیر وغریب کا فرق مٹ جاتا ہے۔ تہذیب وشائستگی کی تمام علامات ختم ہو جاتی ہیں۔ ایسے میں ایک ہی خواہش رہ جاتی ہے کہ زندگی کو کیسے بچایا جائے۔ فسادات میں ان لوگوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے کہ جو حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بے رحمی کا مظاہرہ کرتے ہیں، انسانیت کے جذبات سے دور ہو جاتے ہیں اور وہ بھی ہوتے ہیں کہ جو جان پر کھیل کر مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی نے غدر پر جو کہانیاں لکھیں، ان میں یہ سارے ڈرامے موجود ہیں۔ ان کے اکثر مرکزی کردار مغل شاہی خاندان کے شہزادے اور شہزادیاں ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جو قلعہ معلّٰی اور مغل تہذیب کے وارث تھے۔ نازوں میں پلے ہوئے، ادب آداب کے کلچر میں رچے ہوئے، جب امارت سے غربت میں آتے ہیں، عروج سے زوال کو دیکھتے ہیں، تو اس سے ایک المیہ کی تشکیل ہوتی ہے۔

جب احکامات دینے والے، حکم بجالانے والے بن جائیں۔ جن کی خدمت پر نوکر وخادم اور لونڈیاں تھیں، اب وہ خود خدمت کرنے والے ہو جائیں۔ جو دولت وشان وشوکت کے عادی تھے، وہ مفلسی اور غربت سے دوچار ہوں تو یہ کہانیاں پڑھ کر اور سن کر دل افسردہ ہو جاتا ہے۔ زوال کسی بھی تہذیب کا ہو، اس کا بیان دلوں کو غم آلود ضرور کرتا ہے۔ ''بیگمات کے آنسو'' میں انہوں نے ان مغل شہزادیوں اور شہزادوں کے دکھ بھرے حالات لکھے ہیں جو قلعہ معلّٰی کو چھوڑنے کے بعد دربدر مارے مارے پھرے۔ ان میں بھکاری شہزادہ، دکھیا شہزادی، غمگین شہزادی، خانساماں شہزادہ اور بنت بہادر شاہ قابل ذکر ہیں۔

جب 1857 کے ہنگامہ کے بعد سلاطین اور ان کے خاندان والے، لال قلعہ سے نکل کر عملی دنیا میں آتے ہیں تو انہیں زندگی کا ایک نیا تجربہ ہوتا ہے۔ قلعہ کی محفوظ اور پرامن زندگی کی بجائے وہ اس وسیع وعریض دنیا میں خود کو بے یارومددگار پاتے ہیں۔ شاہی خاندان کے فرد ہونے کی وجہ سے یہ لوگ کام کاج اور کسی بھی ہنر سے بے خبر تھے۔ اس لئے جب زندگی گذارنے کے لئے انہیں تلاش معاش کا مرحلہ پیش آیا تو انہیں معمولی ملازمتیں اختیار کرنا پڑیں۔ عملی زندگی میں ان کا حسب ونسب ان کے کسی کام نہیں آیا۔

خواجہ حسن نظامی کی ان تحریروں میں انسانی المیہ ہے، اس میں اس تہذیب کی موت کا نوحہ

ہے جسے انقلاب نے ختم کر دیا تھا۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے قلعہ معلیٰ اور اس کی تہذیب کے مٹتے آثاروں کو دوبارہ سے زندہ کیا۔ بھولی ہوئی یادوں کو ابھارا۔ اس کے بعد تاریخ داں آئے جنہوں نے 1857 کی نامکمل تاریخ کو دستاویز کی مدد سے مکمل کرنے کی کوشش کی۔

حوالہ جات

1- سرسید احمد خاں: آثار الصنادید، کراچی 1966، ص 187

2- مبارک علی، آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان، لاہور، پانچواں ایڈیشن 2002ء، ص 41

3- تفصیل کے لئے دیکھئے، بزم آخر، مولفہ: منشی فیض اللہ دہلوی، مجلس ترقی ادب لاہور 1965۔ ظہیر دہلوی: 1857ء کے چشم دید حالات، المعروف داستان غدر، لاہور 2002، ص 37

4- ظہیر دہلوی، ص 19,18

5- خواجہ حسن نظامی: 1857: مجموعہ خواجہ حسن نظامی، سنگ میل لاہور 2007

1857 کی جنگِ آزادی اور پنجاب

احمد سلیم

1857 کی جنگِ آزادی کے حوالے سے پنجاب کے کردار پر اکثر حرف زنی کی جاتی رہی ہے اور اب تک کی جاتی ہے۔ عام تاثر یہ ہے کہ دہلی کی فتح میں پنجاب نے انگریزوں کی مدد کی۔ بعض حلقوں میں تو یہاں تک بھی کہا جاتا ہے کہ اگر پنجاب انگریزوں کا وفادار نہ ہوتا تو آزادی کی یہ لڑائی جیتی جا سکتی تھی۔ اس طرح کے عمومی تصورات جنگِ آزادی کی تاریخ کا مستقل حصہ بن چکے ہیں۔ دوسری طرف اتنے ہی شدید اور جذباتی انداز سے پنجاب کا دفاع بھی کیا جاتا ہے اور ویسا ہی عمومی رویہ اختیار کرتے ہوئے غداری کی خلعت، مخالفین کو پہنا دی جاتی ہے۔

تاریخ نویسی کے حوالے سے یہ دونوں رویئے غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پنجاب کا ایک حصہ جن میں امراء، والیان ریاست اور نیا ابھرتا ہوا جاگیردار طبقہ شامل تھا جو انگریزوں کا وفادار تھا اور انہیں سپاہ کی فراہمی سے لے کر، دامے، درمے، سخنے ہر طرح کی مدد کر رہا تھا۔ دوسری طرف عوام اور باغی سپاہی تھے جو پنجاب کے کئی علاقوں میں جتھہ بند ہو کر انگریزی غلامی سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ زیرِ نظر مطالعہ میں وفاداری اور بغاوت کے ان دونوں پہلوؤں کو زیرِ بحث لایا جائے گا لیکن چونکہ بغاوت کے عنصر کو اب تک دبایا گیا ہے، اس لیے اس پہلو پر زیادہ تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔

پہلے ہم فوجی بغاوتوں اور ان کو کچلنے کے انگریزی اقدامات کا ذکر کریں گے۔

فوجی بغاوتیں:

انبالہ انگریزوں کی بہت بڑی چھاؤنی تھی۔ یہاں اپریل میں ہندوستانی سپاہیوں میں بے چینی کے آثار پیدا ہوئے۔ 19 اپریل کو انگریزوں کے بنگلوں کو آگ لگائی گئی۔ میرٹھ کی بغاوت کی خبر پہنچتے ہی 11 مئی کو حالات خاصے نازک ہو گئے اور انگریزوں نے فوراً پٹیالہ، نابھہ، مالیر، کوٹلہ اور فرید کوٹ کے علاوہ جاگیرداروں اور رئیسوں سے بھی امداد طلب کی۔ انبالہ کے خزانے میں جتنا روپیہ تھا وہ دیہی گارد کی نگرانی سے نکال کر گورا گارد کے حوالے کر دیا گیا۔ 29 مئی کو جو دیسی افسر بغاوت میں شامل تھے انہیں موت کی سزا دی گئی اگرچہ یہاں کوئی خاص ہنگامہ نہیں ہوا تھا

لیکن اس کے باوجود 29 افراد کو موت کی سزا دی گئی اور 135 قتل ہوئے۔

پنجاب میں فیروز پور، اسلحہ اور سامان جنگ کا بہت بڑا مرکز تھا۔ مارچ 1857 میں یہاں دیسی فوج میں بے چینی کی لہر دوڑی۔ جب میرٹھ اور دہلی سے تشویش ناک خبریں آئیں تو ایک رجمنٹ نے میگزین پر حملہ کر دیا لیکن میگزین کو بچا لیا گیا البتہ چھاؤنی کی بہت سی عمارتیں نذر آتش ہوئیں۔ ان میں ایک گرجا بھی تھا۔ اس پر انگریزوں نے تیرہ افراد کو پھانسی دی اور پندرہ کو گولی سے اڑا دیا گیا۔

میرٹھ کے ہنگامے کی خبر جالندھر 11 مئی کو پہنچی۔ اسی روز ایک ہندوستانی افسر کو موت کی سزا دی گئی۔ شہر کی حفاظت کے لیے پھلور سے فوری طور پر توپیں منگوائی گئیں۔ کپورتھلہ قریب تھا، وہاں کے راجہ نے حکومت کی ہر طرح سے امداد کی۔ 7 جون کی رات کو فوج میں سخت بے چینی پھیلی لیکن کسی قسم کی کارروائی کیے بغیر وہ چھاؤنی سے نکل گئی، ایک تحصیل دار ضیاء الدین نے مجاہدین کے موافق روش اختیار کی اور اسے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔

ہوشیار پور میں آتش زدگی کی پہلی واردات 3 مئی کو ہوئی۔ 13 مئی کو دلی اور میرٹھ کے ہنگاموں کی اطلاع پہنچی۔ ڈپٹی کمشنر نے فوراً پولیس کی تعداد بڑھا دی اور تحصیل کی عمارت کی حفاظت کے لیے توپیں نصب کروا دیں۔ سپاہیوں کے خطوط کھول کھول کر پڑھے گئے تو معلوم ہوا کہ فوجیوں کے درمیان خفیہ نامہ و پیام جاری ہے۔ راستوں کی حفاظت کا زبردست انتظام کیا گیا تاکہ مقامی لوگ باہر نہ جا سکیں اور باہر کے لوگ اندر نہ آ سکیں۔

امرتسر میں 12 مئی کو میرٹھ اور دلی کی خبریں پہنچیں اور انگریزی فوج نے حفاظت کے مکمل انتظامات کر لیے۔ بیراگی فقیروں کی ایک بڑی تعداد گرفتار کر لی گئی۔ خزانہ قلعہ گوبند گڑھ منتقل کر دیا گیا۔ چار نئی حوالاتیں قائم کی گئیں۔ سپاہیوں کو شہر میں داخل ہونے سے منع کر دیا گیا۔ (35) دیسی فوج کو بغاوت کے شبہ میں غیر مسلح کر دیا گیا۔ 9 جولائی کو (59) دیسی فوج کو بھی غیر مسلح کر دیا گیا۔ ڈپٹی کمشنر کوپر کی رپورٹ کے مطابق ضلع میں 476 قتل ہوئے۔ دو کو پھانسی دی گئی۔ دو کی موت قید میں واقع ہوئی اور بارہ کو قید کیا گیا۔

سیالکوٹ میں جولائی کے مہینے میں فوج میں اچانک ایسی بے چینی پھیلی کہ سپاہیوں نے کئی انگریزوں کو قتل کر کے گورداس پور کا راستہ لیا۔ غالباً یہ لوگ دہلی جانا چاہتے تھے۔ اسی دوران میں جنرل نکلسن اپنے متحرک کالم کے ساتھ امرتسر پہنچا۔ اسے جب علم ہوا کہ فوجی گورداس پور روانہ

ہو گئے ہیں تو وہ بھی امرتسر سے گورداس پور کی طرف بڑھا۔ فوجیوں نے 12 مئی کو گورداس پور سے 9 میل اوپر راوی کو عبور کیا۔ اسی مقام پر نکلسن نے ان پر حملہ کیا۔ تین سو کے قریب قتل یا زخمی ہوئے اور جو بچ نکلے انہوں نے جسترونہ (جموں وکشمیر) کا رخ کیا۔ حکومت جموں وکشمیر نے ان لوگوں کو گرفتار کیا اور 600 آدمی انگریزوں کے سپرد کر دیئے۔ ان میں بہت سے صرف سائیس اور عام ملازم تھے۔ 126 فوجی تھے۔ ان سب کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔

سیالکوٹ میں باغ کے دروازوں پر باغیوں نے اپنے اعلانات کے اشتہار لگائے تھے۔ ایک میں انگریزوں کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا:

> ''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جب میں لاہور کی طرف کوچ کروں گا تو تمہارے لیے بچ نکلنا مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے کہ پنجاب کی فوج پوری کی پوری میرے ساتھ ہو جائے گی۔ یقین رکھو پنجاب کبھی تمہاری ملکیت نہیں ہو سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ اس صوبے میں تمہاری ہڈیاں پیسی جائیں گی۔ تم اپنی بھلائی پہچانو اور فوراً یورپ چلے جاؤ۔''

جہلم بھی جو جب سے اب تک فوجی بھرتی کا سب سے بڑا مرکز ہے، بغاوت میں دوسرے اضلاع سے پیچھے نہیں تھا۔ 7 جولائی کو جہلم کی فوج میں سے ڈھائی سو سپاہی بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ انگریزوں کے ساتھ باقاعدہ تصادم کے نتیجے میں ڈیڑھ سو کے لگ بھگ سپاہی مارے گئے۔ انگریزوں نے جہلم کا پل توڑ دیا۔ باقی لوگ جموں کی طرف نکل گئے۔ ان لوگوں کا تعاقب کیا گیا، کچھ تو بھاگ کر بچ نکلے لیکن چند ایک کو گرفتار کر لیا گیا۔ کئی روز تک فوجی عدالت میں ان پر مقدمہ چلتا رہا۔ انجام کار ان لوگوں کو موت کی سزا دی گئی۔ جو لوگ جموں بھاگ گئے تھے وہ بھی ایک بیان کے مطابق ختم کر دیئے گئے۔

راولپنڈی کی دو رجمنٹوں کے 26 آدمی ہتھیار لے کر بھاگ گئے۔ اکثر تعاقب میں مارے گئے۔ جو گرفتار ہوئے انہیں موت کی سزا دی گئی۔ راولپنڈی میں ہونے والی دیگر بغاوتوں میں ملوث 108 افراد کو فوجی عدالتوں سے اور 237 افراد کو دیوانی عدالتوں سے سزائیں دی گئیں۔

ملتان اور ساہیوال میں دیسی فوج سے 18 جون کو ہتھیار لے لیے گئے۔ گوگیرہ میں جو فوج مقیم تھی اسے بھی غیر مسلح کر دیا گیا۔ جس روز فوج سے ہتھیار لیے گئے اس روز رجمنٹ 69 کے چار

سپاہی بھاگ گئے۔ ان میں سے ایک پکڑا گیا اور اسے موت کی سزا ملی۔ پھانسی سے ایک رات پیشتر اس سپاہی نے جاں بخشی کے وعدے پر تمام راز افشا کر دیئے۔ اس پر صوبیدار میجر ناہر خان اور بعض دوسرے افراد کو گرفتار کیا گیا۔ ناہر خان پر 18 جولائی کو الگ مقدمہ چلا اور اسے 24 جولائی کو پھانسی دی گئی۔ ناہر خان کے ساتھ دس اور آدمیوں پر بھی مقدمہ چلا جنہیں موت کی سزا دی گئی۔

شملہ کے علاقے کسولی میں گورکھوں نے خزانہ لوٹا اور ہنگامہ آرائی کی۔ سپاتھو میں ایک شخص رام پرشاد بیراگی پر الزام لگایا گیا کہ اس نے خطوط کے ذریعے لوگوں کو مشتعل کرنے کی کوشش کی ہے۔ بیراگی کو انبالہ لے جا کر پھانسی دے دی گئی۔ عام شہریوں کی بغاوت میں لدھیانہ بھی پیش پیش رہا۔ ڈپٹی کمشنر نے ضلع کے رؤسا کی امداد سے حالات پر قابو پائے رکھا اور خزانہ محفوظ رہا۔ ایک مولوی صاحب نے شہر کی آبادی کو جہاد پر آمادہ کیا۔ جب ادھر ادھر سے مزید ہندوستانی سپاہی یہاں آئے تو مولوی صاحب نے اپنے معتقدین کو ان کے ساتھ شامل ہونے کی ترغیب دی۔ سبز جھنڈا تیار کیا گیا اور سب لوگ دلی روانہ ہو گئے۔ 17 جون کو ڈپٹی کمشنر نے شہریوں سے ہتھیار لے لیے جن سے گیارہ گاڑیاں بھر گئی۔ جالندھر سے فوجی یہاں پہنچے تو انہوں نے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ ان فوجیوں کو صرف گولہ بارود کی ضرورت تھی۔ دوسرے دن ان لوگوں نے قلعہ کو خالی کر دیا تو ڈپٹی کمشنر نے قلعہ کے اردگرد تین تین سو گز تک سارے مکان مسمار کرا دیئے۔

ہزارہ کی کرال قوم کے افراد نے مری پر حملے کا ارادہ کیا تو یہاں کے حالات بڑے تشویش ناک ہو گئے۔ انگریزوں نے دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی وسیع پیمانے پر حفاظتی اقدامات کر لیے۔

مری میں تین افراد کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر رسول بخش، ڈاکٹر سید امیر علی اور سید کرم علی۔ اول الذکر دو سرکاری ملازم تھے لیکن سید کرم علی قلعی گر کی حیثیت سے چکر لگایا کرتے تھے۔ سید کرم علی کو گرفتار کیا گیا اور 19 ستمبر 1857 کو پھانسی دی گئی۔ ڈاکٹر رسول بخش اور ڈاکٹر امیر علی بھی گرفتار ہوئے۔ 17 اکتوبر کو ان لوگوں نے بھی جام شہادت نوش کیا۔

فوجی اور شہری بغاوتوں کو کچلنے کے سلسلے میں انگریزوں کے مظالم کی کہانی بڑی دردناک ہے۔ پنجاب اگر سچ مچ انگریزوں کا وفادار ہوتا تو کم سے کم اس صوبے میں ''بلیک ہول'' کی روایت نہ دہرائی جاتی۔ لاہور کی چھاؤنی کے باغیوں کا جو حشر کیا گیا اس پر برطانیہ کی پارلیمنٹ شرم

. . .

سے پانی پانی ہوگئی تھی۔

لاہور میں میرٹھ اور دہلی کی خبریں پہنچتے ہی شہر کی صورت حال بگڑ گئی۔ افواہیں اڑنے لگیں تو شہر میں سراسیمگی پھیل گئی۔ حفاظت کے لیے نئی فوج بھرتی کی گئی۔ فقیروں، درویشوں اور بیراگیوں کو شبہ میں پکڑا جانے لگا اور حکم دیا گیا کہ لاہور کے قلعہ میں اتنی خوراک جمع کر لی جائے جو چار ہزار آدمیوں کے لیے چھ ماہ تک کافی ہو سکے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر حالات قابو سے باہر ہو جائیں تو انگریز قلعہ بند ہو سکیں۔ 12 مئی کو فیصلہ کیا گیا کہ میاں میر کی دیسی فوج کو غیر مسلح کر دیا جائے۔ اس کے لیے ایسا منصوبہ تیار کیا گیا کہ چند اعلیٰ افسروں کے سوا کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ اس رات کو انگریزوں نے رقص کا اہتمام کیا اور رقص جاری تھا کہ گورا پلٹن کو پریڈ کے میدان میں پہنچا دیا گیا۔ توپیں جگہ جگہ نصب کر لی گئیں اور فوجیوں سے کہا گیا کہ مختلف مقامات پر دیسی فوج نے سرکشی کر لی ہے۔ آپ لوگوں سے ہتھیار لے لینے کا مقصد یہ نہیں کہ آپ پر اعتماد نہیں ہے، اصل مقصد یہ ہے کہ آپ دوسری رجمنٹوں کی پیروی کرنا بھی چاہیں تو نہ کر سکیں اور خطرے سے محفوظ رہیں۔ اس وقت انتظامات اتنے مکمل تھے کہ سپاہیوں نے بے چون و چرا اسلحہ واپس کر دیا۔

میاں میر کی غیر مسلح 26 رجمنٹ کے ساتھ اس کے بعد جو سانحہ گزرا، اس کی مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔ غیر مسلح ہونے کے بعد فوجیوں کے جذبات بدستور تازہ رہے، یہاں تک کہ 30 جولائی کو رجمنٹ نے اپنے کمان افسر اور سارجنٹ میجر کو ہلاک کر دیا اور خود بھاگ نکلی۔ آندھی کے باعث بھٹک کر دریائے راوی کے کنارے جا پہنچی۔ ایک چوکیدار سلطان خان کی غداری کے باعث یہ لوگ گھیر لیے گئے۔ پولیس کے ساتھ سخت لڑائی میں رجمنٹ کے ڈیڑھ سو آدمی مارے گئے۔ باقی لوگ یا تو گرفتار کر لیے گئے یا راوی کی لہروں کی نذر ہو گئے۔ امرتسر کے ڈپٹی کمشنر فریڈرک کو پرکا خیال تھا کہ انہیں اسی وقت موت کی سزا دی جائے لیکن سخت بارش کی وجہ سے معاملہ صبح تک ملتوی کرنا پڑا۔ صبح مزید چھیاسٹھ فوجی گرفتار کر کے لائے گئے۔ اب دو سو بیاسی آدمی اجنالے کے تھانے میں بند دشمن کے آخری فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں صبح ایک برج میں بند کر دیا گیا۔ پھانسی دینے کے لیے بہت سے رسے منگوائے گئے تا کہ زیادہ تعداد میں بیک وقت پھانسی دی جا سکے۔ ضرورت پڑنے پر سب قیدیوں کو گولی کا نشانہ بنانے کے لیے ایک اور دستہ منگوالیا گیا۔ تھانے سے سو گز کے فاصلے پر ایک خشک کنواں تھا۔ لاشیں پھینکنے کے لیے اسے منتخب کیا

گیا۔ یکم اگست کو تمام مسلمان سوار رخصت پر بھیج دیئے گئے تا کہ وہ امرتسر جا کر عید منائیں۔ یہاں صرف کوپر تحصیل دار اور سکھ جوان یا سکھ رئیس رہ گئے۔ اجنالے کے اردگرد سخت پہرہ لگا دیا گیا تا کہ کوئی ادھر نہ آنے پائے۔ موت کی سزا دینے کا طریقہ یہ ٹھہرا کہ دس دس کی ٹولیوں میں قیدی باہر لائے جاتے۔ ان کے نام اور پتے لکھے جاتے اور انہیں اس جگہ کی طرف روانہ کر دیا جاتا جہاں سپاہی انہیں گولی سے اڑانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

کوپر نے لکھا ہے کہ ''جب یہ لوگ مقتل کی جانب لے جائے جاتے تو غصے اور جوش کی حالت میں مجھ سے کہتے'' تمہارے ساتھ بھی یہی سلوک ہوگا''۔

جب ڈیڑھ سو قیدی موت سے ہم آغوش ہو گئے تو گولی چلانے والے سکھوں کے دستے میں سے ایک کو غش آ گیا۔ چنانچہ سلسلہ قتل تھوڑی دیر کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ دو سو بتیس قیدی مارے جا چکے تو معلوم ہوا کہ باقیوں نے برج سے نکلنے سے انکار کر دیا ہے۔ خیال تھا کہ دروازہ کھلتے ہی وہ باہر کی طرف لپکیں گے اور لڑائی ہوگی۔ اس لیے پہرے کا خوب بندوبست کر لیا گیا تھا لیکن بند دروازے کے پیچھے قیدی تکان، گرمی اور دم گھٹنے کی وجہ سے ختم ہو چکے تھے۔ پینتالیس لاشیں باہر نکالی گئیں۔ اجنالہ کے بھنگیوں نے انہیں بھی اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ کنویں میں پھینک دیا۔ اس کنویں پر ایک اونچی قبر بنا دی گئی اور انگریزوں نے اس کا نام ''مفسد گھر'' رکھا۔

لارنس اور منٹگمری کی طرف سے کوپر کو اس ''شاندار کارنامے'' پر خراج عقیدت بھیجنے میں کافی عجلت برتی گئی۔

مارکس کی تشخیص:

لاہور کے حالات کے بارے میں 4 جون کو چیف کمشنر کے سیکریٹری نے جو رپورٹ حکومت ہند کے محکمہ خارجہ کو بھیجی اس میں کہا گیا کہ ''لاہور میں فوجی عدالتوں کا کام جاری ہے۔ گیارہ قیدیوں کو ملازمت چھوڑ کر بھاگ جانے کے جرم میں موت کی سزا دی گئی تھی۔ جسے جنرل گوون نے سزائے قید میں تبدیل کر دیا ہے۔ پیادہ فوج کے دو سپاہیوں کو انارکلی میں توپ دم کر دیا گیا ہے کیونکہ وہ لوگوں کو بغاوت پر اکسا رہے تھے۔''

فوجیوں اور عام شہریوں کی ان بغاوتوں کے یہ واقعات ہفت روزہ ''لیل ونہار'' شمارہ 12

مئی 1857 کے علاوہ مختلف سرکاری رپورٹوں اور تحقیقی مقالوں سے لیے گئے ہیں۔ان کی صحت پر شبہ اس لیے بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں سے بیشتر واقعات خود دشمن کے بیان کردہ ہیں۔ تاہم پنجابیوں کی خوش قسمتی کے باعث برطانیہ کی ایک لائبریری میں بیٹھا ایک جرمن فلسفی کارل مارکس ہندوستان کی جنگِ آزادی کو پوری توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ جنگ آزادی سے صرف آٹھ سال قبل انگریزوں اور پنجابیوں کے درمیان ہونے والی لڑائیاں بھی اس کے سامنے تھیں۔ اس نے چیلیانوالہ کی لڑائی میں 2300 انگریزوں کے مرنے کی خبر بھی ریکارڈ کی تھی اور اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ پنجاب کی فتح نے ہندوستان میں آزاد حکومتوں کے تصور کو ماضی کی ایک یاد بنا دیا تھا۔ اپنے ایک مضمون ''ہندوستانی فوج کی بغاوت'' میں اس نے لکھا تھا:

> ''سندھ اور پنجاب کی فتح سے برطانوی ہندوستانی سلطنت نہ صرف اپنی اصلی سرحدوں تک پھیل گئی بلکہ اس نے خود مختار ہندوستانی ریاستوں کے آخری نشانات بھی مٹا دیئے۔''

پنجاب کی فتح کے بعد پنجاب میں مدتوں تشدد کا بازار گرم رہا اور لوگ انتقام کا نشانہ بنتے رہے۔1855 کے ایک واقعہ کو موضوع بناتے ہوئے مارکس نے لکھا تھا:

''انتہائی شدید جبری وصولی اور تشدد کی غیر معمولی کارروائیوں کو اعلیٰ افسران کس روشنی میں دیکھتے ہیں، اس کا اظہار 1855 میں پنجاب میں ضلع لدھیانہ کے کمشنر مسٹر بریٹون کے واقعے سے ہوتا ہے۔ پنجاب کے چیف کمشنر کی رپورٹ کے مطابق یہ ثابت ہوا کہ متعدد واقعات میں خود ڈپٹی کمشنر مسٹر بریٹون کی مرضی یا ہدایت سے امیر شہریوں کے مکانوں کی بلاوجہ تلاشی لی گئی۔ ایسے موقعوں پر قرق کی ہوئی جائیداد طویل مدت تک قرق رہی۔ بہت سے لوگ جیلوں میں بند کر دیئے گئے۔ وہاں ہفتوں تک پڑے رہے اور ان کے خلاف کوئی چارج شیٹ نہیں تیار کی گئی۔ خراب چال چلن کے لیے ضمانت کے قوانین کو بڑے پیمانے پر اور بلا امتیاز، شدت کے ساتھ استعمال کیا گیا۔ بعض پولیس افسر اور مخبر ڈپٹی کمشنر کے ساتھ ضلع ضلع پھرے جن کی خدمات کو ڈپٹی کمشنر نے ہر جگہ استعمال کیا اور یہی لوگ ساری اذیت کے خاص مجرم تھے۔''

اپنی رپورٹ میں اس معاملے کے بارے میں لارڈ ڈلہوزی نے کہا ہے ''ہمارے پاس ناقابل تردید ثبوت ہے، ایسا ثبوت جس سے دراصل مسٹر بریٹون بھی انکار نہیں کرتے کہ افسر

موصوف بے قاعدگی اور غیر قانونی باتوں کی بھاری فہرست میں ہر بات کے قصوروار ہیں، جن کے لیے چیف کمشنر نے ان کو ملزم ٹھہرایا ہے اور جنہوں نے برطانوی انتظامیہ کے ایک حصے کو بدنام کیا ہے نیز برطانوی رعایا کی بڑی تعداد کو سخت ناانصافی اور من مانی قید اور ظالمانہ اذیتوں کا نشانہ بنایا ہے۔ (''ہندوستان میں اذیت رسانی کی تفتیش'')۔

ہم یہاں صرف اس قدر اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ ''برطانوی انتظامیہ کے ایک حصے کو بدنام کرنے'' اور ''برطانوی رعایا کی بڑی تعداد کو سخت ناانصافی اور من مانی قید اور ظالمانہ اذیتوں کا نشانہ'' بنانے میں لارڈ ڈلہوزی، حکومت ہند اور حکومت برطانیہ بھی اتنی ہی مجرم ہے جتنے مسٹر بریر ٹون یا ان جیسے دوسرے افسر۔ تشدد کے یہی واقعات تھے جو بڑھ پھیل کر ایک بڑی بغاوت کا باعث بنے۔ اپنی تحریروں میں مارکس نے اسی کی طرف جگہ جگہ اشارے کیے ہیں۔

''پنجاب میں فیروز پور کے مقام پر 57ویں اور 45ویں دیسی پیادہ رجمنٹوں نے بغاوت کی لیکن اسے طاقت کے ساتھ دبا دیا گیا۔ لاہور سے غیر سرکاری نامہ نگار لکھتے ہیں کہ پورے کا پورا دیسی رسالہ علی الاعلان بغاوت کی حالت میں ہے۔''

''.....لیکن گھیرا ڈالنے والی فوج میں دیسی فوجوں کا شامل ہونے والا حصہ بالکل ہی اور قطعی طور پر بھروسے کے قابل نہیں..... یہ لوگ ایک طبقے کے طور پر بالکل ہی غیر وفادار ہیں اور فوج میں ان کا کسی گنتی میں ہونا تشویش ناک بات ہونی چاہیے۔ اور ایسا ہی ثابت ہوا۔ دوسرے پنجاب رسالے میں تقریباً ستر ہندوستانی نوجوانوں کو بے ہتھیار کرنا اور تین کو پھانسی پر چڑھانا، جن میں ایک بڑا دیسی افسر تھا، ضروری سمجھا گیا۔''

''پنجاب میں بغاوت کے جذبے کو زبردستی دبایا گیا۔ سیالکوٹ اور جہلم میں بغاوت کو دبایا گیا۔''

''پنجاب کے بارے میں کہا گیا کہ وہاں پر امن و امان ہے لیکن اس کے ساتھ ہی بتایا گیا کہ فیروز پور کے مقام پر 13 جون کو فوجی کارروائیاں ہوئی ہیں..... یہ ماننا چاہیے کہ یہ بہت عجیب طرح کا امن و امان ہے۔''

''راولپنڈی سے خبر آئی کہ تین دیسی سردار سازش کر رہے ہیں۔ سر جان لارنس نے اپنے جوابی پیغام کے ذریعے حکم دیا کہ ایک جاسوس ان کے جلسے میں شریک ہو۔ جاسوس کی رپورٹ پر

سرجان نے دوسرا پیغام بھیجا۔ ''ان کو پھانسی پر لٹکا دو۔'' اور سرداروں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔''

'' پنجاب میں دیسی فوجیں توڑ کر ہی کھلم کھلا بغاوت روکی جا سکتی ہے..... اب انگریزی فوج کی اصلی پوزیشن کا ٹھیک ٹھیک پتہ اس بات سے لگتا ہے کہ پنجاب میں اور راج پوتانے میں فلائنگ کارز قائم کرنا ضروری سمجھا گیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انگریز نہ ہی اپنے سپاہیوں پر اور نہ ہی دیسی لوگوں پر اپنی بکھری ہوئی فوجوں کے درمیان راستے کھلے رکھنے کے لیے انحصار کر سکتے ہیں۔''

جموں کشمیر، جنید، نابھہ، کرنال، کپورتھلہ اور کسی حد تک بہاول پور کی ریاست کے والیوں نے دلی کی فتح کے لیے انگریزوں کو اپنی فوجیں اور مالی امداد دی۔ لیکن بعض ایسی ریاستیں بھی تھیں جنہوں نے بغاوت میں حصہ لیا اور جان و مال کی قربانی دی۔ تاریخ جھجھر کے نواب عبدالرحمٰن خان، بلگو کے پرتاپ سنگھ اور بلب گڑھ کے ناہر سنگھ کو نہیں بھول سکتی۔ جن ریاستوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا وہاں بھی تھوڑے ہی عرصے بعد جذبات میں بے چینی محسوس کی جانے لگی۔ لکھنؤ پر حملے کی تفصیلات کا جائزہ لیتے ہوئے فریڈرک اینگلز نے سکھوں کی اس تبدیلی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''اور سب سے آخر میں سکھوں نے جس انداز میں بولنا شروع کیا ہے وہ انگریزوں کے لیے نیک شگون نہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی مدد کے بغیر برطانیہ کے لیے ہندوستان کو قبضہ میں رکھنا مشکل ہے اور یہ کہ اگر وہ بغاوت میں شامل ہو جاتے تو ہندوستان کم از کم کچھ عرصے کے لیے انگلینڈ کے ہاتھوں سے ضرور نکل جاتا۔ یہ بات وہ کھلم کھلا کہتے ہیں اور اپنے مشرقی انداز میں بڑھا کر کہتے ہیں۔ انہیں اب انگریز نسل بڑھیا نظر نہیں آتی جس نے مدکی، فیروز شاہ اور علی وال کے مقام پر انہیں شکست دی تھی۔ اس یقین سے کھلی دشمنی تک مشرقی قوموں نے بس ایک ہی قدم اٹھانا ہوتا ہے۔ ایک چنگاری ہی شعلے کو بھڑکا سکتی ہے۔''

''..... ہو سکتا ہے پنجاب کو بھی پھر جیتنا پڑے لیکن اگر اچھے سے اچھے حالات بھی رہے تو بھی انہیں ایک لمبی اور پریشان کن گوریلا جنگ کا سامنا کرنا پڑے گا اور ہندوستانی دھوپ میں یورپینوں کے لیے کوئی قابلِ رشک بات نہیں۔''

.....اس وقت یہ نفرت اگرچہ کمزور اور بے بس ہو، پھر بھی یہ اہمیت سے خالی نہیں جبکہ وہ خطرناک بادل سکھ پنجاب پر چھایا ہوا ہے۔''

احمد خان کھرل:

مارکس نے بغاوت کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون ''ہند میں بغاوت'' میں ایک جگہ بتایا ہے کہ ملتان اور لاہور کے درمیان مواصلات کے ذرائع آٹھ دن تک منقطع رہے۔ مارکس کا یہ اشارہ اس مشہور بغاوت کی طرف ہے جس کے نتیجے میں انگریز اسسٹنٹ کمشنر برکلے اور اس کے بے شمار فوجی مارے گئے تھے اور بغاوت کے لیڈروں کو خود بھی اپنی جانیں قربان کرنی پڑی تھیں۔ اس بغاوت کا مرکز بار کا علاقہ تھا اور اس بغاوت کی کہانی پنجابی لوک گیتوں کی ایک صنف ''ڈھولوں'' میں جگہ جگہ بکھری پڑی ہے لیکن پہلے ہم ان انگریزی رپورٹوں کو دیکھنا چاہیں گے جو جنگِ آزادی کی کہانی حاکم طبقے کے نقطۂ نظر سے بیان کرتی ہیں۔

چیف کمشنر پنجاب سر جان لارنس نے حکومتِ ہند کے نام مندرجہ ذیل رپورٹ ارسال کی:

''اس ضلع (ساہیوال) کے تین قبیلے فتیانہ، بہاول کی سرداری میں، کاٹھیا، محمد کی رہنمائی میں جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر اٹھے۔ کھرل قبیلہ، احمد خان کی سرداری میں بروئے کار آیا اور تینوں اکٹھے ہو کر انگریزوں سے الجھ گئے۔'' لیفٹیننٹ الفنسٹن کے پاس اطلاع پہنچی کہ فلاں فلاں قبیلے بگڑ گئے ہیں۔ اس نے فوجیں بھیجیں اور راوی کے کنارے جھڑپیں ہوئیں۔ اس کے بعد انہوں نے گوگیرہ پر سخت حملہ کیا اور نقصان پہنچایا۔ مسٹر برکلے مارا گیا اور ادھر سے خود احمد خان کام آیا لیکن یہ سلسلہ جاری رہا۔ باغیوں نے ہڑپہ اور چیچہ وطنی پر قبضہ کر لیا اور چیمبرلین اور اس کی فوج کو محاصرے میں لے لیا۔ انگریزی فوجیں لاہور، ملتان اور گورداس پور سے پہنچیں اور صاحب کو محاصرے سے نکالا۔

پھر میجر چیمبرلین نے جلبی پر حملہ کیا۔ یہاں پر سخت لڑائی ہوئی اور باغیوں نے قلعے سے باہر نکل کر حملے کیے۔ اس کے بعد باغیوں کا نہایت منظم طریقے سے قلع قمع کر دیا گیا۔

ایک اور افسر کی رپورٹ ملاحظہ ہو:

''دوسرا ہنگامہ گوگیرہ میں برپا ہوا، جو راوی اور ستلج کے درمیان لاہور کے جنوب میں واقع ہے۔ سقوطِ دہلی کے ساتھ ہی 16 ستمبر کو محکمہ ڈاک کے ایک اہل کار نے آنسوؤں سے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بیان کیا کہ ساحل کے ساتھ ساتھ لاہور اور ملتان کے درمیانی علاقے میں لوگ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور باغیوں کی تعداد 1,25,000 یک لاکھ پچیس ہزار ہے۔ (ضلع کی کل

آبادی ساڑھے تین لاکھ تھی)۔ تین گھنٹے کے وقفے سے ایک یورپین کمپنی، توپ خانہ اور دو سو سکھ سپاہی روانہ کر دیئے گئے تھے۔ باغی ہتھیاروں سے مسلح تھے جو انہوں نے پولیس سے چھین لیے تھے یا ملحقہ ریاست بہاول پور سے درآمد کیے تھے۔

یہ بغاوت بیس دن کی جدوجہد کے بعد فرو ہوئی جس میں ہمارا تھوڑا سا جانی نقصان ہوا۔ اس غرض کے لیے یہاں پانچ سو فوجی دستے جمع کیے گئے تھے۔ اگرچہ ان دنوں امن وامان ہے لیکن بغاوت کی وجہ کی تحقیقات ضروری ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ جب تک دہلی ہمارے قبضہ میں آیا۔ اس وقت تک بغاوت فرو نہ ہو سکی۔''

ڈپٹی کمشنر گوگیرہ لیفٹیننٹ این۔ ڈبلیو الفنسٹن کی ایک رپورٹ سے برکلے کی موت اور بغاوت کی دیگر تفصیلات کا پتہ چلتا ہے۔

''مجھے برکلے کا رقعہ ملا۔ وہ احمد خان کھرل پر قابو نہیں پا سکا۔ احمد خان اور برکلے دونوں آمنے سامنے تھے لیکن گولیوں کی زد سے باہر تھے۔

احمد خان نے شاہ دہلی کی اطاعت کا ذکر کیا تو اس کے ساتھیوں میں جوش پیدا ہو گیا۔ انہوں نے توڑے دار بندوقیں چلائیں، جن کا موثر جواب دیا گیا۔

اس اطلاع کے ساتھ لیفٹیننٹ مچل، برکلے کی مدد کو بھیجا گیا۔ صدر مقام سے قیدی اور خزانہ خالی کر کے میں خود بھی بھاری جمعیت کے ساتھ ان سے جا ملا۔

''ہم لوگ دریا عبور کر گئے۔ دشمن پہلی بار کے ساتھ بھاگ اٹھا۔ ہم نے ان کا تعاقب کیا۔ وہ ایک گاؤں جھامرہ میں جمع تھے جہاں ہم نے سات سو مویشی قبضہ میں کیے اور جھامرہ کو نذر آتش کر دیا۔ دوسرے روز قابل وثوق ذرائع سے اطلاع ملی کہ احمد خان اپنے ساتھیوں سمیت (موضع) ''اکبر کے'' کے قریب موجود ہے۔ کیپٹن بلیک اپنے ایک سو پچاس سواروں کے ساتھ لیفٹیننٹ جی چیٹر کے دستوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ جہاں باغیوں کے ساتھ مقابلہ ہوا۔'' رسالدار مارا گیا۔ کئی گھوڑ سوار گر پڑے اور گھمسان میں کافی نقصان پہنچا۔ جو لوگ یہاں بچے انہیں بھاگنے میں کافی مشکلات پیش آئیں اور اس مہم میں احمد خان کھرل، اس کا بھتیجا مراد اور سردار سارنگ بھی شامل تھا۔

ملتان کے ساتھ خط وکتاب کا سلسلہ منقطع ہے، جس میں ولی داد مردانہ حائل ہے۔

مسٹر برکلے کو کوڑے شاہ روانہ کیا گیا لیکن وہ رابطہ پیدا نہ کر سکا۔ باغی اپنے قبائلی سرداروں، بہاول، سجاول اور ولی داد کی قیادت میں جمع تھے۔ برکلے کو مقابلے میں تھوڑی سی کامیابی ہوئی۔ وہ دوسرے روز احتیاط کیے بغیر جنگل میں داخل ہو گیا۔ جہاں باغیوں نے حملہ کر دیا۔ اس کے سپاہی منتشر ہو گئے۔ برکلے کے بازو میں گولی لگی۔ اس نے اپنی تلوار سے حفاظت کی کوشش کی لیکن مراد فتیانہ کے نیزے کا وار مہلک ثابت ہوا۔

لیکن احمد خان کھرل کی کہانی سرکاری رپورٹوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ سینکڑوں مقامی روایات نے اس مجاہد اور اس کے ساتھیوں کے گرد عقیدت کا جال بن رکھا ہے۔ بعض مقامی روایات کے مطابق یہ جنگ محض راجپوتی غیرت کا سوال تھی۔ انگریزوں نے احمد خان کھرل سے اس کی گھوڑی مانگی تھی۔ اس نے انکار کیا۔ جس کے نتیجے میں مہینوں تک جنگ ہوتی رہی۔

موچی والا (جھنگ) کے ایک ڈھولئی ماہمند (محمد) ولد امیر نور محرمی بلوچ کے لفظوں میں برکلے آیا اور اس نے احمد خان سے گھوڑی مانگی۔ احمد نے انکار کیا۔ برکلے نے کہا میں تجھے مروا دوں گا اور لندن سے فوج منگوا کر تیرے وقار کا خاتمہ کر دوں گا اور تو گھوڑی دے دے تو لندن سے تجھے سند منگوا دوں گا۔ احمد خان کے پاس مورنی ذات کی خوبصورت گھوڑی تھی۔ برکلے نے پولیس منگوا کر احمد کے گاؤں جھامرہ نزد منڈی تاندلیانوالہ کو لوٹ لیا۔ اس وقت احمد گاؤں میں نہ تھا۔

بار کے علاقے میں احمد خان کھرل اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں اسی طرح کی کہانیاں مشہور ہیں۔ ڈھولوں میں بھی کم و بیش یہی خیالات ملتے ہیں لیکن تاریخ ہمیں اس سے مختلف کہانی سناتی ہے۔ یہ بغاوت ایک شخص کے ذاتی وقار کا مسئلہ ہرگز نہ تھی۔ نہ ہی یہ کسی ایک شخص کی خواہش پر شروع ہوئی تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جنگ کا آغاز انگریزوں کو لگان دینے سے انکار پر ہوا۔ واقعات کے مطابق موضع سکھو کا (تحصیل پاک پتن) کے جوئیا قبیلے نے انگریزی حکومت کو لگان ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ 8 جولائی کا واقعہ ہے۔ حکومت اس معاملہ کو دبانے میں کامیاب ہو گئی۔ اسی مہینے کی 26 تاریخ کو احمد خان کھرل اور اس کے ساتھیوں نے ضلع کے صدر مقام گوگیرہ کی جیل پر حملہ کر کے تمام قیدیوں کو رہا کرا لیا۔ احمد خان انگریزوں کی نگرانی کے باوجود خفیہ طور پر بغاوت کی تیاریاں کر رہا تھا اور گوگیرہ جیل پر حملہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ جیل کے تصادم میں انگریزی سپاہ اور مقامی قیدیوں کے پچاس سے زائد آدمی مارے گئے۔

حکومت قیدیوں کی رہائی سے زیادہ احمد خان کھرل کی روپوشی سے خوفزدہ تھی۔ اس کی گوریلا کارروائیاں حاکموں کے گرد گھیرا تنگ کرتی جارہی تھیں۔ جب حکومت احمد خان کھرل کی سرگرمیوں کو روکنے اور اسے گرفتار کرنے میں پوری طرح ناکام ہوگئی تو اس نے ایک چال چلی۔ تمام مقامی سرداروں کو بلا کر سرزنش کردی گئی کہ وہ ضلع کے صدر مقام تک محدود رہیں اور اگر کہیں بہت ضروری جانا پڑے تو حکام کی اجازت لے کر جائیں۔ اس چال سے حکومت کا مقصد یہ تھا کہ احمد خان کھرل کے ساتھیوں کی سرگرمیاں ایک جگہ تک محدود ہو جائیں۔ چنانچہ وہ مجبور ہو کر گوگیرہ (ضلعی صدر مقام) اپنے ساتھیوں سے رابطہ قائم کرنے آئے گا اور گھیر کر مار لیا جائے گا۔ ان اقدامات کے ساتھ حکومت فوج کی تعداد میں بھی برابر اضافہ کرتی رہی۔

مگر حکومت کی یہ چال ناکام ہوگئی۔ احمد خان کھرل کو گرفتار نہ کیا جاسکا اور سرگرمیوں کا دائرہ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گیا۔ حکومت نے اب دوسری چال چلی اور دریائے راوی کے تمام سرداروں کو پیغام بھیجا کہ وہ 17 ستمبر کو کمالیہ میں حکومت سے مذاکرات کریں۔ ان مذاکرات کے ذریعے حکومت ان سرداروں کو خریدنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ 16 ستمبر کی رات احمد خان کھرل نے فرداً فرداً تمام سرداروں سے رابطہ قائم کر کے انہیں مجبور کیا کہ وہ حکومت کے ساتھ مذاکرات کا بائیکاٹ کریں۔ چنانچہ بیشتر سردار اسی رات کمالیہ سے نکل کر اپنے اپنے علاقوں میں پہنچ گئے اور جنگی جتھوں کی تنظیم کا کام شروع کردیا۔

سرفراز کھرل، جس نے پہلے 1831 میں لیفٹیننٹ برنس کو لاہور کے سفر کے دوران کافی مدد دی تھی اور جو سکھوں کی دوسری لڑائی میں انگریزوں کی طرف سے لڑا تھا، اب پھر اپنے پرانے آقاؤں کا وفادار بن کر سامنے آ گیا۔ اس نے ڈپٹی کمشنر کو سارے واقعات سے آگاہ کردیا۔ ڈپٹی کمشنر نے فوری طور پر بغاوت کو روکنے کے سلسلے میں چند اقدامات کیے۔ ملتان ڈویژن کے کمشنر اور ہڑپہ تحصیل کے افسروں کو متوقع حالات سے خبردار کیا اور بیس سواروں کے ساتھ برکلے کو احمد خان کھرل کی گرفتاری کے لیے روانہ کردیا لیکن وہ احمد خان کھرل کو گرفتار کرنے کی حسرت دل میں لیے واپس گوگیرہ پہنچ گیا۔ ڈپٹی کمشنر الفنسٹن سرکاری خزانے اور صدر دفتر کو گوگیرہ سے ہڑپہ منتقل کرنے کے بعد برکلے کو ساتھ لے کر احمد خان کھرل کو مارنے نکلا۔ احمد خان اپنے گاؤں جھامرے میں نہیں تھا۔ ''منصف حاکموں'' (یہ غالب کے الفاظ ہیں) نے اپنے دشمن کی غیر

موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تمام گاؤں جلا دیا۔ اس یک طرفہ جنگ میں سات سو جانور اور بیس آدمی انگریزوں کے ہاتھ لگے۔ احمد خان کھرل کی طاقت پر یہ ایک کاری ضرب تھی لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ وٹو قبیلے کے سرداروں کو ساتھ ملا کر اس نے انگریزوں سے ایک فیصلہ کن جنگ کا منصوبہ بنایا۔ ادھر انگریز لاہور سے دھڑا دھڑ فوج منگوا رہے تھے۔ ادھر جھامرہ کو آگ لگانے کے بعد برکلے کوڑے شاہ پہنچ چکا تھا۔ وہ ہڑپہ کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ملتان سے سواصلاتی رابطے بحال کرنے کی کوشش میں مصروف بھی تھا۔

احمد خان کافی تیاری کے بعد گوگیرہ پر حملہ کرنے کے ارادے سے چل پڑا تھا۔ برکلے بھی گوگیرہ پہنچ گیا لیکن ناسازگار حالات کے نتیجے میں گوریلا حکمت عملی کو اپناتے ہوئے احمد خان اور اس کے ساتھیوں نے قریبی جنگلوں میں چھپنا مناسب سمجھا۔ جب الفنسٹن کو خبر ملی کہ کھرل اور وٹو، گوگیرے سے چھ میل دور کشکوری کے جنگل میں چھپے ہوئے ہیں تو اس نے انہیں گھیرے میں لینے کا پروگرام بنایا لیکن کیپٹن بلیک اور لیفٹیننٹ جی چسٹر کو جنگل میں منہ کی کھانی پڑی اور انہیں بیس انگریزوں کی لاشیں چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ حریت پسندوں کی طرف سے احمد خان اور سارنگ کھرل لڑتے ہوئے مادر وطن پر قربان ہو گئے۔

احمد خان کھرل کی شہادت کے بعد مراد فتیانہ برکلے کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ کوڑے شاہ کے قریب ایک بار پھر برکلے اور مجاہدین آزادی کا سامنا ہوا۔ اس جنگ میں برکلے اور اس کے پچاس آدمی مارے گئے۔ برکلے کی موت کی تفصیل ماچھی والا کا ماہمند ڈھولئی اس طرح بیان کرتا ہے:

''مراد، برکلے کے سامنے آیا اور مراد کے حامی، انگریز کی یونٹوں سے لڑنے لگے۔ مراد کے پاس اس وقت سانگ (نیزہ بازی کا ہتھیار) اور برکلے کے پاس تلوار تھی۔ مراد نے سانگ ماری اور برکلے چالاکی کے ساتھ اچھل پڑا اور سانگ گھوڑے کی زین کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ لڑائی کے دوران برکلے نے سانگ کا اگلا سر پکڑ لیا اور اسے آہستہ آہستہ اپنی طرف کھینچتا رہا تا کہ مراد قریب آ کر مارا جا سکے۔ اچانک ایک چرواہے سوجے بھادروں نے یہ دیکھا تو اس نے سوچا کہ اس طرح تو مراد مارا جائے گا۔ وہ بھیڑیں چھوڑ کر ادھر کو بھاگا۔ اس کے پاس صرف ایک لاٹھی تھی۔ اس نے وہی لاٹھی پورے زور سے برکلے کے سر پر دے ماری۔ اسے گھوڑے سے نیچے گرا دیا اور مراد کی سانگ نے اسے ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔

یاد رہے کہ انگریزی رپورٹ میں یہ کہا گیا تھا کہ برکلے کے بازو میں گولی لگی جس سے وہ گر پڑا تھا اور مراد کی سانگ کا نشانہ بن گیا تھا۔

مراد فتیانہ، احمد خان کھرل کی موت کا انتقام لینے کے بعد روپوش ہو گیا۔ انگریزوں کے لیے برکلے کی موت ناقابلِ برداشت تھی۔ انہوں نے جھنگ سے بہاولپور تک لاشوں کے انبار لگا دیئے۔ مراد کو گرفتار کرنے کے لیے وارنٹ جاری کر دیئے۔ حکومت نے اس کی جائیداد ضبط کر لی۔ اس کی اولاد کو جیل میں بند کر دیا، لیکن اس کے بیٹے اور بیٹی نے لاکھوں سختیوں کے باوجود اپنے باپ کا پتہ نہ دیا۔ مراد فتیانہ بہت مدت تک ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد پشاور کے راستے افغانستان چلا گیا۔ مراد کی بیٹی حاملہ تھی۔ جیل ہی میں اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ مراد فتیانہ کا بیٹا اور بیٹی جیل ہی میں سختیاں برداشت کرتے کرتے آخر کار ختم ہو گئے۔

لیکن ہماری بات اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی جب تک ہم مقامی غداروں کی بات نہ کر لیں۔ سرفراز کھرل کے علاوہ ملتان کے صادق محمد خان نے انگریزوں کے لیے نہ صرف ایک سو سوار بھرتی کرائے بلکہ گوگیرہ کی لڑائی میں انگریزوں کا پورا پورا ساتھ بھی دیا۔ بغاوت کچلے جانے کے بعد اسے ملتان کا انکم ٹیکس افسر بنا دیا گیا۔

دہاڑا سنگھ بھی انگریزوں کی طرف سے لڑا اور تین سو روپے سالانہ منصب کے علاوہ کشکوری اور دان مہر سنگھ کے گاؤں جاگیر میں پائے۔ مقامی روایت کے مطابق احمد خان کھرل اسی کی گولی کا نشانہ بنا تھا۔ ایک اور روایات کے مطابق احمد خان کھرل کا قاتل رائے بیدی نامی شخص تھا۔ سردار نہال سنگھ کو اپنی خدمات کے صلے میں دس ہزار روپے نقد اور چھ ہزار روپے کی جاگیر ملی تھی۔ اس نے خفیہ خبر رسانی کے علاوہ فوج کی بھرتی کا کام بھی کیا۔

انگریزوں سے جاگیر پانے والوں میں جیوے خان، سردار شاہ، مراد شاہ، بابا کھیم سنگھ، بابا سمپورن سنگھ، کنہیا رام، وھارا سنگھ، ماجھی سنگھ اور جماعت سنگھ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

آخر میں ہم ان ڈھولوں کا متن درج کرتے ہیں جو ''برکلی دے ڈھولے'' کے نام سے مشہور ہیں۔ برکلے مقامی شاعروں کی زبان پر آ کر برکلی بن گیا۔ یہ ڈھولے اس عہد کے واقعات کی ٹوٹی ہوئی کڑیاں جوڑنے کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ ان ڈھولوں کو گانے پر انگریزی حکومت نے پابندی لگا رکھی تھی لیکن عوام نے کبھی سرکاری احکامات کی پروا نہ کی اور انہیں گاتے رہے۔

یہ ڈھولے آج بھی 1857 کے ان پنجابی سورماؤں کی کہانی سناتے ہیں جو اپنے محدود وسائل کے باوجود حاکموں سے ٹکرا گئے اور لڑتے ہوئے خود تو ختم ہو گئے مگر ان کے نام اور کام کو ختم نہ کیا جا سکا۔

برکلی دے ڈھولے

(1)

کال بلیندی اے نارنگ کرے بہہ اُسارے
ساندل بار ''پٹر بارہ'' جتھے خان احمد دیاں مجھیں دے ڈھارے
کڑاوَ،(1) گھلیا اے مانکا مراثی
خان تیرے (2) جھانبرے نوں رگیں اگ کھلی اے دے بھڑکارے
خان چانیتیاں سنتاں، نفل شکرانے دے چا گزارے
سجدے گئے راءنوں چھٹی گولی، جس بازو بند چا کیتے سارے
مارے احمد توں پچھے، گھوڑا گھتیا ماہمند، وڈھے نی سپاہی بے شمارے
اس دہاڑے کیڈے چنگے لڑے نی
کلم، کرملی، کھنا تے دھانا،(3) جنجوعے بھرا پنجے چارے
بھیڑا پے گیا حسنی قادو دا لکا چھب (4) ''یارے آلے''
سوندرا باردا مڑ وَنج مویا اے (5) اسے تھا برے
پٹ کے تھوبیاں چکڑ دیاں گھوڑی اپنی دے منہ تے مارے
ہلک بندہ ہوروی بھیڑا پے گیا متلی کا کودا ٹو
نہر تے یاد چا کیتا سوگھرآلے
مردتے سرداری ترہندے ہن، چتواں گند کھلارے
چتو ہن ای ترف اٹھیندے نی
جو انگریز دیاں توپاں دے سن دے ہن بلارے
بھر کے کلمہ دین دا، شافی مولا ہوون
جیہڑا اتھے وی تجیں تے اگاں بھریاں جاسن ہو چھٹکارے

(2)

کال بلیندی اے نارنگ بدھی تاری
چڑھیا انگریز برکلی جنگ دی کرتیاری
کوڑے شاہ توں اُتوں ڈیرہ کرا اڑلیندا اپھدونگاری
ساراچوپہرہ انہاں توں ٹوکری ڈہائے
نماشیں دو آنے دیندا تاردہاڑی
جلہی (6) توں سا ہویں سڑک کھٹیندا، اگے نے اتھے کوئی کوٹ نہ محل نہ ماڑی
ورلے ورلے بوڑے، کائی کائی لبھدی آہی جھاڑی
مارے احمد دی راتھاں تے چیتھی اپڑی کاہی
مردتے ساہن سمڈھا اے، کھلیے سوبھرا تنکاری
مرادآہدا جدکہ جمی ساوی، کھرکھرے پھریندا، روز نہاری
نہ ماراڈیاں، نہ تاءدے لگام دا
میںنوں رگ جلہوڑیاں دی میں سمندراں دی تاری
تینوں دیساں کرکے سچ ترچ جے وکھاویں برکلی دی بگھی کالی
مرادآہدا اے، کنڈا اے دوڑ نہ جاویں انگریز برکلی
پڑوچ وجے آں دوویں آن کھڈکاری
اگے چاچے احمد ماربچایائی، میتھے وی آویں اے ونگ کڈھ کے چاڑھی
جگھائی سانگ پوتر دلیل دے ٹوپ انگریز دا کھلاری ڈھالی
ڈھاندے نوں ماریاں ڈانگاں سوجے بھادروں
جوان دی ڈانگ دی گھوکرآوے جیویں چھلی اے کوئی تامے ہاری
مارے انگریز برکلی دی نندن (7) چیتھی اپڑگئی کابی
میماں کھلیاں بانہواں کرکے روندیاں راوی منڈ تے راٹھ دھنتر سنیندا
پتر دلیل دا، جس دو (8) ناریں دا ڈھولا ماریا اے
لٹیا اے گھر سرکاری

مراد آہدا اے میں ولی آپ دی لکھی بھوگ آساں
پرتوں وی گو گیریانوالے بنگلے، نہ لابہیں کچاہری (9)

(3)

کال پئی بلیندی اے تے نار دجھنڈ کھلاری
لندنوں چڑھیا انگریز برکلی، فوج لے بے شماری
سدھیا سوں ابھاتے لما، جھانبرے چوں نکلیا مار بھنوالی
آکھے من راوی دی راٹھ نہ کائی، ہموں گئی اے ودھ جتالی
سدھی سڑک جلہی نوں کڈھیندا، کراڑلیند انپ وگاری
چارے پہر کار کریندا، نماشیں دیندا ترے آنے گن دہاڑی
اس راٹھاں تے دتے منہ کڑیالے تے کیتی چڑھ اسواری
ہکناں نوں مار گھتیا، ہکناں دے نک وچ لئی گھت مہاری
آکھے مراد فتیانہ، ساوی تینوں پھیراں نت کھرکھرے تے دیواں کھنڈ نہاری
اک واری لے چل انگریز برکلی تے میں ویکھاں اس دی کالی بگھی
توں کر بسم اللہ دھر پیر رکابے، میں جاساں مار اڈاری
پاہر سواد نہہ آیا تے ساوی جا لتھی وچ جھانبرے مار بھنوالی
انگریز برکلی تے مراد فتیانہ وچ میدان دے گئے رلی کھڈ کاری
انگریز دی سانگ چھلا انکے تے مراد دی سانگ کجھ بھاری
مراد دلیل دا اپڑیا انگریز تے اس سانگ جگر وچ ماری
تے نہیوں کڈھ سٹیوس جیویں مٹ وچوں لچھا لیندا اجھول للاری
شابش گھتو سوجے بھدروں نوں جس ڈھاندے نوں ڈانگ ماری
تے کھدو کرا انگریز سٹیوس، پیو دادے دی پیڑھی سوں تاری
دیگری گھوڑی خبراں دتیاں برکلی مرا کے جا ہنگی تھان تے کاہلی
بنگلے وچوں رو کے نکل پیاں میماں تے آکھن وین پر بہری

. اسانوں تا لکھیا ڈھیسیں پر بنگلے گوگیرے توں نہ لیسیں کچہری
راوی دی من تے راٹھ وسن جینہاں چٹے دینہہ لٹیا گھر سرکاری
انگریزاں دیاں فوزاں دھاوے کیتے تے پھدتو لیا آہری
تے پٹھیاں ہتھکڑیاں انگریزاں ماریاں وچ ہوالاٹ سرکاری
لوہے دیاں بیڑیاں گھت کے جاہ بیڑیاں وچ چڑھائے
مراد دلیل دا آکھے اسیں راضی وگے جاندے ہائیں کافر ماردو پہری
خوش وسیں اودیس ساڈیا

(4)

کال بلیندی ناردو گائے ڈھول دے
راوی دے من تے احمد کھرل اے جیویں پہاڑ کڑا ناسن روم تے شام دے
کھرل نوں پگ دا حکم حضوروں ارواح نوں تھاپنے حضرت پیر پیراں دے
احمد ضلعیاں چوں ڈھکاں (12) ٹر چھدائیاں
ایہہ کم ہین کھرل نیک جوان دے
سید ابھول داوٹو آہدا اے رائے جی انگریزاں کیتیاں کونسلاں
راٹھو پورے نہ آوسی اپنی لاہم (13) دے
انہاں دے کول دمدمے، دارو سکے تے ڈھیر قمام دے
انہاں نوں ورقالدھا ہک نجوم دا جتھوں کھلے نیں عقل عیان دے
تے اوہ افلاطون بروبر نالے شرگد (14) لقمان دے
انہاں نوں دین مذہب دی خبر نہ کائی حلال پئے رلیندے وچ حرام دے
اوہ کلمے نبی دا نہیوں بھردے نالے سوہیں ناہیں رام دے
مڈھوں ہین پتر شیطان دے
کاٹھ دے وچوں ددھ چوویندے، لوہا بھجا چھڈیا نے وچ مدان دے
پوہ ماہ دے وچ مکاوردی لا کے ٹردے جھپنا وچ جیان دے

اُرے گنگا پرے جمنا، کوہ قاف توں پرانہہ گھرانہاندے لندن ہائیں
وچ نکران دے
خان احمد آ ہندا اے میں انہاں انگریزاں دی ہک گل ہوروی جاننا ہاں
انہاں اگے چھیانیاں (16) روپیہ اگاڑ کے کھاہدا، راجے بہاوالحق توں
اروں تنبوٹھو کے ہانے وچ ملتان دے
انہاں انگریزاں دی ہک گل ہوروی جاننا ہاں اگے فوزاں جاہ کہائیاں
ہانے انور جی کول پٹھان دے
کھرل کر کے یاد خدانوں دھری اے لت رکا بے پھدے لڑ لگام دے
بھیڑیاں پیاں ہین فوزاں انگریزاں دیاں جے کھڑک ملے ہینے سانگ دے
کھگراں آلے کلردے کولوں ہاتھیں انگریزاں دیاں چک لنگھائیاں
پکے نویں کھلے ہین اوہ نشان دے
نماز پڑھدے رائے احمد خان نوں گلاب راء بیدی ماری اے گولی
اگا نہہ وی رلن سنگ امام دے

حوالہ جات:

کتابیں اور رپوٹس

مارکس، اینگلز۔ ''نوآبادیاتی نظام'' (اردو) دارالاشاعت ترقی، ماسکو
مارکس: ''نوٹس آن انڈین ہسٹری'' (انگریزی) فارن لینگویجز پبلشنگ ہاؤس، ماسکو
مارکس: اینگلز۔ ''ہندوستان دی پہلی جنگ آزادی'' (پنجابی).....
پردیسی ساہت پرکاشن۔ دلی، 1963
مرزا اسداللہ خان غالب: ''دستنبو'' (فارسی) مجلس یادگار غالب.....پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور 1969
پنجاب گورنمنٹ: ''میوٹنی ریکارڈز'' (انگریزی) رپورٹس۔ حصہ اول.....لاہور۔ 1911
سرلیپل گرفن: ''پنجاب چیفس'' (انگریزی) جلد دوم۔ لاہور 1890
بلال زبیری: ''جھنگ کی لوک کہانیاں'' (اردو) جھنگ، 1974
ڈاکٹر صلاح الدین ملک: ''دی پنجاب اینڈ دی انڈین میوٹنی'' (انگریزی).....غیر مطبوعہ مقالہ۔ سٹیٹ یونیورسٹی آف نیویارک۔

رسائل:

ماہنامہ ''افکار'' کراچی۔نمبر دستنبو۔اردو ترجمہ
ہفت روزہ ''لیل ونہار'' لاہور، 12 مئی 1957ء ''پنجاب اور جنگ آزادی''
ماہنامہ ''پنجابی ادب'' لاہور، اگست 1969
محمد آصف خان۔ ''ساڈی دیس پیاردی روایت''
ماہنامہ ''راجپوت''۔فروری، مارچ اور اپریل 1974 کے شمارے

زبانی روایات

احمد ماچھی۔گوگیرہ (ساہیوال) احمد خان کھرل ڈے۔لاہور۔ڈھولا
مانہمند ولد امیر نور محری۔ماچھی والا (جھنگ؟)۔ڈھولا
آزاد کوثری۔تقریر۔احمد خان کھرل ڈے۔لاہور
اے ڈی اعجاز۔تقریر۔احمد خان کھرل ڈے۔لاہور
شارب انصار۔ ''کال بلیندی''۔ڈھولے
ماچھیا۔چیچہ وطنی

1: قاصد۔سراغرساں
2: جھامرا، احمد کھرل کا گاؤں
3: جنجوعہ خاندان کے چار بھائی، احمد کھرل کے ساتھی
4: چھب۔سیم کا جنگل۔جو ''یارے آلے'' کے نام سے مشہور ہے
5: تھاہر۔جگہ
6: جگہ کا نام
7: نندن۔لندن
8: دوناریں۔برکلے کی دو بیویاں
9: کچاہری۔کچہری
10: ڈھکاں۔قیدی
11: لاہم۔طرف
12: شرگد۔شاگرد
13: چھیانیاں روپیہ۔روپے میں سے چھ آنے

۱۸۵۷ء کی عظیم بغاوت: کچھ افسردہ حقائق

گربچن چندن

۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء کی صدی جدید ہندوستان کی سیاسی تاریخ کی نہایت اہم صدی ہے۔ اس کی حدود میں ایک غیر معمولی لچک تھی جس سے اس کے عین پچھلے قریب پچاس سال بھی اس کا ترکیبی حصہ بن گئے۔

اٹھارہویں صدی کے پہلے ہی دہے میں ۱۷۰۷ء میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ ہی جلیل القدر مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہوئی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو پے بہ پے عالم گیر کے کمزور اور آسائش پسند گیارہ جانشین تھے اور دوسری وجہ اس سے بھی مہلک تھی۔ یہ عالم گیر کے پردادا شہنشاہ جہانگیر کے لائسنس یافتہ فرنگی تجارتی ٹولے کا عمل و معمول تھا جو اپنا مفاد طرح طرح کے فتنوں کی پرورش میں ڈھونڈتا تھا۔ یہ ٹولہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ملک میں قریب ایک سو سال سے کاروبار کر رہا تھا لیکن عالم گیر کی وفات کے بعد اس کمپنی نے تجارت کے پردے میں ہندوستان کی دولت کی لوٹ کھسوٹ بڑھ چڑھ کر کی اور ساتھ ہی اس کے معاشرے میں موقع بہ موقع مداخلت کرتے ہوئے اس کی تہذیبی وراثت اور تمدنی حیثیت کی بیخ کنی کی۔ ۱۷۶۱ء تا ۱۷۸۶ء کی مدت میں جب ہندوستان اندرونی قضیوں میں الجھا ہوا تھا اور مغل سلطنت تنزل پر تھی، اس تاجر کمپنی نے اپنی سیاسی چالوں سے ایک علاقائی طاقت کی حیثیت حاصل کر لی۔ اس سے عین قبل ۱۷۵۷ء میں اس نے بنگال کے نوجوان نواب سراج الدولہ کے سپہ سالار میر قاسم سے ساز باز کر کے کلکتہ کے نزدیک پلاسی کی جنگ جیت کر صوبہ بنگال کے راستے مستبدانہ ہندوستان کی باگ پکڑ لی تھی۔ فرنگی کے یہی طور اطوار دیکھتے ہوئے مصحفی (۱۸۲۵ء۔۱۷۴۷) نے کہا تھا:

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

اس ایک شعر کے اندر ایک سیاسی مواد اور مفہوم کا ایک وسیع دریا موجزن ہے اور ۱۸۵۷ء کی عظیم بغاوت سے بیسیوں سال پہلے کے عوامی شعور کا جوہر روشن ہے۔ جو لوگ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی جڑ اور زمین دریافت کرنا چاہتے ہیں انہیں اردو سماج کی ان بنیادوں کو گرہ باندھنا ہوگا۔ اسی

زمین سے وہ تصور پیدا ہوا جو رفتہ رفتہ تحریک آزادی کی شکل اختیار کر گیا اور اسی تحریک سے وہ دن نصیب ہوا جب ۱۸۵۷ء کا نامبارک معتوب فرنگی اس ملک سے رخصت ہو گیا۔ اس اخراج کے پیچھے نوے سال تک متحرک رہنے والا وہ قومی احتجاج تھا جو اولاً فارسی قلمی صحافت کی وقائع نگاری اور اردو شاعری اور صحافت کی گود میں پلا، زبان پائی اور باتدبیر ہوا۔ یہ رویہ کوئی ناگہاں نزول یا کسی خوف یا ہول کا آثار نہیں تھا بلکہ جیسا کہ مصحفی کے شعر سے ظاہر ہے، بیسیوں سال سے ملک کے لوگوں کے دل و دماغ میں سلگ رہا تھا۔ اس سلگاؤ کی زد میں ''کافر فرنگی'' کی کئی تہذیب دشمن اور امن سوز تدبیریں تھیں۔

دراصل فرنگی کے طور طریقوں پر اردو شاعر ۱۸۵۷ء سے قبل ہی شاکی اور نالہ کش تھا:

کیونکر نہ دل غم زدہ فریاد کرے
جب ملک کو یوں غنیم برباد کرے
مانگو یہ دعا کہ پھر خداوندِ کریم
اجڑی ہوئی سلطنت کو آباد کرے

(میر انیس، ۱۸۷۴ء۔۱۸۰۳ء)

یہ اجڑی ہوئی سلطنت، اودھ کی ریاست بھی تھی اور ہندوستان کی دھرتی بھی۔ اس میں اردو شاعر تو فرق نہیں سمجھتا تھا لیکن فرنگی کا غبار آلود ذہن اسے یا تو سمجھا ہی نہیں یا خرابی بسیار ہونے تک سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس کی سمجھ بوجھ کو اپنی تشکیل کے کئی مرحلوں سے گزرنا پڑا۔

۱۸۵۷ء کا مرحلہ بھی ایک ایسا ہی عرصہ تھا۔ بظاہر اس کی شروعات فرنگی کی اپنی ہندوستانی افواج میں ایک نئے کارتوس کے اجرا سے ہوئی جس پر گائے اور سور کی چربی چڑھائی گئی تھی اور جسے کارگر کرنے کے لیے دانت سے چھیلنا پڑتا تھا۔ اس پلید چیز کے خلاف ہندوستانی افواج نے فوراً احتجاج کیا۔ سُر گباشی و نایک دامودر ساورکر (۱۹۶۶ء۔۱۸۸۳) نے اپنی تحقیقی کتاب 'دی انڈین وار آف انڈیپنڈنس' (The Indian War of Independence) میں، جو ۱۹۰۹ء میں انگلینڈ میں چھپی، کہا ہے کہ اس نجس کارتوس کی ابتدا فروری ۱۸۵۷ء میں کلکتہ میں بیرک پور کے ایک ہندوستانی دستے سے کی گئی تھی جہاں اس کے اولین رکن منگل پانڈے نے فوراً اس کے خلاف احتجاج کیا۔ کمپنی کے حکام کو معلوم تھا کہ اس کا احتجاج بجا ہے لیکن انہوں نے

معاملے کی تفتیش کا اعلان کرنے کی بجائے منگل پانڈے کو حکم عدولی کا مرتکب قرار دیا۔ اس پر مقدمہ چلایا گیا اور اسے پھانسی کی سزا دی گئی لیکن انگریز کے ہاتھوں مرنے سے قبل دلاور منگل پانڈے نے خودکشی کر لی اور اپنی بندوق سے از خود جام شہادت پی لیا۔

اس سانحے کی خبر اندر ہی اندر میرٹھ پہنچی جہاں اس کارتوس کا استعمال شروع ہونے کی خبر نکل چکی تھی۔ چنانچہ وہاں بھی فرنگی نے بے سوچے سمجھے اسے برتنے کے لیے سپاہ کو مہیا کر دیا۔ میرٹھ کی سپاہ نے اجتماعی طور پر انکار کر دیا۔ حکام نے اس کے استعمال پر اصرار کیا اور انکار کرنے والوں کے خلاف کارروائی کرنے کی دھمکی دی۔

اس ضد کو دیکھتے ہی ساری سپاہ نے اپنی مجلس کی اور فوراً اپنے مغل حکمراں بہادر شاہ کے پاس دہلی جانے کا فیصلہ کیا۔ اس سپاہ میں ہندو مسلمان دونوں تھے اور انہوں نے یہ فیصلہ متحدہ طور پر کیا۔ اگر کسی حکومت کی ناپسندیدگی کا ثبوت اس کے عوام یعنی جمہور کے اجتماعی اور فطری اظہار میں ہو سکتا ہے تو یہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو دہلی کی سڑکوں پر سورج کی روشنی میں فراہم کر دیا گیا تھا۔ مصلحت پسند اور حکمت آشنا فرنگی نے اسے دیکھا ان دیکھا کر دیا۔

وقت کے ذہین ترین صحافی مولوی محمد باقر نے، جو بہادر شاہ ظفر کے وفادار معاون تھے، اس منظر کی رپورٹنگ اپنے ہفت روزہ ''دہلی اردو اخبار'' میں کی۔ بغاوت کے فوراً بعد کا ۱۷ مئی ۱۸۵۷ء کے دہلی اردو اخبار کا شمارہ اندر باہر بغاوت کی خبروں سے بھرا ہوا تھا۔ گویا ظہور بغاوت ایڈیشن تھا۔

یہ زمانہ شناس صحافی، جو اپنا نام صیغۂ راز میں رکھنا بہتر سمجھتا تھا، دل و جان سے فرنگی اقتدار کا مخالف اور اقتدار کے انسداد کے لیے مغل حکمران کی ہندو مسلم اتحاد پالیسی کا حامی اور معاون تھا۔ وہ اپنے وقت کے نئے مسلم ذہن کا ذی وقار رکن تھا۔ ایک نامی مجتہد باپ کا بیٹا تھا اور معزز شیعہ دینی عالم تھا۔ ملکی معاملات اور سیاست میں اچھی دلچسپی لیتا تھا اور اپنے گزشتہ کیریئر اور تجربات کی وجہ سے گرد و پیش سے باخبر تھا۔

اسی زمانے میں فرنگی ملک کے مختلف حصوں میں اپنے سیاسی استحکام اور سلطنت سازی کے اقدام کر رہا تھا۔ کمپنی کے گورنر بے باکانہ اپنے وطن کی سیاسی حیثیت بڑھا رہے تھے۔ کمپنی کے اولین گورنر لارڈ کلائیو کی ڈپلومیسی کے بعد ایک اور گورنر لارڈ ویلزلی نے کئی کمزور ہندوستانی ریاستوں کو ''مشترکہ مدد کے نظام'' (Subsidiary System) کے آئینی عذر سے، کمپنی کی

پناہ میں لے لیا تھا اور پھر ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے عین قبل لارڈ ڈلہوزی (۱۸۵۶ء۔۱۸۴۸ء) نے خود ساختہ نئے فارمولے "Doctrine of Lapse" کے نام پر کئی ایسی ریاستوں کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا جن کے حکمراں اولاد نرینہ کے بغیر وفات پا گئے تھے۔ ان کی باضابطہ گود میں لی ہوئی اولادوں کو بیک جنبش قلم رد کر دیا گیا حالانکہ ملک کی اکثریت کے ہندو مذہب اور دستور میں زمانہ قدیم سے یہ ایک صائب اور جائز رواج تھا۔ چنانچہ اس جابرانہ نظریے (Doctrine) کے تحت ۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۴ء کے چھ سال کی مختصر مدت میں ستارہ (۱۸۴۸ء)، جیت پور (۱۸۵۰ء)، سنبھل پور (۱۸۵۰ء)، بگھاٹ (۱۸۵۰ء)، اودے پور (۱۸۵۲ء)، جھانسی (۱۸۵۳ء) اور ناگپور (۱۸۵۴ء) کی ریاستوں کو قزاقوں کی طرح اپنے گھٹے میں باندھ لیا۔ اس چھینا جھپٹ کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ ان ریاستوں کے راجے مہاراجے اور ان کی رعایا کے ان گنت لوگ برطانوی نظام کے خلاف ہو گئے۔

ساورکر نے لندن کی انڈیا آفس لائبریری میں اپنی طویل تحقیق کے بعد اپنی متذکرہ کتاب میں لکھا ہے کہ کمپنی کی اس زبردستی کے جواب میں بٹھور (پونہ) کے مرہٹہ پیشوا نانا صاحب نے پورے ملک میں برطانیہ کے خلاف فوجی انقلاب برپا کرنے کی منصوبہ بندی کی جس کی تیاری وہ بڑی رازداری سے قریب ۱۸۵۴ء سے کر رہے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ انگریزوں کے صدر مقام لندن اور چند دوسرے ممالک میں اپنے احباب اور نمائندے متعین کیے۔ یہ نمائندے دہلی اور شمالی ہند بالخصوص کانپور میں بھی فعال رہے۔ کانپور میں نانا صاحب اپنے ذرائع و وسائل کے ساتھ خود ہی آ گئے تھے اور ۶ جون ۱۸۵۷ء کو وہاں اپنا اقتدار قائم کر دیا تھا۔ کانپور کے لوگوں نے ان کا استقبال کیا تھا۔ (Sunday Express New Delhi 15.4.07-p/11) گویا ۱۸۵۷ء میں برطانیہ کے خلاف بیک وقت دو یک مقصد بغاوتیں پنپ رہی تھیں۔ البتہ کیفیت یہ بھی تھی کہ نانا صاحب کی جانب اپنی ریاستوں، جاگیروں اور پنشنوں کے مفاد کا اُنس بھی، حب الوطنی کے سایے تلے، دھڑک رہا تھا لیکن میرٹھ اور دہلی کی تحریک فرنگی ستم گاری کے ایک تازہ ثبوت پر بھڑک اُٹھی تھی۔ اس کے پیچھے، جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے، ایک عرصہ دراز سے جمع ہونے والے کئی اسباب تھے جو مختلف النوع شعبوں پر محیط تھے۔ بہرحال اس کا فوری سبب گائے اور خنزیر کی چربی چڑھا، نیا کارتوس تھا جو ہندوستانی فوجیوں کو

لازمی استعمال کے لیے دیا گیا اور انہوں نے اس کے برتنے سے انکار کر دیا۔ اس انکار کا واحد مقصد ملک سے ناگوار فرنگی کا اخراج تھا۔

نانا صاحب کی تحریک کا بھی مرکزی مقصد فرنگی اقتدار سے نجات حاصل کرنا تھا۔ اس انقلابی تحریک کے لیے انہوں نے مستعد ہم خیالوں کو متحد کیا۔ ان کے دستے میں ملک کے مختلف حصوں کے اکابر تھے۔ خود نانا صاحب کے براہ راست معاونوں میں ان کے دو برادر، بابو صاحب اور بالا صاحب، منہ بولی بہن جھانسی کی رانی لکشمی بائی، ان کے پرانے دوست تانتیا توپے، جو ایک فوجی ماہر تھے، ہم شہر رفیق رنگو باپو جی اور ان کے دربار کے افسر اعلیٰ عظیم اللہ خاں تھے۔ ان کے ساتھ مقتدر ہم مشرب روہیل کھنڈ کے نواب خان بہادر خاں، جگدیش پور (بہار) کے راجپوت سردار کمار سنگھ، روہیل کھنڈ کے نواح کے بارسوخ مجاہد مولوی احمد شاہ اور بیرک پور (کلکتہ) کے گرم جوش رضا کار وزیر علی نقی خاں تھے۔

انقلاب کے ان قومی دلاوروں کے دوسری طرف بہادر شاہ دوئم ظفر، ان کی بیگم زینت محل، بہادر شاہ کے وفادار عالم صحافی مولوی محمد باقر اور ان کے ذہین بیٹے محمد حسین آزاد اور اودھ کی بیگم حضرت محل ایسے وقف کردار تھے۔

ان کے علاوہ ان گنت قلمی وقائع نگار تھے جنہوں نے چربی ملے ناپاک کارتوسوں کے نفاذ سے بہت پہلے فرنگی کے سیاسی کرتوتوں کو طشت از بام کیا اور وہ فضا تیار کی جس سے بے شمار عوام ملک کی آزادی اور حفاظت کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔

دراصل اس وقت سارا ملک بغاوت کو ایک کار نیک تسلیم کر رہا تھا اور ملک پر نثار ہونے کے مواقع ڈھونڈ رہا تھا۔ گویا شہادت کے ارادت مندوں کا ایک رواں دواں جلوس تھا جس کے ارکان فرنگی کے اخراج کی تدبیر میں ایک دوسرے کو مات دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ اسے اپنے سماج کے تشخص کی آزمائش کا مرحلہ تصور کر رہے تھے۔ ان کی صبر آزما تحریک اب نقطہ کمال پر پہنچ گئی تھی۔

افسوس اور حیرت ہے کہ پچھلے ۱۵۰ سال کے طویل عرصے میں ہمارے ادیب، شعرا، محقق اور اساطیر انہیں اپنی توجہ اور نگارش کا موضوع خاص نہیں بنا سکے۔ اردو ادب کے عظیم سرمائے میں ہمیں ان پر کوئی ایپک، کوئی ڈرامہ یا کوئی ادبی شاہکار نہیں ملتا۔

حقیقتاً یہ ایک غیر مساوی جنگ تھی جس میں ایک فریق سرکاری مرتبے اور بے پناہ قوت کا حامل تھا۔ مزید ہر قسم کے ساز و سامان اور ایجادات حرب کی رسد پر قدرت رکھتا تھا اور دوسرا فریق فریادی اور انصاف چاہنے والا تھا اور حق اور عدل کے لیے اپنے مختصر ذرائع ہی سے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اس کی سب سے بڑی طاقت ملک کی خدمت کا جذبہ تھی جسے اس نے بڑی جگر داری سے نذر میدان کیا۔ اپنے ملک کے لیے اس کی یہ قربانی آنے والی نسلوں کا چراغ راہ تھی۔ اہل نظر کے لیے یہ ہندوستان کے حصول آزادی کی ابدی میراث ہے۔

ان میں شمالی ہند کی نوزائیدہ اردو صحافت، جو فارسی کے پیش رو قلمی وقائع نگاروں کی بدولت، وقت سے پہلے بالغ اور قابل قربانی ہوئی تھی، کے اولین مدیر مولوی محمد باقر بھی تھے۔ انہوں نے جب ''دہلی اردو اخبار'' نکالا تو ان کی عمر قریب ۵۷ سال تھی۔

مولوی محمد باقر دلی کالج میں، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی دلچسپی سے مشرقی و مغربی علوم کی تدریس کے لیے ۱۸۲۵ء میں شروع ہوا تھا اور علم و آگہی کے جدید رجحانات کا چشمہ تھا، پہلے طالب علم اور پھر اپنی ذہانت کی بدولت مدرس رہے۔ پھر کلکٹری کے محکمہ میں، جو اس زمانے میں بڑے اکرام کی بات تھی، تحصیلدار اور سپرنٹنڈنٹ کے عہدوں پر فائز رہے۔ اس دفتر کے حالات بالخصوص ہندوستانی ملازموں کے مشاہرے سے وہ بہت ناخوش ہوئے۔ چنانچہ از خود سرکاری ملازمت سے علیحدہ ہو گئے۔ (امداد صابری، ایضاً صفحہ ۲۰۳)

وہ انگریز کی ملازمت کے اکثر طور طریقوں سے بیزار تھے۔ انہیں حکومت کے ہم مذہب عیسائیوں کے مذہبی پروپیگنڈے اور تبلیغی حوصلوں سے بہت کوفت تھی۔ انہوں نے عوامی زندگی کے روزمرہ میں اور دہلی کالج کے ایک ناظم مسٹر ٹیلر کی، جو دہلی کا صدر پادری تھا، عیسائیت کی اشاعت کا شوخ منظر دیکھا اور ان حالات کی اصلاح کی طرف راغب ہوئے۔

۱۸۳۴ء میں مولوی محمد باقر نے دہلی کالج سے اس کا ایک فاضل لیتھو پریس خریدا اور پہلے مطبع جعفریہ اور پھر اثنا عشری کے نام سے اس میں طباعت کا کام کیا۔ پھر جب ۱۸۳۶ء میں گورنر چارلس مٹکاف کے ۱۸۳۶ء کے پریس ایکٹ کے تحت نئے اخبار نکالنے کی آزادی ملی تو ۱۸۳۷ء میں انہوں نے ''دہلی اخبار'' کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا جو اردو کا لیتھو اساس اولین مطبوعہ اخبار ہونے کی حیثیت سے اپنے وقت کا عجوبہ عظیم تھا۔ اسے اس کھوجی سماج میں صرف

دیکھنا ہی ایک شوق مقبول تھا۔ اس کا ناشر خوب سے خوب تر کی تلاش کرنے والا تھا۔ چنانچہ اخبار کے نام میں دو تین بار تبدیلی ہوئی لیکن زیادہ تر اس کا نام ''دہلی اردو اخبار'' رہا۔ اس نام میں لفظ اردو کا اضافہ سماج میں زبان اردو سے لوگ باگ کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کا مظہر تھا۔ مولوی محمد باقر دینی تربیت کے پروردہ اور شیعی عقائد کے امام تھے۔ ساتھ ہی زمانے، جس کے نئے پرانے رنگ کا انہیں شخصی تجربہ تھا، کا اچھا شعور رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے دینی عقیدوں کے فروغ کے لیے بعد میں ''مظہر الحق'' کے نام سے ایک الگ اخبار جاری کیا لیکن ''دہلی اردو اخبار'' اس تاریخی شہر کے روایتی معاشرے کے نئے موضوعات اور نئے خیالات، بالخصوص سیاسی نکات میں دلچسپی لینے والا مخصوص اخبار رہا۔

عصری ذوق اور لطف کے رجحان کی خاطر اس اخبار کا ادبی پہلو بھی دلچسپ اور دلفریب تھا۔ اس میں شیخ ابراہیم ذوق، بہادر شاہ ظفر، مرزا غالب، حافظ غلام رسول، مرزا محمد علی بخت، مرزا حیدر شکوہ، مرزا جیون اور مرزا نور الدین کے کلام کے علاوہ دہلی کے ادبی گروہوں، بالخصوص استاد ذوق اور مرزا غالب کی نوک جھونک کی خبریں چھپتی رہتی تھیں لیکن اس کا سیاسی پہلو، خاص طور پر جاندار اور توانا تھا۔ مولوی محمد باقر انگریز کی غلامی اور خاص طور پر مغل حکمران بہادر شاہ دوئم کے تنزل پر بڑے برہم تھے اور فرنگی سے ملک کی آزادی کے بڑے شدت سے آرزومند تھے۔

موصوف صحافت میں قدروں کے فروغ کے حامی تھے۔ وہ اپنی ملازمت کے دوران کلکٹر کے دفتر کا کام کاج دیکھ چکے تھے لہذا وہ اس کی خرابیوں اور بدعتوں کی اصلاح کے خواہاں تھے۔ ان کے اخبار میں جیلوں کے دگرگوں حالات، سرکاری حکام اور پولیس کی زیادتیوں، اقتصادی بدحالی، جرائم کے ارتکاب اور عوامی فلاح کی خبریں عام چھپتی رہیں۔ اداریے کا ان دنوں رواج نہیں تھا لیکن خبروں کی ترتیب و تدوین اس طرح کی جاتی تھی کہ اصلاح کی ضرورت نمایاں رہے۔ مزید ان خبروں میں انسان دوستی اور ملک کی بھلائی کی شعاعیں بھی کوندتی تھیں۔

مولوی محمد باقر کے ہم پیشہ احباب میں ہندو، مسلمان، عیسائی سب تھے۔ ان میں دہلی کالج کے معلم اور صحافی ماسٹر رام چندر (مدیر: فوائد الناظرین، خیر خواہ ہند اور محب ہند) قانون دان اور صحافی پنڈت دیال (ناشر و ایڈیٹر ''فوائد الشائقین'') اور دہلی کالج کے ہیڈ ماسٹر اور شہر کے ممتاز رکن مسٹر ٹیلر شامل تھے۔ ان میں سے دونوں مدیروں کے اخبارات محمد باقر کے مطبع ہی میں چھپتے

رہے۔ ماسٹر رام چندر اس دور کے ایک ممتاز عالم، مصنف اور دانشور تھے۔ ریاضی پر ان کی ایک انگریزی کتاب کی شہرت لندن تک پہنچ گئی تھی۔ انہوں نے اپنے اخباروں میں ہندوستانی قومیت کے تصور پر خیال آرائی کی۔ یہ نظریہ راجا پرجا اور سلطان و رعایا کے مروج نظام فکر سے جوجھنے والے اس سماج میں ایک نئی بات تھا۔ ماسٹر رام چندر نے قوم کی ترقی اور سربلندی کو اپنی صحافت کے بنیادی مقاصد میں شامل کیا۔ اگر چہ اپنی ماہیت میں یہ کوئی نیا اصول نہیں تھا لیکن اس تشکیلی دور کی بنیادی ضرورت کی خاطر اور معاملات ملک کو بارآور بنانے کے لیے ماسٹر رام چندر نے اس کی اہمیت کو ایک اجتہادانہ رخ دیا۔ ہندوستان کی نئی سیاست کے تناظر میں یہ نظریہ سب سے پہلے ایک اردو مدیر ہی کے قلم سے نکلا۔ مولوی محمد باقر کی جان عزیز کی قربانی سے بھی قریب دس سال قبل یہ پیش کش اردو صحافت ہی نے کی۔ ۱۸۴۵ء میں اپنے نئے رسالہ ''خیر خواہ ہند'' کے افتتاحی شمارے کے سرورق پر ماسٹر رام چندر نے اسے اپنی صحافت کا ایک بنیادی مقصد قرار دیا۔ (بحوالہ خواجہ احمد فاروقی، مقدمہ: ''ماسٹر رام چندر، ایک مانوگراف''، صفحہ ۴۸، از پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، دہلی یونیورسٹی)۔

حیف صد حیف کہ ہمارے آزادی کے مورخوں نے اردو صحافت کی اس تاریخی دستاویز کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد اس کے مشتبہین پر کمپنی سرکار کے بے احتیاط جبر واستبداد پر ماسٹر رام چندر نے نومسیحی کی حیثیت سے گہرا احتجاج کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ عیسائیت کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ وہ خود بغاوت سے قبل عیسائیت قبول کر چکے تھے اور مغرب کے نئے تمدن کے مداح تھے۔

مولوی محمد باقر کی صحافت میں بھی اس رفیق عصر کے متذکرہ خیالات کا اثر ہویدا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں جو روز اول ہی سے فرنگی اخراج کے لیے عوامی عزم کی حامل ''جنگ وطن'' تھی، انہوں نے اپنے اخبار کو ایک مجاہد وطن بنا دیا تھا۔ بغاوت کے آغاز کی رپورٹنگ (اخبار کا ۱۷ مئی ۱۸۵۷ء کا شمارہ) اس کے مہتمم مولوی محمد باقر کی آنکھوں دیکھی روداد تھی جو ایک کیمرے کی تصویر کی طرح ہو بہو تھی۔ تاریخ آزادی کے سنجیدہ مورخین کے لیے یہ ایک نہایت نادر دستاویز ہے لیکن افسوس کہ واقعات کے ان نام نہاد حسابیوں نے اسے حاصل کرنے کی غالباً کوشش ہی نہیں کی۔ اپنی تحریروں کے لیے ان کا واقعات نگاری کا دعویٰ سراسر چراغ تلے اندھیرا کے مصداق ہے۔

اس باب میں برطانوی مورخوں کی تحریریں اندھیرے کی طرفدار ہیں۔ یہ مورخ اس بغاوت یعنی فرنگی حکمران کے غلط احکام کی نافرمانی کو ایک ''غدر'' اور چند سپاہیوں کی ایک وقتی شورش کہہ کر فارغ ہو جاتے ہیں۔ ''دہلی اردو اخبار'' سے، جو واقعات کا عینی شاہد تھا، سامنے آنے والے حقائق مظہر ہیں کہ کمپنی سرکار اس مبینہ وقتی شورش سے اس قدر بوکھلا گئی تھی کہ اس نے اسے توڑنے کے لیے ایک مذمتی اور دھمکی آمیز اشتہار چھاپا اور اسے جامع مسجد کے دروازوں اور کئی اور نمایاں مقامات پر چسپاں کروایا۔ یہ اوائل جولائی ۱۸۵۷ء کی بات ہے جب ہندوستان میں کوئی سیاسی جماعت یا قیادت لوگوں کے کسی گروہ کو سرکشی کی کوئی تربیت نہیں دے رہی تھی۔ لوگ خود ہی اپنے ملک کے ناموس کے لیے میدان میں آ گئے تھے۔ اغلب ہے کہ اس اجتماع کے خواندہ افراد اردو اخباروں کے قارئین تھے جو سب کو پڑھ پڑھ کر سناتے رہے ہوں گے۔ چنانچہ فعال ''دہلی اردو اخبار'' اپنے راقم مولوی محمد باقر کی بدولت ایک عوامی نقیب اور شارح بن گیا تھا۔ اس اخبار کے راقم نے اس دھمکی آمیز اشتہار کا متن بھی چھاپا اور اس کا دندان شکن جواب بھی۔ اس اشتہار کو غیر ملکی مورخوں کا نظر انداز کرنا تو قابل فہم ہے لیکن حیرت ہے کہ ہمارے مورخوں نے بھی اس پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ اشتہار کا لب و لہجہ نہایت ترش اور بھدا تھا اور اس وقت کی فرنگی حکومت کی ذہنی حالت، نفسیات اور بدحواسی کا مظہر تھا۔ اس میں نہ صرف کارتوسوں کی چربی کے بارے میں افسانہ طرازی کی گئی بلکہ کئی دیگر حقائق بھی مسخ کیے گئے۔ پھر مسلمانوں کے نظریہ جہاد، دین اسلام، شریعت اور خوک کے بارے میں حجتیں اور مفسدہ پردازی کی گئی۔ اس اشتہار کی زبان بھی غیریت کی مظہر تھی۔ اس کا متن حسب ذیل تھا:

> ''آگاہ ہو کہ رعایا خاص ودیعت خدا ہے اور حاکم لوگ ان پر بہ منزلہ شبان کے ہیں۔ جس دن سے دہلی میں ہمارے سرکش نوکروں نے از راہ تمردی نمک حرامی کے گستاخیاں کر کر حکام معہ ان کے زن اور فرزندوں کے از راہِ ستم بے دریغ تہہ تیغ کیا اور شہر کو ملجا اپنا بنایا اور رعیت پر ظلم روا رکھا اور ان کا مال بہ معیت اوباشان شہر دستبرد کیا۔ بادشاہ کو بھی قید کیا چنانچہ بادشاہ کی برابر ان ستم شعاروں کے ظلم سے شکایت سنی گئی۔ اب ہم کو ان کے تنبیہ دینی فرض ہے جو یہاں پر اخیام (اخیار) ذوا حتشام ہمارے قائم

ہوئے، دریافت ہوا کہ بعضے جاہل ناعاقبت اندیش کے ہمراہ اس فوج سرکش کی غارت گری میں شریک الحال تھے۔ بنام جہاد کے آمادہ فساد ہوئے اور چند بار بہ معیت اون کے آ کر جدال وقتال میں شریک ہو کر اپنے تئیں ہلاکت میں ڈالا۔ پس ہم کو ان لوگوں کو بلکہ گروہ مسلمین کو اطلاع اس امر کی (دینا) پر ضرور ہے۔ اول تو مسلمان با ایمانوں کو بموجب ان کی شرع کے واجب تھا کہ تحقیق امر بالانزاع کے شواہد عادل کرتے یا بادشاہ صاحب اپنے سامنے اوس کی کیفیت۔ اگر ہماری نسبت میں کچھ زیادتی ثابت ہوتی اس وقت حکم ہمارے قتل کا اور قتال کا بنام جہاد کرتے۔ اب ہم علماء دین سے مسئلہ ارکان جہاد وشرائط اوس کے دریافت کرتے ہیں اور بہ حلف انجیل شریف کے کہتے ہیں کہ یہاں سے کلکتہ تک کسی حاکم کی رائے یہ نہیں ہوئی کہ سپاہ مسلمین کو کارتوس ساختہ چربی خوک اور آردمشمولہ استخوان ہائے خوک واسطے بگاڑنے ان کے دین کے دیویں.....اور جو کوئی جاہل از راہ جہل مرکب نے یہ کہی کہ بگاڑنا دین کا منظور تھا، اس حالت میں یہ سوال ہے کہ آیا لحم خوک کھانے سے مبتلائے گناہ کبیرہ ہوتا ہے یا بحر دخورش کے خارج از اسلام ہو جاتا ہے اور جو کوئی حاکم جہاد حکم ارتکاب مناہی کرے اس وقت پر اگر تاب مقابلہ کی رکھتا ہو تب تو ارتکاب اس امر سے انکار کر سکتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اون کے قتل مع زن و بچہ کرے اور جو طاقت تقابل کی نہ رکھے اس وقت پر ہجرت کرے اور اب یہ بھی بگوش دل سنا چاہیے کہ سپاہ مسلمین کو سپاہ ہنود نے کہ ناقص العقل ہیں اغوا کیا۔ نفس الامر میں کارتوس مشمولہ چربی گاؤ وغیرہ جانوران حلال بخیال اس کے سرکار کو مہم روس وایران پیش تھی اور اس ضلع میں برف باری ہوتی تھی جب ارادہ اوس کی تقسیم کا کیا تب قوم ہنود نے یہ ڈھکوسلہ باندھا کہ ہم کو کارتوس چربی گاؤ دیا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کو چربی خوک کی۔ فرقہ سپاہ جو ناعاقبت اندیش ہوتی ہے، سرکشی پیش کی اور بلوہ کیا اور

رعیت کو بھی بہکایا۔ پس اہل شہر تم آگاہ ہو کہ اول تو مقصود سزا وہی سپاہ ہنود کی ہے اور جو ان کی معیت وحمایت کریں گے اون کے تئیں بھی سزا دی جائے گی۔ تم کو چاہیے کہ بموجب حکم شرع کے ہمارے شریک الحال ہو کر اہل ہنود کو قتل کرو۔ ورنہ یہ کہ ہم پر بلا تحقیق اور بلا امام کے آمادہ بہ پیکار ہو فقط۔ یہاں تمام ہوا مضمون اشتہار کا۔''

اشتہار کے اختتامی حصے میں کمپنی کی اشتعال پروری اور شر انگریزی عیاں ہے۔ اس میں بغاوت کے اسباب میں اس کی پالیسی اور اپنی ''رعایا'' سے سلوک کی حقیقت بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ آج آزادی کے اس اولین عوامی اور اجتماعی معرکے کی ۱۵۰ ویں سالگرہ منانے والوں کو اس حقیقت کا خاطر خواہ نوٹس لینا چاہیے جو اتفاق سے اردو زبان کے ریکارڈ ہی میں مستور ہے۔ مولوی محمد باقر کمپنی کی خصلت کے شاہد اور شناور تھے۔ انہوں نے اس کے اشتہار کا جواب فوراً دیا اور دونوں امور کو ایک ہی شمارے میں کیا۔ ان کا جواب طویل تھا۔ یہاں اس کے اہم حصے پیش کیے جارہے ہیں۔

موصوف نے کہا کہ انہوں (کمپنی حکومت) نے خود کو رعایا کا محافظ اور امانت دار کہا ہے لہذا ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ امانت دار کی امانت (ملک ہندوستان) بہ جنس ویسی ہی (جیسی کہ لی تھی) بلا تصرف وتغیر واپس کردیں۔ جن لوگوں کو انہوں نے کوئی طمع دے کر دین سے بے دین کیا اور ان کا خانہ دھرم وایمان ویران کیا وہ سب اپنے دین اور دھرم میں بحال ہوں۔ جن ہزار ہا رعایا کی جاگیریں ضبط کیں اور انہیں نان وشبینہ سے محتاج کیا، انہیں بحال کرے۔ انہوں نے (اہل کمپنی) لکھا ہے کہ حضور بادشاہ سلامت (بہادر شاہ دوم) سرکش سپاہ کے ہاتھوں مجبور اور مقید ہیں لیکن خود دن رات شاہ سلطنت پر (محل اور قلعے پر) گولے برسائے ہیں ان کی نقل وحرکت اور مہمانوں سے ملنے یا ان کے بلانے پر سخت پابندیاں ہیں۔ چنانچہ شاہ سلامت اور رعایا بھی کمپنی کے اقدام کی وجہ سے انواع واقسام کی اذیتوں میں مبتلا ہیں۔

مولوی محمد باقر کا جواب ہوشربا انکشافات کی کان تھا۔ یہ اس قدر مسکت تھا کہ کمپنی نے دوسرا دفاعی اشتہار لگانے کی جرأت نہ کی۔ مولوی محمد باقر نے کمپنی کے حق حکومت کو رد کرتے ہوئے لکھا کہ ان فرنگیوں کو ''شرم نہیں آتی کہ اپنے تئیں حکام اور نوکروں کو سرکش اور نمک حرام لکھتے ہیں۔''

موصوف نے باغیوں کے احتجاج اور معرکے کے مقابل کمپنی کی ناکامی کے حوالے سے کہا:
''باوصفے خود گوروں کی فوج جنگی اور میگزین بھی بہتیرا رکھتے ہوئے اپنے نوکروں کا بال بیکا نہ کرسکی..... سچ ہے جب اقبال جاتا رہتا ہے تو عقل بھی جاتی رہتی ہے۔'' مزید لکھا ''سب پر ظاہر ہے کہ ان کی حکومت بے چراغ ہوگئی۔ اسی (باغی) سپاہ سے یہاں تک کہ مظہر و مصداق ضربت علیہم الذلۃ والمسکنۃ ہوئی کہ کونہ کھدروں میں، روڑے پتھروں میں پہاڑوں کے اور گڑھوں میں چھپے پھرتے ہو.....''

سپاہ کے باہمی اتحاد کا حوالہ دیتے ہوئے مولوی محمد باقر نے لکھا: ''جب سپاہ ایک دل ہوئی سب قابل مقابلہ و مقاتلہ ہوگئے۔''

دین اسلام اور شریعت پر اشتہار کے حملوں کا حوالہ دیتے ہوئے مولوی محمد باقر نے کہا:

''تم نے ہمارے واجبات شرعی کی کسی تعمیل کی طاقت ہم میں کب
چھوڑی تھی کہ آج شرع شریف کا نام زبان پر لاتے ہوئے (تمہیں)
شرم نہ آئی۔''

جواب میں کمپنی کے متعدد ''مظالم'' کے حوالے سے کہا: ''سب سے زیادہ ظلم یہ ہے کہ مکان لعل بنگلہ جس میں سلاطین عظام و اہل خاندان شاہی مدفون تھے (یعنی) مردوں کی قبریں تک اکھاڑ ڈالیں اور کچھ پاس و آداب و اسلام و شفقہ حضور والا کا بھی نہ کیا۔''

چربی آمیز کارتوسوں اور لحم خوک کھانے کے بارے میں اشتہار کے دلائل کا جواب دیتے ہوئے مولوی محمد باقر نے کہا: ''اس سے صاف جھلکتا ہے کہ ان کارتوسوں میں چربی خوک وغیرہ لگی تھی..... لحم خوک کھانے کے بارے میں یہ لوگ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ کون سا گناہ کیسا کبیرہ (ہے) (اور) کون سا کبیرہ فوراً کفر کو پہنچ جاتا ہے۔''

اشتہار ہی کے حوالے سے آخر میں پھر ہندو مسلم اتحاد کا دفاع کرتے ہوئے مولوی محمد باقر نے لکھا: ''خود (اہل کمپنی) لکھتے ہیں کہ چربی گاؤ کی تھی، کوئی پوچھے کہ کیا اس سے دین ہندو کا نہیں بگڑتا..... سپاہ اسلام عین عاقبت اندیشی سے سمجھ گئے کہ آج یہ ظلم ہندو پر ہے (تو) کل ہم پر ہے'' (امداد صابری، ایضاً صفحہ ۱۸۸۔۱۸۱)۔

ان دنوں کوئی باضابطہ خبر رساں ایجنسی موجود نہیں تھی لیکن ہندوستان میں نورس صحافیوں کے

طبقے نے جو زیادہ تر اردو صحافیوں پر مشتمل تھا، آتے ہی وقائع نگاروں کی طرح رجوع کیا۔ قدیم مغل حکمرانوں کے زمانے میں ملک کے حالات کی آگہی کی حکومتی ضرورتوں کے لیے، فارسی وقائع نگاروں کے جو سلسلے قائم ہوئے تھے، ان کے جانشینوں کا ایک طبقہ اب بھی فعال تھا۔ مولوی محمد باقر نے اپنے اثر و رسوخ سے ایسے ذرائع سے رابطہ قائم کیا اور اپنے اخبار میں مختلف درباروں، ریاستوں اور شہروں کی خبریں شائع کیں۔

ماضی قریب میں ان وقائع نگاروں کی کارکردگی کی بڑی شہرت تھی۔ اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد واقع ہونے والے زوال میں جب یہ سلسلہ موقوف ہوا تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہوشیار حکام نے اس کے چند افراد سے اپنا کام لینے کا راستہ بنالیا۔ انہیں یہاں کی ریاستوں اور درباروں سے اپنے روابط بڑھانے کے لیے مختلف علاقوں کے واقف کار اور فارسی داں عملے کی ضرورت تھی۔ اسی ضرورت کی حد تک انہوں نے انہیں اچھی تنخواہوں پر ملازم رکھ لیا۔ یوں وقائع نگاروں کا ایک حصہ جلد ہی برسر روزگار ہو گیا لیکن ان کی زیادہ تعداد آزاد اور حالات کی مشاہد رہی۔ انہوں نے دیکھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بعض افراد یہاں وہاں پوچھ تاچھ کر رہے تھے۔ انہیں معلوم ہوا کہ جنوبی ہند کے کرناٹک کے علاقے میں فرانس اور برطانیہ کی تجارتی کمپنیوں کی رقابت سیاسی راہوں پر چل رہی تھی۔ ان کے پہلو بہ پہلو پرتگال اور ہالینڈ کی کمپنیاں بھی فعال تھیں۔ پرتگالی سب سے پہلے یہاں آئے تھے اور ان کے ایک دلیر ملاح واسکوڈے گاما نے یوروپ سے ہندوستان کا نیا راستہ بھی دریافت کیا تھا۔ لیکن برطانیہ کے سوا باقی سب ممالک کی کمپنیاں کچھ عرصے کے بعد جزوًا یا کلیتًا واپس اپنے وطن چلی گئی تھیں۔ صرف برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی اپنی ہوس کو مزید سہلاتی رہی۔

(D.N.Kundra: A New Text book of History of India-Part-II Gur Das Kapur & Sons (P) Ltd., Delhi, Chandigarh, Chapter IX)

ان تجارتی کمپنیوں کی سیاسی رقابت اورنگ زیب کی وفات کے قریب ۴۰ سال بعد زیادہ نمایاں ہو گئی تھی۔ کشاکش ان کی افواج کی جنگوں تک پہنچ گئی تھی اور سمندر پار بیٹھی ان تجارتی کمپنیوں کی حکومتیں اپنی اپنی فوجوں کی خاطر خواہ پشت پناہی کر رہی تھیں۔ ظاہر ہے کہ وطن پسند وقائع نگار اس طریقہ تجارت کو پسندیدہ تسلیم نہیں کر سکتے تھے۔ مزید وہ بھانپ گئے تھے کہ ایسٹ

انڈیا کمپنی کے ''نباب'' (کمپنی کے نو دولتیے تاجر) کچھ زیادہ ہی ہوا پر اڑ رہے تھے۔ ۱۷۱۷ء میں کمپنی کے ایک ڈاکٹر نے مغل حکمراں فرخ سیر کو ان کی ایک بیماری سے شفا دلوائی تھی۔ اس کے عوض فرخ سیر نے اپنی کرم گستری سے کمپنی کو بنگال کی تجارت کا محصول معاف کر دیا تھا۔ یہ بخشش برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے منتظمین تک محدود تھی لیکن جنوبی ہند میں کرناٹک کی حال کی تین جنگوں میں فرانس پر فتح پانے کے بعد اس کمپنی نے اپنے تکبر میں، جو اس کے کیریکٹر میں بار بار ابھرتا رہا، اس محدود اعانت کو اپنا اختیار کل بنالیا اور بزعم خود اپنی قوم کے کئی نئے تاجروں کو پیشے کے اجازت نامے جاری کر دیے۔ اس سے مغل خزانے کو بہت نقصان پہنچا۔ قیاس اغلب ہے کہ کمپنی حکام کی اس دراز دستی ہی سے آزاد وقائع نگاروں کا ایک دلیر حصہ نجی قلمی اخبار نویسی میں مشغول ہو گیا اور شمالی ہند میں مطبوعہ صحافت کے رواج سے زائد از ایک سو سال قبل، نجی قلمی صحافت کا آغاز ہو گیا۔ گو اس سے صدیوں قبل بھی اس صحافت کے وقائع نگار اپنے سلطان کو کونے کونے کی تشویش اور خطرے کے آثار کے بارے میں مطلع کرتے رہے تھے۔ ان کے مراسلات کو حسب ضابطہ ''اخبار'' ہی کہا جاتا تھا اور یہ امر بھی ہندوستان کے قدیم نظام ملک کی اعلیٰ صفات میں شامل تھا کہ باقی دنیا میں نیوز پیپر یا اخبار بہت بعد میں چھاپا خانے کی ایجاد کے بعد وجود میں آیا۔

راقم السطور کو اس قلمی صحافت کی کوئی باضابطہ تاریخ نہیں مل سکی لیکن ہندوستان میں برٹش حکومت کے کئی سربراہوں کی رپورٹوں اور دیگر تحریروں میں ان ''اخباروں'' کا ذکر بار بار ملتا ہے مثلاً گورنر جنرل کی کونسل کے رکن قانون لارڈ ٹی بی میکالے نے ان کی صحافت پر اپنے ایک نوٹ میں لکھا:

> ''یہ اخبار مرتب کرنے والوں کی تعداد کثیر ہے جو ہر کچہری اور دیسی راجوں کے درباروں کے اردگرد خبروں کی تلاش میں متواتر گھومتے رہتے ہیں۔ دہلی کے (شاہی) محل اور ریزیڈنسی کے مقامات پر بیس تا تیس وقائع نگار موجود رہتے ہیں۔ مقامی باشندوں کے بہت سارے امیروں میں ہر وقائع نگار کے خریدار ہیں جنہیں یہ وقائع نگار ہر روز کچہری اور شہر کی تمام گرم خبریں اور افواہیں مہیا کرتے ہیں۔ دہلی سے ہر روز جو قلمی اخبار باہر بھیجے جاتے ہیں ان کی ٹھیک ٹھیک تعداد معلوم نہیں ہو سکتی لیکن جانکار لوگوں

کا اندازہ ہے کہ یہ ۱۲۰ ہے۔ یہ اخبارات چھوٹی چھوٹی باتوں کی تفصیل سے اٹے ہوتے ہیں..... اکثر ان میں حکومت اور اس کے ملازمین کو رسوا کیا جاتا ہے اور ہمارے (برطانوی) کردار اور اطوار پر پھبتیاں اڑائی جاتی ہیں۔''

(Cited by Dr. Abdus Salam Khursheed: News Letters in the Orient, 1956,P.86,87)

یہاں لارڈ میکالے کی نیش زنی سے قطع نظر یہ حقیقت آسانی سے دیکھی جاسکتی ہے کہ نجی قلمی اخبارات وقت کی خبروں سے لبریز ہوتے تھے اور انہیں امرا اور رؤسا کی مالی سرپرستی حاصل تھی اور وقائع نگاروں کا یہ قلندری طبقہ فرنگی سرکار کے وظیفہ خوار وقائع نگاروں سے حیثیت اور وقعت میں کم نہیں تھا۔ مزید یہ اندازہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت کے حلقہ اشراف میں فرنگی حکومت کے کردار و اطوار سے وسیع بے اطمینانی تھی۔

میکالے سے قبل اسی سال (۱۸۳۶ء) ہی میں اس کے گورنر جنرل لارڈ آک لینڈ نے بھی اپنے نوٹ میں لکھا تھا:

''راجوں اور رئیسوں نے اپنے اپنے وقائع نگار رکھے ہوئے ہیں..... غالباً ہر بڑے شہر میں ایسے وقائع نگار موجود ہیں۔''

(ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ایضاً صفحہ ۸۸)

ان سے تین سال قبل کمپنی کے ایک اور ایگزیکٹیو سر جان مالکم نے ۱۸۳۳ء میں لکھا تھا:

''یہاں اشتعال انگیز اخبار نکل رہے ہیں جن کے ذریعے بے چینی اور بغاوت کے جذبات کو اکسایا جارہا ہے۔'' (ایضاً صفحہ ۸۵)

اس تحریر کے قریب ربع صدی بعد متوقع بغاوت پھوٹ پڑی جس میں مولوی محمد باقر نے اپنی صحافت اور جان عزیز دونوں کی قربانی دی۔

متذکرہ تبصروں سے برطانوی مورخین کے اس مفروضے کی مستند تردید ہوجاتی ہے کہ ۱۸۵۷ء کی عوامی بغاوت یک ''غدر'' تھا جو چند گمراہ سپاہ کی بے ادبی کا شاخسانہ تھا۔

یہ ''اشتعال انگیز'' اخبارات صرف شمالی ہند یا دہلی ہی نہیں بلکہ جنوبی ہند میں بھی کئی دہے

پہلے نکل رہے تھے۔ وہاں بھی فرنگی کے خلاف، اس کے شوق اقتدار کے آغاز ہی سے عوامی جذبہ متحرک تھا۔ معاملات کمپنی کے ایک نامور مبصر ایس سی سانیال کے ایک مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ جنوبی ہند میں منادا پریدا نام کے ایک دلاور نے ۱۸۰۰ء میں اپنے علاقے کے تقریباً ہر گاؤں میں اپنا آزادی پسند قلمی اخبار بانٹا جس میں علاقے کے باشندوں سے یہ اپیل کی گئی کہ: ''وہ یورپ کے ان نیچ لوگوں کے خلاف متحد ہو جائیں جنہوں نے ہمارے ملک کی آزادی پر چھاپہ مارا ہے۔'' اس اپیل میں ''برہمنوں، کشتریوں، مسلمانوں اور دیگر فرقوں اور پیشوں کے لوگوں'' کو مخاطب کیا گیا اور کہا گیا کہ وہ ''دلیری سے کام لیتے ہوئے ان ذلیل اور بے شرم لوگوں (فرنگیوں) کا خاتمہ کر دیں اور جب تک یہ ختم نہ ہوں اپنا عمل (جہاد) جاری رکھیں۔''

اس قلمی اپیل کے قریب ۵۷ سال بعد جنوبی ہند سے ہزاروں میل دور تاریخی راجدھانی دہلی کے مولوی محمد باقر نے اپنے مطبوعہ ''دہلی اردو اخبار'' میں ایسی ہی اپیل شائع کی اور ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں سے کہا کہ وہ ''بہادری کی اپنی قدیم روایات سے کام لیتے ہوئے اب اس جنگ میں انگریزوں کا خاتمہ کر دیں۔''

فرنگی کی سیاسی دراز دستی کے خلاف ہمارے جنوب اور شمال کی فکر کی ہم آہنگی نیز قلمی اور مطبوعہ صحافت کی مطابقت پر غالباً ابھی تک کوئی جامع تاریخ یا تحقیق مرتب نہیں ہوئی۔ تاہم یہاں مندرج ٹھوس مثالیں مظہر ہیں کہ ہمارے قدیم اہل فکر و دانش نے فرنگی کی دراز دستی کے خلاف ہندو مسلم اور ملک کی آبادی کے مختلف طبقوں کے مابین اتحاد کی تلقین کی۔ ''دہلی اردو اخبار'' کی بیس سال کی عمر کے متعدد شمارے اس موضوع کے خوشہ چیں ہیں۔ اس کے بانی مولوی محمد باقر نے گمنام طور پر اس کے کالم رقم کیے اور حسب موقع ان میں صریحاً یا بین السطور ہندو مسلم موافقت کی اہمیت اجاگر کی۔ وہ فطری صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ وطن کی حریت کے بھی مجاہد تھے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت، جس کی کاشت میں ان کے اخبار نے ہراول دستے کا کام کیا، جب اچھی پیش رفت کر چکی تو جون ۱۸۵۷ء میں انہوں نے لکھا:

> ''اے سپاہ دلیر اے تلنگاں، بیشتر تاریخوں میں جس طرح سے کہ سلطنت ہائے سابقہ میں کارنامہ ہائے شجاعات زمان گزشتہ یادگار ہیں کہ تاریخ قدیمہ ہند میں خاندان یدوبنشی میں بھیم وارجن وغیرہ بہادری میں یادگار

ہیں اور علیٰ ہذا القیاس تواریخ فارس میں شجاعت رستم وسام اور سلطنت اہل اسلام میں فتوحات حضرت صاحب قراں امیر تیمور گاں اور دلیران فوج چنگیز خانی و بہادران ہلاکو خانی و افواج نادریہ تواریخوں میں لکھے چلے آتے ہیں اور آخر زمانے کے لوگوں کی ہمت کو بڑھاتے ہیں اور جرأت کو ترقی دیتے ہیں، اسی طرح یہ معرکہ تمہارا بھی تواریخوں میں لکھا جائے گا اور صفحہ عالم پر کارِ رستمانہ تمہارا یادرہے گا کہ اس بہادری اور جواں مردی سے تم نے ایسے اولوالعزم اور متکبر سلطنت کے کروغرور کو توڑا اور ان کی نخوت وفرعونی اور عزم شدادی کو یکسر خاک میں ملادیا.....''

جب دہلی میں یہ بغاوت ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو کھلم کھلا شروع ہوگئی تو مولوی محمد باقر نے اپنی ذات اور اپنے اخبار دونوں کو اس کے لیے وقف کردیا۔ بغاوت کے فوراً بعد ۱۷ مئی کا پورا شمارہ انہوں نے بغاوت نمبر کے انداز میں شائع کیا۔ اس میں دہلی شہر، دہلی چھاؤنی، انبالہ، میرٹھ، سہارنپور اور روڑکی کے احوالِ احتجاج بیان کیے گئے۔ مولوی محمد باقر نے حسبِ معمول رپورٹر کا نام پردے میں رکھا اور ''راقم آثم'' کے نام سے ایک طویل روداد شائع کی جو اس عظیم جنگ آزادی کی بسم اللہ کی آنکھوں دیکھی تاریخی یادگار ہے۔ اس کے استفادے کے بغیر آزادی کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔

بغاوت کے واقعات ذاتی مشاہدے سے رقم کرنے کے علاوہ مولوی محمد باقر محبان وطن کی ہمت بڑھانے کے لیے قومی اپیلیں، نصیحتیں، پیروں اور بزرگوں کے برکاتی خواب اور شرعی اقوال بھی شائع کرتے رہے۔ ۲۴ مئی ۱۸۵۷ء کے شمارے میں ان کے صاحب علم وادب فرزند مولوی محمد حسین آزاد کی معرکۃ الآرا نظم ''تاریخ انقلاب عبرت افزا'' بھی شائع ہوئی جس کے چند اشعار حسب ذیل تھے:

ہوتا ہے ابھی کچھ سے کچھ یک چشم زدن میں ہاں دیدۂ دل کھول دے اے صاحب ابصار
ہے کل کا ابھی ذکر کہ جو قوم نصاریٰ تھی صاحب اقبال و جہاں بخش و جہاں دار
تھی صاحب علم و ہنر و حکمت و فطرت تھی صاحب جاہ و حشم و لشکر جرار
اللہ ہی اللہ جس وقت کہ نکلے آفاق میں تیغ غضب حضرت قہار

سب جوہر عقل ان کے رہے طاق پر رکھے　　سب ناخنِ تدبیر و خرد ہوگئے بیکار
کام آیا نہ علم و ہنر و حکمت و فطرت　　پورب کے تلنگوں نیلیا سب کو یہیں مار
یہ سانحہ وہ ہے کہ نہ دیکھا نہ سنا تھا　　ہے گردش گردوں بھی عجیب گردش دوار
نیرنگ کے غور اس کے جو کیجئے تو عیاں ہے　　ہر شعبدہ تازہ میں صد بازیِ عیار
ہاں دیدۂ عبرت کو ذرا کھول تو غافل　　ہیں بند یہاں اہل زباں کے لب گفتار
عبرت کے لیے خلق میں یہ سانحہ بس ہے　　گر دیوے خدا عقل سلیم و دل ہشیار

(بحوالہ محمد عتیق صدیقی: ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں) صفحہ ۳۸۳)

والد کی طرح بیٹے محمد حسین آزاد نے بھی بغاوت کے آغاز اور باغیوں کی فوری کامیابی کا منظر بہ چشم خود دیکھا تھا۔ چنانچہ ان کے مشاہدے کی تجلی اور احساس کی قوت بڑی عمدگی سے نظم میں اتر آئی۔ ایک اور عظیم القدر امر یہ تھا کہ اس انقلابی نظم کا یہ شاعر اس وقت اخبار کا ایڈیٹر بھی تھا۔ مولوی محمد باقر سے آگے دوسری نسل یعنی آئندہ ۲۵ تا ۵۰ سال کے زمانے کا باشعور نمائندہ تھا۔ اس کی عمر اس وقت ۲۷ سال تھی۔ وہ اپنی واقعاتی نظم کے ذریعہ کمپنی کے آقاؤں کو سمجھا رہا تھا کہ وہ گردش دوراں کے اشارے کا ادراک کریں اور ''خلق'' میں عزت کے لیے ''عقل سلیم'' سے کام لیں۔ گویا نئی نسل بھی اہل کمپنی کے لیے ''عقل سلیم'' کی صدا لگا رہی تھی۔ اس کی پیش رو نسل کے دانشور بھی، جن کی نمائندگی مولوی محمد باقر کر رہے تھے، کمپنی کو حکومت کے کام کاج میں انجان اور کم نظر تصور کرتے تھے۔ یہی بات بغاوت کے فوراً بعد کمپنی کے انگلستانی سرپرستوں نے سمجھی اور کمپنی کے ہاتھوں سے ہندوستان کا نظم و نسق لے کر اسے تاج برطانیہ (پارلیمنٹ) کے ہاتھوں میں دے دیا۔

تاجروں کے اس گروہ کے نظم و نسق میں کوئی سلیقہ مندی نہیں تھی۔ یہ اپنے کاروباری بورڈ آف ڈائریکٹرز کے تصورات کا کھلونا تھی جو اپنے زعم میں ہندوستان کے حقائق کو جانتے ہوئے بھی ان کا احترام نہیں کرتے تھے۔ مشہور تھا کہ کمپنی ایک سہ عملی نظام کی کوٹھی تھی: ''خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا۔'' (محمد عتیق صدیقی: ایضاً صفحہ ۴۱۰)

اس میں ''ملک بادشاہ کا'' کو اہل کمپنی چپ چاپ نظر انداز کر دیتے تھے اور فقط ''حکم کمپنی بہادر'' پر اکڑفوں رہتے تھے۔ اس ''حکم'' کی نہایت عریاں تصویر اس کے اس اشتہار میں نمایاں ہوئی جو اس نے بغاوت کے دوران اس کے انسداد کے لیے مشتہر کیا اور جس کا متن

او پر پیش کیا جا چکا ہے۔

پورے چار ماہ کی تمازت اور تمکنت کے بعد ۱۸۵۷ء کی میرٹھ اور دہلی کی بغاوت بالادست فرنگی کی حکمت و عیاری، دیسی ریاستوں کی حربی پسماندگی، اندرونی نزاع، ہندوستانی سپاہ کے اقتصادی کھچاؤ اور ان پر روزی و رزق کی مار سے عارضی طور پر ناکام ہوگئی۔ اس کے فوراً بعد انگریزوں نے بغاوت کے مجاہدوں، حامیوں اور دور دور تک مشتبہ لوگوں کی اندھا دھند گرفتاری اور ہلاکت شروع کر دی جو ان کے نفسی اطمینان تک جاری رہی۔

مولوی محمد باقر کی شہادت کے بارے میں کئی روایتیں مشہور ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ دہلی کالج کے انگریز پرنسپل ٹیلر کو، جو عیسائیت کا زبردست مبلغ تھا، باغیوں سے بچانے کی ناکامی کے الزام میں فرنگی حکام نے انہیں گولی مار دی۔ ایک اور خاندانی روایت، جو محمد حسین آزاد کے نبیرہ آغا محمد باقر نے بیان کی ہے، یہ ہے کہ وسیع و عریض گرفتاریوں کے ایام میں فرنگی حاکموں نے ستمبر ۱۸۵۷ء میں مولوی محمد باقر کو بھی گرفتار کر لیا تھا اور انہیں باغیوں کو سزا دینے والے افسر اور کمپنی حکومت کے جاسوسی محکمے کے انچارج کیپٹن ہڈسن کے سامنے پیش کیا تھا۔ ان کے حکم سے انہیں ۱۶ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی دروازے کے باہر خونی دروازے کے سامنے کے میدان میں توپ کے گولے سے شہید کر دیا گیا۔ جس دن انہیں دیگر باغیوں کے ساتھ گولی ماری جانے والی تھی، ان کے فرزند محمد حسین آزاد اپنے والد کے ایک دوست کرنل سردار سکندر سنگھ کی مدد سے بھیس بدل کر اور ان کا سائیس بن کر دہلی دروازے کے میدان کے باہر کے کنارے سے ان کے آخری دیدار کے لیے گئے۔ وہاں چاروں طرف فوجی پہرا تھا۔ مولوی محمد باقر سامنے نماز پر کھڑے تھے۔ آزاد گھوڑے کی باگ تھامے فاصلے پر کھڑے تھے اور منتظر تھے کہ کب آنکھیں چار ہوں۔ مولوی صاحب نے نماز ختم کر کے نظر اٹھائی تو سامنے اپنے پیارے بیٹے کو دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ مولوی محمد باقر نے فوراً دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور ساتھ ہی اشارہ کیا کہ بس آخری ملاقات ہو چکی، اب رخصت۔ محمد حسین آزاد بھی ''دہلی اردو اخبار'' میں اپنی تحریروں کی وجہ سے مشتبہ افراد کی فہرست میں تھے اور ان کے وارنٹ گرفتاری بھی جاری ہو چکے تھے۔ والد کا اشارہ پاتے ہی کرنل سکندر سنگھ نے اپنا گھوڑا موڑ لیا اور دونوں وہاں سے واپس چلے آئے۔

(امداد صابری، ایضاً صفحہ ۲۱۹)

کیپٹن ہڈسن کا فائرنگ کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے توپ کا گھوڑا دبایا اور ۷۷ سالہ مولوی محمد باقر حق تعالیٰ سے جا ملے۔

ان کی شہادت کے ساتھ ہی ''دہلی اردو اخبار'' کی اشاعت اور عوامی بغاوت کے مفسر کی نگارش خاموش ہو گئی، گو اس کی روایت اپنی روحانی قوت سے ملک کی اردو صحافت کا شعور اور امتیاز مقسوم ہو گئی۔

یہ صدی اپنی گوناگوں خصوصیات کے ساتھ شہادتوں کی صدی بھی تھی۔ اس کے شہیدوں کی مکمل یا مفصل فہرست شاید ابھی تک مرتب نہیں ہوئی لیکن ان میں اردو صحافت کے شعبے کا غالباً واحد نام مولوی محمد باقر کا ہے جو اپنی یکتائی سے ثابت و سالم ہے لیکن افسوس کہ آج تک ان کے شہر دہلی میں نہ ان کے نام کی کوئی یادگار ہے نہ ان کی صحافت شعاری کی یاد میں کوئی آڈیٹوریم یا میوزیم ہے۔

۱۸۵۷ء کی ادبی اہمیت

محمد حسن

ڈاکٹر محمد حسن کا یہ مضمون ساٹھ برس پہلے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا تھا جب ملک نے ۱۸۵۷ء کا سو سالہ جشن منایا تھا۔ یہ مضمون ۱۸۵۷ کی پہلی جنگ آزادی کے مختلف پہلوؤں کا نہایت عمدہ تجزیاتی مطالعہ ہے۔ ایک سو پچاسویں سالگرہ کے موقع پر یہ مضمون آج بھی رہنما مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۸۵۷ء میں جو کچھ ہوا اس کی طرف ادبی تنقید کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ ممکن ہے کچھ لوگوں کو یہ سوال ہی بے معنی نظر آئے کیوں کہ ۱۸۵۷ء کی لڑائی سیاسی اور تاریخی واقعہ ہے ادبی مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن اگر تاریخ اور ادب کا کوئی رشتہ ہوتا ہے اور تاریخ ادب صرف مصنفین کے نام کی فہرست نہیں ہوتی بلکہ ایک قوم کے عہد بہ عہد ذہنی اور عمرانی نشو ونما کی داستان ہوتی ہے تو یقیناً ۱۸۵۷ء کے بارے میں ادب کے مورخ کو بہت کچھ سوچنا پڑے گا اور اس کی طرف اپنا رویہ طے کرنا ہوگا۔

پہلا سوال تو یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی لڑائی کو فوجی بغاوت کہا جائے یا جنگِ آزادی قرار دیا جائے۔ غدر کا نام دیا جائے یا چند معزول شدہ بادشاہوں اور رجواڑوں کی آخری بازی سمجھا جائے۔ ایک طرف مورخین کا وہ گروہ ہے جو اسے مذہبی جنگ قرار دیتا ہے، دوسری طرف وہ ہیں جو اسے محض اتفاقی شورش سمجھتے ہیں۔ ان میں سے کوئی دعویٰ بھی بے دلیل نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس لڑائی کی ابتدا انگریزی فوج کے ہندوستانی دستوں کی نافرمانی سے ہوئی اور میرٹھ سے یہی دستے دہلی پہنچے انہیں برطانوی افسران سے شکایتیں تھیں۔ انہیں سور اور گائے کی چربی کے کارتوسوں کے استعمال کرنے پر اعتراض تھا۔ انہیں انگریز سپاہیوں کی بالادستی کا شکوہ تھا اور اس بنا پر اسے فوجی بغاوت کہہ کر ٹالا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ بات بھولنے کی نہیں ہے کہ جلد ہی اس لڑائی کی نوعیت بدل گئی۔ اب یہ لڑائی صرف کارتوسوں پر نہیں تھی، صرف ملازمت کی تکلیفوں اور غیر مساوی برتاؤ پر نہ تھی، یہ لڑائی اقتصادی یا فوجی سے آگے بڑھ کر سیاسی ہوگئی تھی اور ان غیر مطمئن اور ناآسودہ سپاہیوں کو ان تمام عناصر کی ہمدردی اور حمایت حاصل ہوگئی تھی جو انگریزی حکومت کے جبر و استبداد

کا شکار ہو چکے تھے۔ ایک طرف انگریز اور ان کے ہندوستانی خیر خواہ تھے، دوسری طرف سارے انگریز دشمن عناصر جمع ہو گئے تھے۔ ان معنوں میں اسے جنگِ آزادی کہا جا سکتا ہے، گو اس بات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ اس وقت نہ تو قومیت کا کوئی واضح تصور موجود تھا اور نہ سیاسی آزادی۔ اگر ۱۸۵۷ء کی لڑائی کا نتیجہ ہندوستانیوں کے حق میں برآمد ہوتا تو ہندوستان میں غیر ملکی سامراج کے بجائے شاید قومی آزادی نہ آتی، پرانے انحطاط پذیر رجواڑوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں پھر سے قائم ہو جاتیں۔

جو لوگ ۱۸۵۷ء کی لڑائی کو ''غدر'' کا نام دیتے ہیں وہ اس پر زور دیتے ہیں کہ یہ لڑائی منظم نہیں تھی اور اس میں شریک ہونے والے اکثر وہ لوگ تھے جو صرف لوٹ مار کے لیے لڑائی میں شامل ہو گئے تھے۔ ان میں سیاسی مجاہدوں کی منظم اور ایثار پسند جماعت کم تھی اور شورہ پشت اور لٹیرے بہت سے شامل ہو گئے تھے جو کسی ڈسپلن کو نہ مانتے تھے اور کسی عسکری تنظیم سے وابستہ نہ تھے۔ ۱۸۵۷ء کی لڑائی میں بے ترتیبی اور بدنظمی کا ایک ایسا دور آیا تھا جس سے انکار ممکن نہیں۔ داغ کے ''شہر آشوب'' میں، اظہار دہلوی کی ''داستانِ غدر میں''، مولوی ذکاء اللہ کی ''تاریخ ہندوستان'' میں نذیر احمد کی تصانیف میں اور غالبؔ کے خطوط میں جن ''کالوں'' اور پوربیوں'' کا ذکر ہے وہ تمام کا تمام انگریزوں کے ڈر سے ہی نہیں لکھا گیا اس میں حقیقت کا بھی شائبہ ہے۔ لیکن کیا بے ترتیبی اور بدنظمی کے اسی دور سے ۱۸۵۷ء کی لڑائی کا سارا کردار متعین کرنا درست ہوگا؟ منظم سے منظم جنگِ آزادی میں بدنظمی اور بے ترتیبی کے ایسے دور آتے ہیں لیکن کیا اس بنا پر ایسی جنگوں کو غدر کہا جا سکتا ہے؟

اس میں شک نہیں کہ رجواڑوں اور بادشاہوں نے اس لڑائی سے وابستہ ہو کر اپنی کھوئی ہوئی سیاسی طاقت دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اس لڑائی میں صرف انہیں معزول شدہ حکمرانوں کی فوجیں نہیں لڑ رہی تھیں، اس میں تو وہ سب لوگ تھے جو انگریزوں سے ناآسودہ تھے اسی لیے پہلا نعرہ ''دین دین'' کا تھا جو کمپنی کی بے جا مذہبی مداخلت کے خلاف سارے ہندوستانیوں کو یکجا ہو کر لڑنے کے لیے اکساتا تھا۔ اس وقت سیاسی بیداری ایسی عام نہ تھی کہ وہ جمہور کی ہر سطح تک پہنچ کر اسی لڑائی کو ہمہ گیر، قومی اور عوامی لڑائی میں تبدیل کر سکتی۔ اس طرح ۱۸۵۷ء کی لڑائی کو کسی ایک لفظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ یہ ایک طویل عمل تھا جو مختلف منزلوں

سے گزرا اور جس کی نوعیت مختلف اور متنوع تھی اور جس میں نہ جانے کتنے عناصر مل جل کر کام کر رہے تھے۔

۱۸۵۷ء کی یہ لڑائی حادثہ نہ تھی بلکہ اس کے پیچھے اسباب وعلل کا ایک پورا سلسلہ تھا۔ یہاں اس کے سیاسی محرکات سے بحث نہیں، اس کے ذہنی تار و پود پر غور کرنا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی لڑائی فکر اور خیال کے طویل سلسلے کی ایک کڑی کی حیثیت رکھتی ہے اور چوں کہ ادب بھی خیال اور جذبے ہی کا نام ہے اس لیے اس عہد کے فکری تانے بانے کو اس لڑائی نے جس طرح متاثر کیا ہے وہ ادبی مورخ کے لیے بھی دلچسپی کا موضوع ہے۔

انگریزوں کے حکمران ہونے سے قبل ہندوستان میں قومیت کا تصور اور احساس بڑا ہی دھندلا اور موہوم سا تھا اس لیے اس عہد سے پہلے کی تہذیب کو ہندوستانی تہذیب یا قومی تہذیب کا لقب دینا نامناسب ہوگا۔ سارا ملک مختلف علاقائی حکومتوں ہی میں بٹا ہوا نہیں تھا بلکہ بہت سے علاقائی تہذیبی منطقے بھی قائم تھے اور ان کے دھارے کبھی مل کر کبھی ایک دوسرے سے ٹکرا کر بہہ رہے تھے۔ یہاں ہم صرف ان تہذیبی دھاروں کا ذکر کریں گے جنھوں نے براہِ راست اردو ادب کو متاثر کیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ تصوف کی مختلف شکلوں نے دنیائے خیال پر غلبہ حاصل کر لیا تھا اور وہ دی آسودگی کی تلاش سے دامن چھڑا کر صوفی منش بزرگوں اور فنکاروں نے درباروں کی چمک دمک کی بجائے جمہور سے رشتہ جوڑنے کی کوشش کی تھی۔ کبھی یہ اربابِ طریقت شریعت والوں کی نظروں میں کھٹکے کبھی اہلِ شریعت کے دوش بدوش آگے بڑھے۔ مذہب کا یہی وسیع تصور ۱۸۵۷ء سے قبل ہمارے نظامِ فکر کا محور قرار پاتا ہے۔ تعلیم اور نصابِ تعلیم میں مذہب کو بنیادی حیثیت حاصل تھی خواہ لکھنؤ ہو یا دہلی، ہر جگہ مذہبی تصورات، ہیئت، فلسفہ، اخلاق، منطق، طب اور دوسرے تمام تر علوم پر حاوی نظر آتے ہیں۔ عربی اور فارسی کی تعلیم اور خصوصاً گلستاں، بوستاں، اخلاقِ جلالی اور اخلاقِ ناصری وغیرہ کلاسیکل تصانیف کے اثرات نمایاں طور پر مذہب کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

نئے سیاسی اور عمرانی حالات اس تعلیمی اور فکری سانچے میں پورے نہیں اُتر رہے تھے۔ اس دور کے علماء اور بزرگوں کو اس بات کا احساس کسی نہ کسی شکل میں ہو چلا تھا کہ اس سماجی ڈھانچے میں کوئی انقلابی تبدیلی لانا ضروری ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب، وہابی تحریک اور فرائضی تحریک ہر

ایک نے اس بات پر زور دیا کہ سماجی نظام میں تبدیلی ضروری ہے اور عمل کی جو قوتیں خوابیدہ ہوگئی ہیں ان کو پھر سے جگانا چاہیے۔ ان سب بزرگوں نے اس انحطاط اور بے عملی کا تجزیہ تصوراتی اور آدرش وادی سطح پر کیا۔ انہوں نے بدلے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے قدیم اصول کی طرف واپسی پر زور دیا۔ انہوں نے زوردار الفاظ میں قرآن اور اسلام کے بنیادی عقائد اور اصول پر پھر سے عمل کرنے کی دعوت دی گویا اجتہاد کا دروازہ کھول کر انہوں نے ان اصول وضوابط میں تھوڑے بہت ردو بدل اور ان کی تفسیر میں اختلاف رائے کی گنجائش پیدا کردی۔ ان لوگوں کو محض دقیانوسی اور رجعت پسند کہہ کر نہیں ٹالا جاسکتا۔ انہوں نے اقتصادی مساوات، سماجی انصاف اور عمل کی آواز بلند کی۔ انہوں نے اپنے دور کے عمرانی ڈھانچے کے کھوکھلے پن کو محسوس کیا اور اس پر پوری شدت سے وار کیا۔ انہوں نے تبدیلی کی ضرورت محسوس کی اور آنے والے دور کی دھندلی سی تصویر پیش کر کے نجات کا ایک راستہ ڈھونڈھ نکالنے کی کوشش کی۔ ان کی آواز گویا تبدیلی کے احساس کی پہلی آواز ہے۔

ان آوازوں سے ایک بات ضرور ثابت ہوتی ہے۔ انگریز ہندوستان میں ایک بہتر صنعتی نظام لے کر داخل ہورہے تھے اور ہندوستان کا عمرانی ڈھانچہ ٹوٹ رہا تھا۔ یہ عمرانی ڈھانچہ خود بخود مائل بہ انحطاط تھا اور اگر انگریز ہندوستان نہ آتے تو بھی اس ڈھانچے کا ٹوٹ جانا مسلم تھا۔ سماجی نظام میں تبدیلی کا احساس انگریز اپنے دامن میں نہیں لائے، یہ احساس سو فیصدی برطانوی تاجروں کی دین نہیں تھا بلکہ ان کے براہِ راست اثر انداز ہونے سے پہلے بھی تبدیلی کی ضرورت اور اس ضرورت کی اہمیت محسوس کی جانے لگی تھی۔

اس اندرونی احساس کے ساتھ ساتھ بہت سے خارجی عناصر بھی کام کررہے تھے۔ سرِ دست ہم اگر سیاسی صورتِ حال کو نظر انداز کردیں تو بھی خالص علمی اور ادبی سطح پر بہت کچھ تبدیلیاں ہونے لگی تھی۔ انگریزی ۱۸۳۵ء میں سرکاری زبان مان لی گئی تھی اور یہ فتح اس نے سنسکرت اور فارسی کو شکست دے کر حاصل کی تھی۔ اگر لارڈ میکالے کی رپورٹ میں مشرقی علوم اور ادبیات کو اس قدر برا بھلا نہ کہا گیا ہوتا تو شاید انگریزی کی فتح اس قدر ڈرامائی نہ ہوتی۔ علاوہ بریں فورٹ ولیم کالج کے قیام نے بھی ادب کی رفتار کو بہت کچھ متاثر کیا۔ گو جان گلکرسٹ کی پالیسی آخر کار میکالے اور اس کے ہم نواؤں، کی مغربی سانچے میں ڈھالنے کی پالیسی کے آگے ترک کردی

گئی لیکن فورٹ ولیم کالج نے اردو نثر میں خاص طور پر ایک نیا آہنگ ضرور پیدا کر دیا۔ مغربی اثرات بڑے آہستہ اور مدھم تھے لیکن سادگی پر زور، آراستہ اور پیراستہ عبارت کی صنعت گری کی بجائے نفسِ مضمون کی طرف توجہ اور ایک نئے ادبی معیار کی ابتدا ہونے لگی تھی، گو اس دور کے لوگوں کے نزدیک نہ یہ ادبی تھا نہ معیار۔

دہلی کالج اور اس کے انگلش انسٹی ٹیوٹ کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کلکتہ بک سوسائٹی مختلف موضوعات پر جو کتابیں انگریزی میں تیار کر رہی تھی، وہ یہاں اردو میں ترجمہ کی جاتی تھیں۔ پرسی دل اسپیر نے ٹھیک کہا ہے: ''انگریزی ادب نے جو اثرات بنگال میں چھوڑے تھے وہ بنیادی طور پر ادبی تھے۔ دہلی میں یہ اثر سائنٹیفک تھا۔''

سی ایف انڈریوز نے دہلی کالج کے بارے میں جو تفصیلات بہم پہنچائی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی کالج میں سب سے مقبول شعبہ سائنس ہی کا تھا۔ گو ادبیات کے نصاب میں گولڈ اسمتھ کی نظم ''مسافر'' اور ''اُجڑا ہوا گاؤں''، ملٹن کی نظم ''فردوسِ گم شدہ''، پوپ کی نظم ''انسان پر مضمون'' اور نثر میں رچرڈس کے انتخابات، بیکن کا ''علم کی ترقی'' اور برک کے مضامین اور تقاریر شامل تھیں لیکن سائنس اپنی دلچسپی، مقبولیت اور ندرت کی حیثیت سے بنیادی اہمیت رکھتی تھی۔ سی ایف انڈریوز لکھتے ہیں:

> ''قدیم دہلی کالج کی تعلیم کا غالباً سب سے مقبول شعبہ وہ تھا جو سائنس سے متعلق تھا۔ اس میں طلبہ کو سب سے زیادہ دلچسپی تھی اور جلد ہی یہ شہر کے گھر گھر میں پھیل گئی جہاں نئے تجربے زیادہ سے زیادہ مرتبہ والدین کے سامنے دہرائے جاتے تھے۔'' (بہ حوالہ ''ٹوائی لائٹ آف دی مغلس'')

منطق اور فلسفہ کے بارے میں بھی دہلی کالج کے طلبہ کا رویہ قابلِ توجہ ہے کیوں کہ یہ طلبہ کوئی معمولی طالب علم نہیں تھے، ان میں اردو ادب کی جانی پہچانی شخصیتیں شامل تھیں جنہوں نے ادب کا رخ بدلا۔ سی ایف انڈریوز فلسفے کی تعلیم کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''قدیم فلسفے کے نظریات جو کہ ارسطو کی تعلیمات کے ذریعے سے پڑھائے جاتے تھے، جدید سائنس کے زیادہ معقول اور تجربے کی کسوٹی پر پورے اُترنے والے نظریات کے مقابلے میں ماند پڑنے لگے۔ دہلی کالج

کے شعبہ انگریزی اور مشرقی شعبے کے اعلیٰ درجوں کے طالب علم قدیم اعتقادات کا مذاق اڑاتے تھے مثلاً زمین کو کائنات کا غیر متحرک محور تسلیم کرنے کی ہنسی اڑائی جاتی تھی۔'' (ایضاً)

ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ یہ صرف ایک کالج کی داستان ہے۔ اس کالج کے طفیل نئی نسل میں مغربی اور سائنٹیفک تصورات ہماری سوسائٹی میں راہ پانے لگے تھے مگر اس کے پہلو بہ پہلو ہندوستان کے چپے چپے میں نہ جانے کتنے ایسے مدارس تھے جو قدیم مشرقی تعلیم کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ ان مدارس میں نصابِ تعلیم کی بنیاد مذہب ہی تھا اور ان کی تعلیم میں گو سائنس کے نئے تصورات شامل نہیں تھے لیکن ایسی وسعت اور ہمہ گیری ضرور تھی جو بیک وقت منطق، اخلاق، ہئیت، فلسفہ الٰہیات، طب اور دوسرے متعلقہ موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی تھی۔

یہ بھی صحیح ہے کہ پرانے علوم وفنون اور قدیم نظامِ تعلیم اپنی صلاحیتیں ختم نہیں کر چکے تھے۔ اس برسے ہوئے بادل میں بھی نہ جانے کتنی بجلیاں پوشیدہ تھیں۔ دہلی کے اسی دور کو حالی نے ایک عظیم الشان دور قرار دیا ہے اور دہلی کو بغداد اور قرطبہ کے ہم رتبہ ٹھہرایا ہے۔ یہی وہ دور ہے جب علمِ حدیث اور علمِ دین ہی میں نہیں شعر وادب میں بھی احیاء کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی اور اس میں شک نہیں کہ شعر وادب کی آبیاری زیادہ تر یہی قدیم نظامِ تعلیم کر رہا تھا۔ اس دور کا غیر اہم سے غیر اہم شاعر بھی اس نظامِ تعلیم کی برکت سے اس دور کے مجموعی علم کا ہلکا سا تصور ضرور رکھتا تھا۔ ذوق کو اپنے عہد میں کبھی عالم منتہی نہیں سمجھا گیا لیکن ان کے ''سر بستر خوابِ راحت'' والے قصیدے سے اندازہ لگایا جائے تو طب، ہئیت، منطق، نجوم اور دوسرے علوم متداولہ سے انہیں کم سے کم ابتدائی واقفیت ضرور تھی، دوسرے قصیدوں میں بھی یہی وسعت پائی جاتی ہے۔ مومن کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ وہ طب اور نجوم دونوں میں کامل تھے۔ غالب کی تہ در تہ شاعری کا راز کسی نہ کسی حد تک اس میں پوشیدہ ہے ورنہ یہ شعر:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

''ہیولیٰ'' کے واضح تصورات کے بغیر نہیں لکھا جا سکتا۔

۱۸۵۷ء کی لڑائی کے وقت کا ذہنی پس منظر ہفت رنگ قوس قزح کی مانند نظر آتا ہے جس میں

مختلف قسم کے رنگ غلبہ پانے کے لیے کشمکش کر رہے تھے۔ ایک طرف قدیم طرزِ معاشرت، طرزِ تعلیم اور نظام حکومت تھا جو عزیز ہوتے ہوئے بھی تمام تر تقاضوں کو پورا نہیں کر رہا تھا، امن چین قائم نہ تھا۔ سیاسی استحکام نہ ہونے کی بنا پر اقتصادی ڈھانچہ ڈانواں ڈول ہو رہا تھا اور ساری معاشرت میں ایک عجیب بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی۔ دوسری طرف ایسٹ انڈیا کمپنی جو سیاسی استحکام، امن چین اور صنعتی ترقی کے سامان لا رہی تھی وہ اپنے جلو میں لوٹ کھسوٹ، مذہب میں مداخلت اور سیاسی غلامی کی لعنتیں لے کر آ رہی تھی، گویا اس جنگ کے لڑنے والے ہیرو اور ویلن دونوں عناصر سے مل جل کر بنے تھے اور ایسا جنگجو اور صاحب نظر کوئی نہ تھا جو اس وقت کے تاریخی حالات سے ذرا بلند ہو کر اس کشمکش کے اچھے اور برے دونوں پہلوؤں میں امتیاز کر سکتا، نئے دور کا استقبال کرتا اور سیاسی غلامی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا۔

سیاسی اور انتظامی دونوں معاملات میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے ہندوستانیوں نے بہت کچھ سیکھا۔ جو فوج ۱۸۵۷ء کی لڑائی میں انگریزوں کے خلاف لڑی وہ عام ہندوستانی ریاستوں کی فوج سے مختلف تھی۔ ۱۸۵۷ء میں جب دہلی پر دوبارہ ہندوستانی قبضہ ہو گیا تب بھی انتظامی امور بالکل اسی ڈھنگ پر چلتے رہے جو کمپنی نے قائم کیا تھا۔ گو مذہب اور شریعت کے احترام کے طور پر صدر الصدور کا تقرر کر دیا گیا تھا لیکن عملی طور پر عدالتیں ہی سارے معاملات کا تصفیہ کر رہی تھیں اور کوتوال حسب سابق شہر کے نظم و نسق کا ذمہ دار تھا۔ ڈپٹی کمشنر اور کلکٹروں کی طرح افسران اضلاع میں رقم وصول کر رہے تھے۔ یہ قیاس کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہندوستانیوں کے فتح یاب ہونے کی صورت میں ہی سیاسی اور انتظامی ڈھانچہ قائم ہوتا، وہ کس حد تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے ترقی یافتہ نظام اور طور طریقے کو اپناتا اور کس حد تک قدیم مغل یا ریاستی ڈھانچے سے مختلف ہوتا۔

اس سلسلے میں ایک انتظامی ندرت کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ شروع جولائی میں جب محمد بخت خاں دہلی پہنچے تو انہیں صاحب عالم بہادر کا عہدہ دیا گیا۔ یہ عہدہ اپنی نوعیت کا غالباً پہلا عہدہ تھا جس میں فوجی اور غیر فوجی دونوں طاقتوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ صاحب عالم بہادر دراصل ایک ایسی عدالتی جماعت کے نگراں تھے جس کے ذمے فوج اور شہری آبادی دونوں کے معاملات کا فیصلہ کرنا شامل تھا۔ اس عدالتی جماعت میں چھ فوجی نمائندے اور چار شہر کے اکابر شامل تھے۔ یہ جماعت خود اپنا صدر منتخب کرتی تھی اور اس کے فیصلے صاحب عالم بہادر اور بادشاہ کی

منظوری کے بعد عمل میں لائے جاتے تھے۔ (بحوالہ پری ول اسپیر Twilight of the Mughals, Page. 206)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں خیال سے لے کر عمل تک ہر جگہ ۱۸۵۷ء تک ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں مغرب کی اثر پذیری اور قدیم طرزِ زندگی کی تبدیلی نمایاں طور پر محسوس کی جانے لگی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں آخری بار ہندوستان کے انگریز دشمن عناصر نے مل کر مقابلہ کیا۔ یہ عناصر مختلف اور متنوع تھے اور انگریز دشمنی کا مشترکہ رشتہ انہیں ایک دوسرے سے قریب لے آیا تھا۔ یہ اشتراک اس قدر گہرا اور قریبی تھا کہ اس نے وقتی طور پر ہی سہی سارے فروعی اختلافات کو مٹا ڈالا تھا۔ ہندو مسلم تنازعہ نے بعد میں ہندوستان کی سیاست میں بڑی ہل چل مچائی لیکن اس وقت اس تنازعہ کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ بہادر شاہ کے دور میں مغل دربار میں ہندو اور مسلمان تہوار ایک ہی جوش وخروش کے ساتھ منائے جاتے تھے۔ دیوالی، ہولی اور عید کی رنگ رلیاں عام تھیں۔ محرم میں ہندوؤں کی شرکت اور بسنت میں مسلمانوں کی شرکت معمولی بات تھی۔ پھول والوں کی سیر اور پنکھا اٹھانے میں ہندو اور مسلمان دونوں ساتھ ساتھ موجود ہوتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی لڑائی کے بعد جب عارضی طور پر دہلی میں ہندوستانی حکومت تھی عیدالاضحیٰ کے موقع پر گائے، بھیڑ اور بکری کی قربانی کی ممانعت خود بہادر شاہ نے اپنے فرمان کے ذریعے سے کی۔ بیل اور بھینسے کی قربانی ممنوع تھی۔ ایک طرف بخت خاں اور مرزا مغل ہندوستانی فوجوں کی رہبری کر رہے تھے تو دوسری طرف کرنل گوری شنکر دہلی میں نانا صاحب، جھانسی کی رانی اور تانیتا ٹوپے ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں شانہ بہ شانہ لڑ رہے تھے۔

ہندوستان نے یہ لڑائی ہار دی اور اس پر سیاسی غلامی مسلط ہوگئی۔ یہ گویا غلامی کے خلاف آخری مضبوط مورچہ تھا۔ اس شکست نے اس عمل کو پورا کر دیا جو ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی لڑائی سے شروع ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس شکست کے بعد انگریزوں کا جذبۂ انتقام بیدار ہوا اور فاتح فوج نے وہ مظالم کیے کہ ہلاکو اور چنگیز کے مظالم گرد ہو کر رہ گئے۔ اس دور میں اور اس کے کافی عرصے بعد تک دیانت داری سے ۱۸۵۷ء کی لڑائی کے بارے میں خیالات کا اظہار کرنا ناممکن ہوگیا۔ اس دور کی اکثر یادداشتیں اور تذکرے اس بات کو ملحوظ رکھ کر پڑھنے چاہئیں کہ یہ سب بیانات مصلحت کو پیش نظر رکھ کر دیئے گئے ہیں۔ اگر کہیں ان بیانات میں ''کالوں'' کی لوٹ مار کا تذکرہ ملے یا

ہندوستانی ''لٹیروں'' کے خلاف نفرت کا جذبہ نظر آئے تو اس کی وجہ مصلحت بھی ہو سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ لڑائی کے اس دور سے متعلق ہو جب شورش پسندوں اور لٹیروں نے بدنظمی پھیلا رکھی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانے کی تصانیف نیم صداقتوں سے بھری پڑی ہیں اور اگر اس دور کی حقیقت کا کوئی سراغ مل سکتا ہے تو وہ صرف ان ہی نیم صداقتوں کے راستوں سے ملے گا۔

ادبی مورخین ہوں یا تذکرہ نویس، سب کی تصانیف میں ۱۸۵۷ء کی لڑائی کو آخری جدوجہد ضرور ہی تسلیم کیا گیا ہے۔ اس جدوجہد نے جہاں ہندوستانیوں کے اس غم و غصے کا بڑی حد تک اظہار کر دیا جو غلامی کے خلاف اندر رہا تھا وہاں اس جدوجہد کے خاتمے نے یہ بات واضح کر دی کہ اب برطانوی راج کو جلد ختم کرنے کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔ نئے حالات کو آنے سے کوئی نہیں روک سکتا اور ماضی خواہ کتنا ہی عزیز اور عظیم کیوں نہ ہو اسے سینے سے لگا کر نہیں رکھا جا سکتا۔ ''یادگارِ غالب'' کے دیباچے میں حالی نے دہلی کے اس شاندار دور کا ماتم کیا ہے جو ختم ہو گیا اور اب کبھی واپس نہ آئے گا۔ مولانا محمد حسین آزاد ''آبِ حیات'' کے لکھنے کا مقصد ہی یہ قرار دیتے ہیں کہ بزرگوں کی یادیں محفوظ کر لی جائیں کیوں کہ زمانہ ورق الٹ چکا ہے، مذاق بدل گیا ہے اور کچھ دنوں بعد کوئی ایسا بھی نہ رہے گا، جو قدیم سرمائے کو سینے سے لگائے اور اردو شاعری کے ذخیرے کو پھر سے کھنگالے اور جسے بزرگوں کے حالات و واقعات سے دلچسپی ہو۔ یہی جذبہ تھا جس نے شبلی سے مختلف سوانح عمریاں لکھوائیں اور انہیں اسلام کے شاندار ماضی کی طرف متوجہ کیا۔

اس طرح ادبی تاریخ کے لیے ۱۸۵۷ء بہ یک وقت نقطۂ آغاز بھی ہے اور نقطۂ اختتام بھی۔ اس منزل پر گویا نئے اثرات زمانے کی لگام اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں اور چند مذہبی رہنماؤں اور پختہ خیال قدامت پسندوں کے سوا زیادہ تر لوگ ۱۸۵۷ء کی شکست کو حتمی سمجھنے پر مجبور ہو کر اس عمرانی تبدیلی کو چار و ناچار قبول کرتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء صرف اسی لیے اہم نہیں ہے کہ اس نے ادب اور معاشرت کی پرانی بساط تہ کر دی بلکہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اس لمحے سے ہمارے ادیبوں کو نئے حالات سے ہم آہنگ ہونے کا خیال پیدا ہوا۔ انہوں نے اس شکست کو سنگین اور ناگزیر حقیقت مانا اور اپنے کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔

حالی کی تصانیف میں یہ تصور سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ جیسا کہ احتشام حسین نے ایک جگہ لکھا ہے حالی کے ہاں ''پیروی مغرب'' کی مفاہمت ہی نہیں بلکہ آگے بڑھنے کا ایک راستہ

ہے۔ وہ کبھی کبھی آزادی کے خواب بھی دیکھتے ہیں، کبھی کبھی یہ بھی سوچتے ہیں کہ ہندوستانی انگریزوں کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر تعلیم، صنعت وحرفت اور سائنس کو اپنا کر ان سے آگے نکل جائیں گے اور ہندوستان غلامی میں حاصل کیے ہوئے ہتھیاروں سے آزادی کی منزل تک پہنچ جائے گا۔ شبلی کا تو سارا تصور ہی قومی اور انقلاب دوستی کا رہا ہے۔ انہوں نے مغربیت کے آگے مکمل طور پر ہتھیار نہیں ڈالے اور مشرقی علوم کی قدر ومنزلت اور مشرق کی عظیم روایات سے کبھی منہ نہیں موڑا۔ سیرت نگاری سے شبلی کا مقصد آزادی کی طرح صرف مقدس یادگاروں کو جمع کر لینا نہیں تھا بلکہ ان عظیم شخصیتوں کو مثالی کرداروں کی حیثیت سے پیش کرنا بھی تھا اور اس طرح گویا حال کی تاریکی میں ماضی کی شمعوں سے مستقبل کے لیے راستہ دکھانے کا کام لینا تھا۔

نذیر احمد چوں کہ داستان طراز اور ناول نگار تھے لہٰذا اس ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی کی کشمکش ان کے یہاں کھل کر سامنے آئی ہے۔ ''توبۃ النصوح'' کا کلیم ایک ایسا کردار ہے جس میں وہ تمام ہُنر ہیں جو کبھی بڑی خوبیوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ مغربیت اور نئی روشنی کا اس پر کوئی اثر ہے تو یہی کہ وہ روزہ نماز کا قائل نہیں اور مذہبی رسوم وفرائض کو ڈھکوسلہ سمجھتا ہے۔ نذیر احمد کی کردار نگاری کا یہ بڑا کرشمہ ہے کہ وہ اس دور میں عہدِ جدید کے نمائندہ نوجوان کا تصور کر سکے۔ آج کے نوجوان میں کلیم کا سا شاعرانہ کمال نہ سہی لیکن اس کی روح کی بے چینی ضرور موجود ہے۔ اس کی کم اعتقادی موجود ہے اور رندی اور سرمستی موجود ہے جو اسے نہ تو پرانی دنیا سے پوری طرح سمجھوتہ کرنے دیتی ہے اور نہ نئے نظام کا ایک پُرزہ بن کر جینے پر رضامند ہونے دیتی ہے۔

اس سے بھی زیادہ نمایاں طور پر ''بنات النعش''، ''مرأۃ العروس''، ''ایامیٰ'' اور ''ابن الوقت'' میں نذیر احمد معاشرت کے اسی بحران کی عکاسی کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس بحران کا راستہ وہ سلیقہ مندی میں ڈھونڈ نکالتے ہیں اور ''ابن الوقت'' کے کردار مولوی حجۃ الاسلام کی طرح انگریزوں کی خیر خواہانہ ملازمت اور مذہب کے ظاہری شعائر کی پابندی دونوں میں توازن قائم کرتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی لڑائی ''ابن الوقت'' کے سارے نشیب وفراز کے پس منظر کی حیثیت سے موجود ہے اور یہاں بھی وہی ناگزیر سمجھوتے کی کیفیت نمایاں ہے۔ یہی اثرات اس دور کے بہت سے دوسرے ادیبوں کے ہاں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی لڑائی نے سرسید احمد خاں کے اندازِ فکر کو بدل دیا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے

دہلی کو تاراج ہوتے دیکھا، بجنور کو مٹتے دیکھا، مراد آباد میں انگریزوں کے ظلم و تعدی کا ننگا ناچ دیکھا۔ اس کے باوجود کہ سرسید ہندوستانی مجاہدوں کا ساتھ نہ دے سکے، سرسید نے ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' لکھ کر دنیا کو یہ ضرور جتلا دیا کہ اس لڑائی کی ساری ذمہ داری ہندوستانیوں کے سر نہیں تھی کہ اس کے پیچھے ناانصافیوں کا ایک پورا سلسلہ تھا۔ سرسید اس سلسلے کا کوئی معقول اور انقلابی حل پیش نہ کر سکے۔ انہوں نے انگریزی تعلیم میں ملک کی نجات دیکھی اور تاریخ کے نئے سانچے میں ڈھل جانے ہی کا مشورہ دیا۔

اس کے علاوہ ۱۸۵۷ء کی لڑائی اور شکست نے اردو ادب کو اور بھی کئی حیثیتوں سے براہِ راست متاثر کیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ دہلی اور لکھنؤ کے دبستان کسی نہ کسی حیثیت سے ایک دوسرے کے قریب آ رہے تھے۔ ایک طرف لکھنؤ میں شاگردانِ آتش، میرؔ کا نام لینے لگے تھے اور سوز و گداز اور داخلیت کو شاعری کے بنیادی جوہر سمجھنے لگے تھے، دوسری طرف دہلی میں مومنؔ، ذوقؔ، غالبؔ سے لے کر نوعمر داغؔ تک لکھنؤ کے زیر اثر زبان کے چٹخارے، محاورہ بندی، واسوخت کے انداز اور صنعت گری اور خیال بندی کی طرف توجہ کر رہے تھے۔

مومنؔ کے اشعار کی پیچ در پیچ ساخت اور واسوخت کا گہرا رنگ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ذوقؔ کی محاورہ بندی، ضرب الامثال کی طرف رغبت اور زبان سے دلچسپی بھی اسی پرتو کا نتیجہ قرار پاتی ہے۔ یہ اثر شاہ نصیر سے ان تک پہنچا اور ان سے بہادر شاہ ظفر اور مرزا داغؔ تک آیا۔ خود غالب کے کلام میں صنعت گری اور دشوار پسندی کا جو رجحان آیا اس میں بیدلؔ ہی کا اثر نہیں تھا، لکھنؤ کے اثرات بھی تھے۔ غالبؔ جیسا خوددار اور انفرادیت پسند شاعر ناسخؔ کے مصرعے پر مصرعے لگاتا ہے اور اسی زمین میں اسی انداز کی غزل کہتا ہے۔ کیا یہ شعر لکھنؤ کے دبستان کی یاد نہیں دلاتے؟

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

دھوتا ہوں میں جو پینے کو اس سیم تن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

یہ شاعری خواہ وہ لکھنؤ ہو یا دہلی، دربار کے محور پر گھوم رہی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی آوازیں صرف دربار کے گنبد میں قید نہ تھیں اور شہر کے کوچہ و بازار، محلے اور بستیاں اس رنگ میں رنگ گئی تھیں پھر بھی تہذیب اور معاشرت کا آدرش دربار ہی تھا اور علم و فضل، شرافت اور نجابت کا معیار دربار ہی کی فضا میں ڈھلتا تھا۔ ۱۸۵۷ء نے اس محور کو حتمی طور پر شکست سے دوچار کر دیا۔ بہادر شاہ کی آواز اپنی شکست کی آواز ہی نہ تھی ایک دور کی شکست کی آواز بھی تھی۔

دربار اور ادب کے رشتے کا اختتامیہ دراصل ایک نئی ادبی فضا کے قیام کا پیش خیمہ تھا۔ گو اس کے بعد بھی عارضی طور پر رام پور، اور حیدر آباد کی ریاستوں نے شاعروں کی دست گیری کی لیکن اب شاعری کی عنان درباروں کے ہاتھ میں نہ تھی، اب ادب کی باگ ڈور متوسط طبقے کے ہاتھ میں آ گئی تھی جو نوکر پیشہ تھا اور اس نئے نظام میں کسی نہ کسی طرح اپنے لیے موزوں جگہ پانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اسی سوتے سے شاعری میں نئی آوازیں داخل ہوتی ہیں اور مغربی ادبیات کا اثر نمایاں ہونے لگتا ہے۔ حالی، شبلی، سرسید، آزاد، نذیر احمد، ذکاء اللہ سب کے سب ایسے لوگ تھے جو دربار سے منسلک نہ تھے اور نہ درباداری کے طور طریقوں کو سینے سے لگائے رکھنے پر آمادہ تھے۔ نظامِ معاشرت کی یہ تبدیلی آہستہ آہستہ اور بھی نمایاں ہونے لگی۔ تعلیم اور صنعت و حرفت پر زور دیا جانے لگا اور جاگیردار گھرانوں میں بھی نوکری اور نئی تعلیم کے چرچے ہونے لگے۔ داستانوں میں میرِ داستان کا تاج شہزادوں اور بادشاہوں کے سر سے اُتار کر متوسط طبقے کے گھرانوں کے حصے میں آ گیا۔ اس نئی ادبی فضا نے کون سے رُخ اختیار کیے، یہ جدید اردو ادب کا محبوب موضوع رہا ہے۔ اس فضا کا نقطۂ آغاز ۱۸۵۷ء ہی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

نظامِ تعلیم کی تبدیلی کا ذکر ضمناً آ چکا ہے۔ یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ نئے نظامِ تعلیم نے انگریزی اور مغربی سائنس پر زور دے کر نئی نسل میں ایک جذباتی تضاد کے دروازے کھول دیئے۔ ایک طرف تو وہ انگریزی ادبیات کا مطالعہ اس کے تہذیبی اور روایتی پس منظر کو سمجھے بغیر کر رہے تھے اور اس طرح اس سے بہت سطحی واقفیت رکھتے تھے، دوسری طرف انگریزی ادبیات

کے مطالعے کے ساتھ ساتھ معاشرت اور رہن سہن کا مغربی تصور بھی نئی نسل کی جذباتی تشکیل میں شامل ہوتا جارہا تھا۔ اس طرح مغربی تصور اور مشرقی حقیقت میں وہ کشمکش شروع ہوئی جس کا نشان موجودہ نسل میں بھی پایا جاتا ہے۔ یہ اس جذباتی خلا کی ابتدا تھی جس کے نیم دائرے سے سو سال بعد تک کے ہندوستانی نوجوان باہر نہیں نکل سکے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی لڑائی کو جو لوگ جنگِ آزادی ماننے سے انکار کرتے ہیں وہ ''دین، دین'' کے نعروں کو بھی ثبوت میں پیش کرتے ہیں اور اسے بنیادی طور پر ایک مذہبی لڑائی بتاتے ہیں جو سور اور گائے کی چربی کے کارتوسوں سے شروع ہوئی اور ''دین، دین'' کے نعروں کے درمیان لڑی گئی۔ اس اعتراض کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ ۱۸۵۷ء سے قبل اور اس کے بعد مذہب کی اہمیت میں انقلابی فرق واقع ہوا۔ ۱۸۵۷ء سے قبل مذہب محض ایک شخص کی خود اعتقادی کا نام نہ تھا نہ اسے نجی حیثیت حاصل تھی بلکہ مذہب ساری معاشرت، نظامِ تعلیم اور تربیتی اقدار کا محور ہو گیا تھا۔

اخلاق کا تصور مذہب کے بغیر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ منطق اور فلسفہ، ہیئت اور سیاست ہر ایک شعبے پر مذہبی تصورات حاوی تھے۔ ان مذہبی تصورات کو فرقہ واریت نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ ان میں اپنے دین کی حمایت کا حوصلہ تو تھا لیکن دوسرے مذہبوں کی مخالفت اور دوسرے فرقوں کو کچل ڈالنے کا جذبہ نہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کے دور میں یہ مرکزی حیثیت ختم ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی دوسرے تمام علوم وفنون ایک جداگانہ حیثیت سے دیکھے جانے لگے۔ سائنس اور مغربی تصورات کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی اور اس کے نتیجے کے طور پر جہاں زیادہ سائنٹیفک حقائق نے ہمارے نظامِ تعلیم میں جگہ پائی وہاں وہ قدیم علوم ماند پڑ گئے جنھوں نے صدیوں تک اردو شعر وادب کی آبیاری کی تھی۔ اب مذہب سماجی نظام کا مرکزِ ثقل نہ رہا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد لوگوں کے لیے شاید یہ تعجب کی بات ہو کہ ۱۸۵۷ء کی سیاسی لڑائی میں ''دین'' کے نعرے بلند کیے گئے لیکن ان لوگوں کے لیے یہ حیرت کی بات نہیں ہے جنھوں نے مذہب کو سماجی اقدار کے محور کے روپ میں دیکھا ہے۔

۱۸۵۷ء کی جدوجہد اور اس کی ناکامی کی ایک سمت دین بھی ہے اس نے پہلی بار گورے اور کالے کا تصور اس شکل میں پیدا کیا کہ اس سے قومی احساس بیدار ہوا اور ایک ملی یگانگت کا شعور پیدا ہوا۔ لڑائی کے دوران میں صرف ایک تقسیم روا تھی اور یہ گورے اور کالے کی تقسیم تھی۔ مذہب، نسل، صوبہ اور فرقہ کی ساری تقسیمیں اُٹھ گئی تھیں اور قومیت کا دھندلا سا احساس پیدا ہو چلا تھا۔ اس

لڑائی کی ناکامیابی کے بعد بھی انگریزوں کے تشدد اور ظلم کے سلسلے میں یہی تقسیم ملحوظ رکھی گئی۔ آہستہ آہستہ قومیت کا احساس بیدار ہونے لگا۔ اس شکست سے ہندوستانیوں نے بہت کچھ کھویا اور بہت کچھ سیکھا۔ انہوں نے دیکھا کہ یہ شکست دراصل ایک انحطاط پذیر نظام کی شکست ہے اور جب تک یہ نظام بہتر اور زیادہ طاقت ور نہیں ہوتا اس وقت تک برطانوی حکومت کو حکیم احسن اللہ، مرزا الٰہی بخش اور رجب علی جیسے لاتعداد غدار مل سکتے ہیں۔

تاریخِ ادب کے نقطۂ نظر سے ۱۸۵۷ء کی لڑائی تبدیلی کی ضرورت کے احساس کا نقطۂ عروج تھی اور یہ احساس شاہ ولی اللہ اور وہابی تحریک کے وقت سے مختلف شکلوں میں رونما ہو رہا تھا۔ اس لڑائی نے نہ صرف ہندوستان کے سیاسی مستقبل کو بدل دیا بلکہ اس کی ذہنی تاریخ میں عظیم انقلاب پیدا کر دیا اور نظامِ تعلیم، معاشرت، اخلاق، غرض زندگی کی ساری قدروں میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔

احتشام حسین نے غالبؔ کی ندرتِ فکر کا ماخذ تلاش کرنے کی کوشش میں ان کے سفرِ کلکتہ کو بڑی اہمیت دی ہے کیونکہ کلکتہ اس وقت برطانوی سیاست اور معاشرت کا مرکز بن چکا تھا اور یہیں آ کر غالبؔ کو ایک نئے طرزِ زندگی کا احساس ہوا۔ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد اور اس کی ناکامی نے سارے ہندوستان میں کلکتے کی سیاسی اور معاشرتی صورتِ حال کو عام کر دیا۔ جدوجہد کی ناکامی نے قدیم ناگزیر انحطاط اور مغربی اثرات کے ناگزیر استحکام کو قبول کرنے پر مجبور کیا اور اس کا لازمی انجام یہ ہوا کہ ایک نئی ذہنی اور ادبی فضا وجود میں آ گئی۔

۱۸۵۷ء کی لڑائی کے بارے میں ایک متوازن نظریہ یہی ہو سکتا ہے کہ اسے تاریخی واقعات کے سلسلے سے الگ کر کے نہ دیکھا جائے اور اسے پہلے کی داخلی اور خارجی تحریکات کا نقطۂ عروج قرار دیا جائے۔ علاوہ بریں اس میں شامل ہونے والے مختلف اور متنوع عناصر کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ اس کو آگے لے جانے والے پہلوؤں کو فراموش نہ کیا جائے اور اس کے تاریک گوشوں کو بھی نظر انداز نہ ہونے دیا جائے۔ اسی طرح ۱۸۵۷ء کی لڑائی کا صحیح کردار متعین کیا جا سکے گا اور تاریخِ ادب میں اسکی نوعیت واضح ہو سکے گی۔

ادب کے مورخ کے لیے ۱۸۵۷ء کی جدوجہد جدید اور قدیم اردو ادب کے درمیان حدِ فاصل قائم کرتی ہے۔ یہ حدِ فاصل قطعی اور حتمی نہیں ہے لیکن ۱۸۳۵ء اور ۱۸۷۴ء دونوں تاریخوں

کے مقابلے میں ۱۸۵۷ء کو زیادہ سائنٹیفک حد بندی کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ۱۸۳۵ء میں انگریزی کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا گیا لیکن اس اہم فیصلے سے اردو ادب کی فضا اس وقت تک نہیں بدلی تھی۔ ۱۸۷۴ء میں مولانا محمد حسین آزاد کا وہ مشہور مشاعرہ ہوا جس میں طرحی غزلوں کی جگہ دیئے ہوئے عنوان پر نظمیں پڑھی گئیں اور اس مشاعرے نے اردو شاعری میں نظم نگاری کی بنیاد ڈالی لیکن یہ دراصل شعور کی اس تبدیلی کا نتیجہ تھا جو ۱۸۵۷ء کی ناکام جدوجہد اور اس سے پیدا شدہ لازمی ہم آہنگی کے احساس سے پیدا ہوئی تھی۔ اس طرح ۱۸۵۷ء کی جدوجہد ہماری سیاسی بیداری کی تاریخ ہی میں نہیں ہماری فکری اور ادبی تاریخ میں بھی ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

مشمولہ: سہ ماہی ''ذہن جدید''

نئی دہلی شمارہ ۴۷

اردو ادب:

جنگ آزادی 1857ء کے سیاق میں

نریش ندیم

ہماری پہلی جنگ آزادی (58-1857ء) کی نوعیت اور اس کی ناکامی کے اسباب کے بارے میں طرح طرح کی آراء ظاہر کی گئی ہیں لیکن جو بات کسی اختلاف اور تنازعہ سے پرے ہے وہ یہ ہے کہ اس جنگ نے ہمارے ملک میں سامنتی نظامِ حکومت کی گھنٹی بجادی۔ یہ ایک طرح سے ملک اور اس کے عوام کے لیے اچھا ہی ہوا اور اسی کے ساتھ ہمارے یہاں قوم پرستی کا عروج ہوا۔ جیسا کہ آنجہانی ہرین مکھر جی نے India's struggle for freedom میں دکھایا ہے، 1857 کے بعد ہندوستان وہ نہیں رہا جو اس سے پہلے ہوا کرتا تھا۔

انحطاط مائل سامنتی نظام:

ہندوستان میں سامنتی نظام کا یہ انحطاط مائل کردار، بلکہ اس کا سڑا گلا کردار، اس جنگ آزادی سے بہت پہلے سے ہی اردو شعرا پر واضح تھا۔ مثال کے لیے اس کا پتہ جعفر زٹلی کی تحریروں سے چلتا ہے جنہوں نے اورنگ زیب کی خدمت کو ''دیو کے چوتڑ تلے اندھیرا'' کا لقب دیا تھا۔ ان کی مغلظات بھی دراصل شخصیات کے پردے میں سامنتی نظام کو دی گئی گالیاں ہی ہیں اور عین یہی نظام دشمن کردار تھا جس کے تحت جعفر اورنگ زیب کے دربار سے نکالے گئے، ذہنی توازن قدرے کھو بیٹھے اور پھر 1712ء میں فرخ سیر کے حکم سے بھرے دربار مین تسمہ کشی کرا کے مار ڈالے گئے۔ یا پھر میر تقی میر کو لیجیے جو ایک از حد حساس شاعر تھے اور ان چار عظیم شاعروں میں ایک تھے جنہوں نے 18ویں صدی میں اردو شاعری کی جوانی کو نکھارا اور سنوارا۔ اپنی کچھ شعری تخلیقات میں اور ان سے بھی بڑھ کر اپنی سوانح عمری ''ذکر میر'' میں وہ درد کے ایک شدید احساس کے ساتھ بتلاتے ہیں کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں سلطنت کی باگ تھی وہ کس طرح (1739 میں محمد شاہی دور میں) نادر شاہ نام کے ایک ایرانی گڈریہ کی غارت گری سے یا پھر مرہٹوں کے حملوں سے

سلطنت کی حفاظت میں ناکام اور پکے ناکارہ ثابت ہوئے اور ان کے درد کا یہ احساس تو تب اور بھی شدید ہو جاتا ہے جب وہ یہ بتلاتے ہیں کہ کسی طرح بھرے دربار میں غلام قادر نام کے ایک روہلہ ہجڑے نے بادشاہ شاہ عالم کی آنکھوں میں جلتے سوئے بھونک کر ان کو اندھا کر دیا۔

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی جن کی خاک پا
ان ہی کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

میر کے ہم عصر مرزا محمد رفیع سودا ہندوستانی سامنت واد کے اس انحطاط مائل کردار کو اور بھی وضاحت کے ساتھ لاتے ہیں۔ اگر اپنے بادشاہ یعنی شاہ عالم اور زمانہ کے دوسرے عمائدین کی تعریف میں لکھے گئے ان کے قصیدوں کو جانے دیں تو ان کی ہجویاتی نظمیں دکھاتی ہیں کہ سلطنت کے اراکین کے ناکارہ پن اور ان کی گھور لاپرواہی کے سبب ہی سلطنت کتوں کے حوالے ہو رہی تھی۔ سودا کی ایک نسبتاً ''لمبی'' 35 بند والی نظم ہے، ''ویرانی شاہجہان آباد'' جس میں شاعر کا رونا اسی بات کو لے کر ہے کہ نکموں کی ایک پوری جماعت کس طرح عصری دنیا کے سب سے حسین شہر کو تباہ کر رہی تھی۔ بہت دن نہیں ہوئے جب میر نے دلّی کو ''ہندوستان کا دل'' کہا تھا اور اب یہی شہر شاہجہان آباد مختصراً جہان آباد، (شاہجہان کی بسائی دہلی آج کی پرانی دہلی) اپنے ہی محافظوں کے ہاتھوں برباد ہو رہا تھا۔

میر کے برخلاف سودا ایک کھلنڈری طبیعت کے شاعر تھے اور ان کی ہجویاتی نظمیں سلطنت کے اراکین کا ایک بھیانک، چبھنے والا مخول اڑاتی ہیں۔ اپنے ایک شعر میں وہ دوسروں کو مشورہ دیتے ہیں (درحقیقت طنز کرتے ہیں) کہ

خواہش ہے دو جہاں کی اگر تو زباں سے تو
جز مدحِ شاہ سرّ و علن مت سخن نکال

لیکن اس ''نیک صلاح'' کے باوجود سچائی یہ ہے کہ جہاں تک سلطنت کے اراکین پر کھل کر بے خوف اور تیکھے حملے کرنے کا سوال ہے سودا کا ان کے ہم عصروں میں کوئی جواب ہے ہی نہیں۔ اس سلسلے میں ان کی ایک چبھتی ہوئی نظم ہے ''تضحیک روزگار'' جس میں ایک از حد مریل گھوڑے کی ملامت کا استعمال کر کے سودا نے اپنے دور کی چرمرائی ہوئی مغل سلطنت کا مذاق اڑایا ہے۔ نظم کے عنوان کے دو معنی ممکن ہیں اس میں نہ صرف شاعر اپنے زمانے کا مخول اڑا رہا ہے بلکہ زمانہ بھی

سلطنت کے اراکین کا مخول اڑا رہا ہے۔

عجوبوں کی دنیا:

سودا کی یہ دنیا عجوبوں کی دنیا ہے: یہ، 19ویں صدی کے روس میں نکولائی گوگول نے ''مردہ روحوں'' کے ذریعہ جس طرح کی دنیا خلق کی تھی، اس سے کم عجیب وغریب دنیا نہیں ہے۔ سودا کی یہ دنیا ان سامنت سرداروں کی دنیا ہے جو عقل، منطق، شجاعت اور دوسری عمدہ صفات سے ایک دم خالی ہیں۔ اپنے آپ کو عقل میں وہ تکبر کے مارے بہلول سے کم نہیں سمجھتے لیکن جب انتظامی امور سے متعلق کوئی بات کرتا ہے تو منہ دوسری طرف پھیر کر ''بابا کچھ اور باتیں بول'' کہنے لگتے ہیں۔ اس دنیا میں ہمیں وہ پیادے نظر آتے ہیں جو نائی سے سر منڈاتے ڈرتے ہیں اور وہ سوار نظر آتے ہیں جو خواب میں بھی گھوڑا ہنہنائے تو چارپائی سے نیچے گر پڑتے ہیں۔ سرداروں کا عالم یہ ہے کہ ان کے طویلوں میں گھوڑے بھوک سے بلبلا رہے ہیں اور ہاتھیوں کے راتب کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ نیز، بہت دن نہیں ہوئے جب ان سرداروں کے طویلوں میں عمدہ نسل کے عراقی اور عربی گھوڑوں کا کوئی شمار نہیں تھا لیکن ان ہی کا اب یہ حال ہے کہ موچی سے جوتی ادھار مرمت کراتے ہیں۔ ان کی کنیزیں اتنی کمزور ہو چکی ہیں کہ ان میں سر پر خوان اُٹھانے کی سکت نہیں رہی اور نوکروں کو پتہ ہی نہیں کہ ان دنوں روپیہ کی شکل کیسی ہے، گول ہے کہ چپٹی ہے۔ یوں کہ ان کو کل آٹھ آنے ماہانہ کی اجرت ملتی ہے اور وہ بھی مہینوں مہینوں نصیب نہیں ہوتی۔ وہ محل جن کے دیکھے سے انسان کی بھوک اور پیاس جاتی رہتی تھی، آج انہیں کے چمن میں کمر کمر گھاس اُگ رہی ہے اور نکموں کی ایک پوری جماعت نے مل کر شاہجہاں آباد کو اس حال تک پہنچا دیا ہے کہ شاعر کو اپنے شہر کے نام پر رونے کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں رہتا۔

جہاں آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا!

یہاں سودا اپنے شہر کا ماتم کرتے ہوئے ایک علامت کا استعمال کرتے ہیں۔ ''نقش باطل'' ایک بچہ اپنی تختی پر کچھ لکھتا ہے اور جب پاتا ہے کہ اس نے کچھ غلط لکھ دیا ہے تو اسے مٹا دیتا ہے۔ مقدر نے اسی طرح جہاں آباد مٹا دیا ہے گویا کہ وہ دنیا کی تختی پر لکھا ہوا غلط حرف ہو۔ تو بھی اتنی بات صاف ہے کہ سودا کو لگتا ہے ان لٹیروں سے کوئی شکایت نہیں ہے جنہوں نے جہاں آباد پر ستم

ڈھائے۔ فطری بات ہے جب تیموری گھرانا ہی عقل و دانش اور مردانگی سے خالی ہو گیا تھا تو پھر ایک روہیلہ ہجڑے کو یا ایک ایرانی گڈریہ کو گالی دینے کی بھلا تک باقی رہتی تھی!

کھوئی گئی دنیا:

انحطاط مائل ہندوستانی سامنت واد کا ٹھیک یہی سیاسی ڈھانچہ 1857 کی جنگ کے بعد ایک ڈرامائی اختتام کو پہنچا۔

اردو ادب میں یہ بات ایک بڑے عجیب و غریب ڈھنگ سے ظاہر ہوتی ہے۔ سامنتی نظام کے متواتر زوال کی پوری پوری آگہی اردو شاعر کو ضرور تھی لیکن دوسری طرف وہ دہلی کے یا دیسی رجواڑوں کے دربار سے جڑا ہوا بھی تھا۔ اس سے وظائف اور انعام واکرام پاتا تھا۔ لہذا دہلی کا یا اودھ کا زوال یا پھر فرخ آباد، لوہارو یا فیروز پور جھرکہ جیسی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا زوال اردو ادیب کی دنیا کا اس سے چھن جانا بھی تھا۔ اس بات نے ہمارے ادیبوں کو فطری طور پر اور براہِ راست متاثر کیا، سب سے پہلے تو اس معاش سے محروم کر کے جو وہ اپنے اپنے راجاؤں اور نوابوں سے پاتے تھے۔ اس صورت میں غدر کے کچلے جانے کے بعد انگریزوں کی بھیانک غارت گری، ظلم رانی اور انتقامی کارروائیوں نے ملکی نظام کی اپنی اندرونی کمزوریوں کو پردہ کے پیچھے ڈال دیا اور اب تمام شاعروں کا عام سُر یہی تھا کہ ایک غیر ملکی قوت نے ایک عظیم تہذیب کو بے رحمی کے ساتھ غارت کر دیا ہے۔

1857-58 کی جنگ عظیم تہذیب اور اسے کچلنے کے لیے انگریزوں کے بھیانک ظلم و جبر کے بارے میں اردو میں بہت بھاری بھرکم ادب موجود ہے اتنا بڑا کہ اگر تمام تخلیق کا مختصراً چرچا بھی کرنا چاہیں تو الف لیلہ کی کئی راتیں گزر جائیں لیکن اس دور کی زیادہ تر تخلیقات غدر کے فوراً بعد کے دو یا تین برسوں کے دوران گمنامی کی حالت میں رہیں۔ سبب بہت سیدھا سا تھا۔ ایک ایسے دور میں جب کہ انگریزوں کو کسی کے بھی باغیوں کا ہمدرد ہونے کا ذرا بھی شک ہوتا تھا تو اسے پھانسی پر لٹکا دیتے تھے، اردو کا ادیب بھلا اظہار کی آزادی کی کیا اور کتنی امید رکھتا! پھر بھی ہمارے شاعر اور ادیب سامنے آ رہے واقعات کو اس امید پر چپکے چپکے درج کرتے رہے کہ اس بھیانک دور میں ان پر کیا کیا گزری، اسے آنے والی نسلیں ایک دن جان سکیں گی۔

ایسی تصانیف کی سب سے جانی پہچانی مثال غالبؔ کی دستنبو ہے جسے انہوں نے تب لکھا تھا

جب وہ غدر اور پھر انگریزوں کی انتقامی کارروائیوں کے دوران زیادہ تر اپنے گھر میں قید رہے۔ (وہ درحقیقت انگریزوں کے قہر سے بچ رہے تو صرف اسی لیے کہ ان کے دوست مہاراجہ پٹیالہ نے اپنے سپاہیوں کا ایک دستہ ان کے گھر کے باہر تعینات کر دیا تھا) اس میں غالبؔ نے 58-1857 کے واقعات کا ایک روزنامچہ درج کیا ہے۔ اگرچہ اسے کوئی اونچے درجہ کا ادب نہیں سمجھا جاتا البتہ اس دور میں انہوں نے اپنے محبوب شاگرد مرزا ہرگوپال تفتہؔ کے نام یا پھر ملک کے دوسرے حصوں میں اپنے دوستوں کے نام جو خطوط لکھے وہ مواد کے اعتبار سے ازحد باوقار ہیں اور ادبی شاہکار سمجھے جاتے ہیں۔

بولنے کی جرأت:

اس دور کی ایک اہم تصنیف محمد حسین آزادؔ کی نظم ''فتحِ افواج شرق'' ہے جو دہلی اردو اخبار میں 24 مئی 1857 کو شائع ہوئی تھی، یعنی غدر کے عروج کے دنوں میں۔ آزاد کے والد مولانا محمد باقر اس اخبار کے ایڈیٹر اور مالک تھے اور ان کو بے خوف صحافت کی سزا کے طور پر آگے چل کر انگریزوں نے انہیں پھانسی پر لٹکا دیا تھا۔ اس نظم میں آزاد نے تھوڑے گھماؤ دار ڈھنگ سے سہی، انگریزوں کی شکست کا خیر مقدم کیا ہے جس کے سبب آزادؔ کی بھی کھوج بین کی گئی پر وہ کسی طرح بچ نکلے۔

یہاں خاص ذکر کیا جانا چاہیے ''فغان دہلی'' کا جو 1861 میں شائع ہوئی تھی، یعنی کہ انگریزوں نے تکبر کے ساتھ اپنے ملک کے بالاترین مقام کا اعلان کرنے کے لیے دہلی میں جب ایک دربار کا انعقاد کیا، اس کے محض تین سال کے اندر۔ یہ کتاب دو طرح سے اہمیت کی حامل ہے۔ ایک تو غالباً پہلا موقعہ تھا جب اردو میں مختلف شاعروں کے کلام کا ایک مجموعہ (اینتھالوجی) شائع ہوا تھا اگرچہ ہمارے شعرا کو اینتھالوجی (Anthology) کے یورپی تصور کا علم پہلے بھی تھا۔ اس طرح صنف کی سطح پر یہ کتاب اردو ادب میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس میں کوئی 40 شاعروں کی جو نظمیں جمع تھی وہ اس کی جھلک دکھاتی تھیں کہ ان بھیانک دنوں میں کیا کیا ہوا۔ شہر کی لوٹ اور غارت گری، باغیوں اور عام شہریوں پر بھیانک ظلم، امیروں اور سرداروں کی بد سے بدتر ہوتی ہوئی حالت، ان سب کا اظہار ان نظموں

میں ہوا ہے۔ برطانوی انتقام کی بربریت کے سبب ان میں کچھ نظموں کے اظہار کے پیرائے ضرور گھماؤ دار ہیں اور جو لوگ اردو میں اظہار کے پیرایوں سے انجان ہیں ان میں کچھ اس سے دھوکہ بھی کھا سکتے ہیں، پھر بھی شاعر جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ پوری طرح واضح ہے۔ یہ نظمیں صاف طور پر بتلاتی ہیں کہ کس طرح مسلمانوں کو انگریزوں کا جبر اور ظلم جھیلنا پڑا اور ایک نظم تو کسی اگر کے بغیر صاف صاف کہتی ہے کہ 58-1857 کے دوران دہلی میں صحیح سلامت جسم والا ایک نوجوان بھی ایسا نہ تھا جو پھانسی سے بچا ہو۔ اس قدر کھلے لفظوں میں یہ بات کہنا یا بالا مذکور مجموعہ میں ایسی کسی نظم کا شامل کیا جانا ان دنوں کے حالات میں اپنے آپ میں جرأت مندی کی انتہا تھا۔ کچھ نظموں کا اختتام تو بہت ہی مثبت ہے اور ان میں یہ اُمید ظاہر کی گئی ہے کہ دہلی پھر آباد ہوگی، اس کے اچھے دن پھر پلٹیں گے۔ کیا یہ، گھما کر یہ اُمید ظاہر کرنا نہیں تھا کہ ملک میں انگریزی راج بہت دنوں تک نہیں چلنے والا؟

ایسی ہی جرأت مندی نظر آتی ہے مفتی صدرالدین خان آزردہؔ کی نظم ''فغان دہلی'' میں۔ یعنی کہ اس کا عنوان وہی ہے جو بالا مذکورہ مجموعہ کا ہے۔ یہ نظم نواب مصطفےٰ خان شیفتہؔ کی گرفتاری اور دہلی کے اعلیٰ درجے کے ایک عالم و فاضل شخص مولانا امام بخش صہبائی کے قتل کے سیدھے سیدھے حوالے دیتی ہے۔ غور طلب ہے کہ کوچۂ چیلان میں سینکڑوں دوسرے لوگوں کے ساتھ صہبائی اور ان کے دو بیٹوں کو بھی انگریزوں نے اپنی انتقامی مہم کے تحت گولیوں سے بھون دیا تھا۔

قیمتی شہادتیں:

اس دور کے ایک اہم شاعر تھے منیرؔ شکوہ آبادی جو فرخ آباد کے دربار سے جڑے ہوئے تھے اور اردو شاعری کے لکھنؤ دبستان کی ایک سرکردہ ہستی مانے جاتے ہیں۔ غدر کی شروعات کے کچھ ہی دنوں بعد منیرؔ کو گرفتار کر کے باندہ جیل میں بند کر دیا گیا۔ جسمانی تکلیفیں دی گئیں۔ انہیں رہا کیا گیا، پھر گرفتار کیا گیا، مقدمہ چلایا گیا اور آخر کار انڈمان بھیج دیا گیا۔ ایک بیان کے مطابق منیرؔ کو اونچے درجہ کی ایک طوائف نواب جان نامی کے قتل کی سزا دی گئی تھی لیکن یہ ماننے کا پورا پورا جواز موجود ہے کہ یہ مقدمہ آغاز تا انجام گھڑا ہوا تھا اور اس میں منیر کو جھوٹا پھنسایا گیا تھا، ویسے ہی جیسے دہلی اردو اخبار کے مولانا باقر کو دہلی کالج کے پرنسپل ٹیلرؔ کے قتل کے جرم میں پھنسا کر پھانسی دی گئی

تھی۔ اودھ کے علاقہ پر ان دنوں کیا کیا بیتی، اسے جاننے کے لیے منیر کی نظمیں قیمتی شہادتوں کا درجہ رکھتی ہیں۔

دہلی اودھ اور روہیل کھنڈ کے حالات کے بارے میں جاننے کے لیے اتنی ہی قیمتی شہادتیں تخت سے معزول بادشاہ بہادر شاہ ظفرؔ، ان کے دربار کے ایک نوجوان مگر عمدہ شاعر ظہیرؔ دہلوی، قربان بیگ، سالکؔ، محمد علی تشنہؔ، آغا ہجوؔ، شرفؔ، حکیم آغا جان عیشؔ، داغؔ دہلوی، برقؔ لکھنوی، غالبؔ کے شاگردوں، الطاف حسین حالیؔ اور میر مہدی مجروحؔ کی نظمیں ہیں۔ یہاں ہم نے بس تھوڑے سے شاعروں کے نام درج کیے ہیں۔

اردو ادیبوں نے بغاوت کی کچھ بھری پوری روادادیں بھی لکھی ہیں۔ ان میں سب سے اہم یہ ہیں:

مولوی ذکاء اللہ کی ''تاریخ عروج انگلیشیا'' جو کہ ان کی تصنیف ''تاریخ ہند'' کی نویں جلد ہے، ظہیر دہلوی کی تصنیف ''داستانِ غدر'' اور سید احمد خان کی تصنیفات ''سرکشی بجنور'' اور ''اسباب بغاوت ہند''۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ''روزنامچہ غدر'' کے عنوان سے کیا تھا۔ یہ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

ان میں سے زیادہ تر شاعروں اور ادیبوں نے مصحفیؔ کی روایت کو ہی اپنایا جن کو اردو شاعری کے دہلی اور لکھنؤ دبستانوں کو جوڑنے والی کڑی مانا جاتا ہے۔ مصحفیؔ نے صاف طور پر لکھا تھا: ''کافر فرنگیوں نے ہندوستان کی تمام دولت اور شان وشوکت دغابازی سے چھین لی۔''

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس زمانہ میں ''کافر'' لفظ کا استعمال بالعموم ہندوؤں نہیں بلکہ انگریزوں کے لیے کیا جاتا تھا اور ہندوؤں کے لیے مستعمل لفظ ذمّی تھا۔ ولیئم ہنٹر نے اپنی کتاب ''ہندوستانی مسلمان'' ہندی 1857 میں شائع شدہ کتاب، ترجمہ: نریش ندیم، پرکاش سنستھان، دیانند مارگ، دریا گنج، نئی دہلی۔110002) میں جو درجنوں اقتباسات دیئے ہیں ان میں ''کافر'' لفظ کا استعمال عین اسی ڈھنگ کا دکھائی دیتا ہے۔

مصحفی کی ہی طرز پر اسباب بغاوت ہند میں سرسید احمد خان نے جو ابھی سر نہیں بنے تھے، صاف طور پر کہا کہ ہندوستان کے عوام کی خوشنودی سے محروم رہنے کے، انگریز خود ہی ذمہ دار ہیں۔ انہوں نے لکھا: ''یہ سرکار کا کام تھا کہ وہ کوشش کرے اور رعایا کی ہمدردی حاصل کرے، نہ کہ

رعایا کا فرض کہ وہ حکومت کے لطف و کرم کی سعی کرے۔ اب برطانوی راج کو قائم ہوئے سو سال سے بھی اوپر ہو چکے ہیں لیکن اب تک اس نے لوگوں کے دل نہیں جیتے۔'' اور کوئی دو دہائی بعد شاد عظیم آبادی نے انگریزوں کی خوش انتظامی کے پرچار کی اس طرح دھجیاں اڑائیں۔

سبزہ پامال، کلی شاخ پہ مرجھائی ہے
اور ہے شور کہ گلشن میں بہار آئی ہے

1857 کی یہ جنگ عظیم اردو ادب کی تاریخ میں بھی ایک موڑ کا نقطہ آغاز ثابت ہوئی اور اس میں ایک رینا ساں کا سبب بنی۔ اب جو بنیادی سوال ہر ہندوستانی کے ذہن میں اٹھا یہ تھا کہ ''یوں بھلا کیسے ہوا کہ مٹھی بھر انگریزوں نے ملک کا سارا وقار چور کر کے رکھ دیا اور مغلیہ سلطنت کو تہس نہس کر دیا، جو ابھی ایک یا ڈیڑھ صدی پہلے تک ایران کے صفوی اور ترکی کے عثمانی گھرانے کے ہمراہ دنیا کی تین بڑی طاقتوں میں سے ایک ہوا کرتی تھی؟''

مورخین نے اس سوال پر بہت سی باتیں کہی ہیں، بہت کچھ آگے بھی کہا جائے گا لیکن 1857 کے فوراً بعد کے دور میں ایک منتقن کے عمل میں پھنسے ہوئے ہندوستانی ذہن نے اس کی جو تشریح پیش کی، اس کا بنیادی عنصر مذہب تھا۔ ہم اس سے اتفاق کریں یا نہ کریں، پر ہمارے اجداد جس نتیجہ پر پہنچے وہ یہی تھا کہ آزادی کی اس جنگ میں ہماری شکست کا بنیادی سبب ہمارا مذہب سے منہ موڑ لینا تھا۔ جب تک ہندو اور مسلمان اپنے مذاہب پر عمل پیرا رہے، سب کچھ ٹھیک چلتا رہا لیکن جب وہ اپنے اپنے مذہب سے دور ہٹ گئے تو ان کی بربادی کا راستہ بھی صاف ہو گیا۔

اس میں کچھ بھی حیران کن نہیں تھا۔ اینگلز کے نام ایک خط میں مارکس نے بھی اس کی چھان بین کا مشورہ پیش کیا تھا کہ یورپ کی تاریخ کیوں بھلا مذہب کی تاریخ بن کر سامنے آتی ہے۔

جو بھی ہو، حقیقت یہی ہے کہ مذہب ہندوستان میں سیاسی لام بندی کی ایک اہم بنیاد رہا ہے۔ شاہ ظفر نے جب لال قلعہ کے پرکوٹے سے باغیوں کو مخاطب کیا تب انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں سے ان کے مذاہب کے نام پر ہی گہار کی تھی۔ غدر کے دوران مولوی احمد اللہ شاہ عرف ڈنڈا پر جیسی کرشماتی شخصیت کے پرچوں میں بھی عین یہی بات نظر آتی ہے۔ مذہبی اپیل کی یہ روایت آگے بھی جاری رہی جیسا کہ ہم وہابی اور فرائضی تحریکوں کے، تلک، پین چندر پال اربندگھوش اور گاندھی کے معاملوں میں دیکھتے ہیں۔

مذہب کے نام پر سیاسی لام بندی نے آگے چل کر بڑے بڑے گل کھلائے اور اس کے چلتے ملک تک بٹ گیا۔ آج بھی ہم اس کے نتیجے بھگتنے کے لیے معتوب ہیں لیکن ان دنوں یہ عوام کو مایوسی کے گڑھے سے نکال کر میدانِ عمل میں لانے کا ذریعہ ضرور بنا۔ تلک کے گن پتی تیوہار کی مثال سامنے ہے۔

مذہب پر مشتمل اس رینا ساں سے اردو ادب بھی اچھوتا نہیں بچا۔ الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد سے لے کر اکبر الہ آبادی تک اور پھر شیخ محمد اقبال اور برج نارائن چکبست تک سب کا بنیادی سُر وہی تھا جو سیاست میں تلک اور پال کا، وہابیوں اور فرائضیوں کا تھا۔

امتزاج اور کھلا پن:

لیکن جہاں وہابی تھے بنیاد پرست اور تلک تھے اور سماجی سطح پر قدامت پرست، وہیں اردو شاعر کے یہاں ایک قابل ذکر کھلا پن دکھائی دیتا ہے جو مشرق اور مغرب کے مابین قرابت کا مخالف بھی نہ تھا۔ اگر ہم اکبر الہ آبادی کو چھوڑ دیں، حالی، آزاد، اقبال اور چکبست میں سے کوئی بھی شاعر مغربی علوم وفنون اور تکنالوجی کو اپنانے اور اپنے مطابق ڈھالنے کے خلاف نہیں تھا۔ یہ صحیح ہے کہ یہ سب لوگ ہندوستان (یا مشرق) کی ''امتیازی خصوصیت'' کے نام پر مغربی علوم وفنون کا امتزاج، مشرق کی روحانیت سے کرانا چاہتے تھے لیکن پھر بھی مغرب میں جو کچھ مثبت تھا اسے قبول کرنے کا ایک میلان ہمیں واضح نظر آتا ہے۔

اصلاح کی ضرورت پر زور، سوچ کی اسی طرز کا ایک لازمی نتیجہ تھا۔ اگر ہمارے ادیب مغرب سے کچھ لینا چاہتے تھے تو اسی لیے کہ اپنے سماج اور اپنی تہذیب میں ان کو کچھ کمیاں، کچھ خامیاں نظر آتی تھیں اور زندگی کے ایسے شعبوں میں اصلاح کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ یہی سوچ تھی جس کے تحت حالی نے اپنی مشہور زمانہ مسدس لکھی جسے سرسید اپنی نجات کی ضمانت سمجھتے تھے۔ کہا کرتے تھے: حشر کے روز جب اللہ پوچھے گا کہ تم نے دنیا میں جا کر کیا کیا تو میں کہوں گا کہ میں نے حالی سے ان کی مسدس لکھوائی۔''

دراصل جہاں تک اصلاحات کا سوال ہے، 1857 کے بعد کا اردو ادیب تلک یا وہابیوں کی نسبت راجہ رام موہن رائے کے کہیں زیادہ قریب تھا اور رام موہن رائے کی طرح ہم اردو ادیب کو

بھی قدامت پسندوں کی بھیانک مخالفت کا سامنا کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ان قدامت پسندوں میں جو لوگ تھوڑے سے جنونی تھے ان کی طرف سے حالی یا چکبست کو برابر دھمکیوں یا گالیوں یا دونوں سے بھرے خطوط موصول ہوتے رہتے تھے۔

ایسے ماحول میں خود ادب کہاں اور کب تک اصلاحات سے بچارہ سکتا تھا معروف ترقی پسند تنقید نگار مرحوم احتشام حسین نے صحیح کہا تھا کہ سانتی نظام نے اردو شاعر کی قوت اظہار پر بہت سخت پابندیاں لگا رکھی تھی اور ان پابندیوں سے اسے نجات 1857 نے ہی دلائی۔مثال کے لیے ہم غالبؔ جیسے قادرالکلام شاعر تک کو غزل کے دامن کی تنگی کی شکایت کرتے ہوئے پاتے ہیں اور ان کے شاگرد حالیؔ نے اور آزاد نے بھی آنے والی نسلوں کے لیے یہ وسعت پیدا کرنے کی جان توڑ اور کامیاب کوشش کی۔سودا اور نظیر اکبرآبادی کی پرانی نظم کے برعکس نئی نظم کو سیدھے سیدھے مغربی ادب کے زیر اثر فروغ حاصل ہوا۔ٹامس گرے کی مشہور نظم "Elegy Written in a Country Churchyard" کا نظم طباطبائی نے بہت ہی خوبصورت منظوم ترجمہ ''گورِ غریباں'' کے عنوان سے کیا۔مغربی نظم کی نئی صنف کو مقبول بنانے میں اس کی بھاری اعانت رہی۔

مغربی علوم وفنون اور طرزِ تعلیم کو قبول کرتے ہوئے بھی کچھ ادیب انگریزی راج کے بے باک مخالف تھے۔چکبست کی نظم ''لارڈ کرزن سے ایک جھڑپ'' ایک کافی مزیدار نظم ہے۔یہ صحیح ہے کہ اس جابر وائس رائے سے شاعر کی یہ جھڑپ ایک سپنے میں ہوتی ہے لیکن اس نظم کی اشاعت اپنے آپ میں حوصلہ مندی کی انتہا تھی۔یہ وہی چکبست تھے جو تلک کے مداح تھے اور جنہوں نے بہت پہلے 1906 میں ہی جنوبی افریقہ میں گاندھی کے ستیہ گرہ کی ثناخوانی کی تھی۔

اس طرح اردو میں ترقی پسند ادب کی تحریک جب 1930 کی دہائی میں ایک شکل لینے لگی تو یہاں اس کے لیے ایک موافق زمین پہلے سے تیار تھی۔اتنا ہی نہیں یہ بھی ایک اٹل سچائی ہے کہ 1936 میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام میں اردو کے شاعر اور ادیب پیش پیش رہے۔جو لوگ اپنے اندھے تعصب کے تحت اردو کو ایک ''غدار زبان'' ٹھہراتے ہیں کیا وہ لوگ اس سے انکار کر سکتے ہیں کہ 1857 کی جنگ آزادی اور اس کے بعد کے دور سے اپنے براہِ راست تعلق کے طفیل اردو نے سامراج مخالف ادب کا جو بھاری ذخیرہ پیدا کیا دوسری کسی ہندوستانی زبان میں اس کی مثال شاید ہی ملے۔

غالبؔ اور غدر

مسعود حسن شہابؔ

غالبؔ کی زندگی کا یہ ایک عجیب سانحہ ہے کہ اپنی انگریز دوستی کے باوجود وہ غدر کی ہنگامہ خیزی سے محفوظ نہ رہ سکے اور ان پر غداری کا الزام بھی لگا، پنشن بھی بند ہوئی اور منصب بھی منسوخ ہوا۔ دستنبو کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''جو حالت کہ اس وقت درپیش ہے ظاہر ہے کہ اس کا انجام یا موت ہے یا بھیک مانگنا۔ پہلی صورت میں یقیناً یہ داستان ناتمام رہنے والی ہے اور دوسری صورت میں نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ کسی دوکان سے دھتکارے گئے اور کسی دروازے سے کوڑی پیسہ کچھ مل گیا۔ پس اپنی ذلت و رسوائی کے سوا اب اس میں لکھنے کا کچھ باقی نہیں رہا۔ قدیم پنشن اگر مل بھی گئی تو بھی کام چلتا نظر نہیں آتا اور نہ ملی تو کام ہی تمام ہے۔ مشکل یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں چونکہ اس شہر کی آب و ہوا اب خستہ دلوں کو راس آتی معلوم نہیں ہوتی، ضرور شہر چھوڑنا اور کسی اور بستی میں جا کر آرام کرنا پڑے گا۔''

یہ مرزا صاحب کی افتادِ طبع تھی یا حالات کی مجبوری کہ وہ سلاطین و امراء کے قصیدہ خواں رہے۔ بہادر شاہ ظفرؔ جن کی عملداری لال قلعے تک محدود تھی ان کی مدح گستری بھی کی اور حکومت انگلشیہ جس کی نمک خواری انہیں ورثہ میں ملی تھی اس کے دعا گویوں میں بھی شامل تھے۔ چنانچہ جب دہلی اور ملک کے دیگر حصوں سے انگریزی عملداری کے خلاف علم بغاوت بلند ہوا اور ہر طرف دار و گیر کا سلسلہ شروع ہوا تو جانب دارانِ قلعہ پر آفات کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ انگریزوں نے بے دریغ انہیں تہ تیغ کیا۔ یا ہمیشہ کے لیے جلاوطن کر دیا۔ مرزا غالبؔ بھی باز پرس سے نہ بچ سکے۔ ان پر الزام تھا کہ انہوں نے دہلی پر باغیوں کے قبضہ کی خوشی میں بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں قصیدہ پیش کیا تھا۔ یہ بھی کہا گیا تھا کہ غالبؔ نے بہادر شاہ ظفرؔ کے سکے کہے تھے۔ یہ الزام صحیح ثابت نہ ہوئے اس لیے سزا سے تو بچ گئے لیکن انگریز سے جس لطف و عنایت کے امیدوار تھے اس

سے بھی محروم رہے۔ نہ کسی خدمت کے قابل سمجھے گئے نہ دربار وخلعت کے لائق، یہاں تک کہ پنشن بھی موقوف ہوگئی۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اب تک میں اپنے آپ کو یہ بھی نہیں سمجھا سکا کہ بے گناہ ہوں یا گنہگار، مقبول ہوں یا مردود۔ مانا کہ کوئی خیر خواہی نہیں کی جو نئے انعام کا مستحق ہوں لیکن کوئی بے وفائی بھی سرزد نہیں ہوئی جو دستور قدیم کو برہم مارے۔''

یادگار غالب میں مولانا حالی لکھتے ہیں:

''غدر کے زمانے میں مرزا، دہلی سے بلکہ گھر سے باہر نہیں نکلے۔ جونہی بغاوت کا فتنہ اُٹھا انہوں نے گھر کا دروازہ بند کرلیا اور گوشۂ تنہائی میں غدر کے حالات لکھنے شروع کیے۔ اگرچہ فتح دہلی کے بعد مہاراجہ پٹیالہ کی طرف سے حکیم محمود خان مرحوم اور ان کے ہمسایوں کے مکان پر، جسمیں ایک مرزا بھی تھے حفاظت کے لیے پہرہ بیٹھ گیا تھا اس لیے وہ فتح مند سپاہیوں کی فتح کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رہے مگر پھر بھی ان کو طرح طرح کی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔''

مولانا حالی نے اس ضمن میں مرزا کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کی بے بسی کی موت اور سپردگی کی حالت میں ان کی تجہیز وتکفین کا واقعہ بھی لکھا ہے۔ خود مرزا صاحب کے مکان پر سپاہیوں کی یلغار اور مرزا صاحب کا کرنل برون کے سامنے پیش کیے جانے کا واقعہ کم اندوہناک نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مرزا صاحب ملکہ معظمہ کے مدحیہ قصیدے کی رسید اور وزیر ہند کی چٹھی دکھا کر گلوخلاصی کرا آئے لیکن تنگدستی وعسرت نے پھر بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور وہ گھر کا کپڑا اور اوڑھنا بچھونا بیچ بیچ کر کھاتے رہے۔

ایام غدر اور اس کے تقریباً ایک سال بعد تک مرزا صاحب کی یہی حالت رہی۔ بادی النظر میں اس کا سبب قلعہ دہلی سے ان کے روابط کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ تعلق معاش کی حد تک محدود تھا اور قصیدہ خوانی گویا ان کی معیشت کا ایک ذریعہ تھا، اس لیے نہ انگریز نے انہیں اس وجہ سے گردن زدنی سمجھا اور نہ مجرد یہ بات ان کی بدحالی و پریشانی کی وجہ ہوسکتی ہے۔ دراصل جن

عمائدین سے مرزا صاحب کے تعلقات تھے اور جن کے ساتھ ان کی شبانہ روز کی نشست و برخاست تھی، وہ مسلمہ طور پر انگریز کے باغی قرار دیئے جا چکے تھے۔ ان عمائدین میں مولانا فضل حق خیر آبادی کا نام سرفہرست آتا ہے۔ ان کے ساتھ مرزا کے تعلقات نہایت دوستانہ تھے۔ مرزا کی مشکل پسندی کو ترک کرانے میں ان کا بھی ہاتھ تھا۔ انہوں نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دینے کا فتویٰ دیا اور جابر حاکم کے سامنے کلمۃ الحق کا اعلان کر کے افضل الجہاد کی مثال قائم کی۔ جس کی پاداش میں انہیں حبس دوام بہ عبور دریائے شور کا حکم ملا اور انڈمان میں وفات پا کر قید فرنگ سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہوئے۔

دوسرے نمبر پر دہلی کے صدر الصدور مفتی صدر الدین آزردہؔ کا نام آتا ہے۔ یہ بھی مرزا غالبؔ کے بڑے شفیق دوستوں میں سے تھے اور اپنے علم و فضل اور سخن دانی و سخن فہمی میں یکتائے روزگار سمجھے جاتے تھے۔ ایک بار آپ کے سامنے مرزا کے خلاف قرض کا مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے مرزا کی طرف سے جواب دعویٰ کی بجائے یہ شعر سن کر۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مرزا غالبؔ کے خلاف ڈگری تو دے دی۔ لیکن قرض کا سارا روپیہ اپنے پاس سے ادا کر دیا۔ انگریزوں کے خلاف جہاد کی حمایت میں آپ نے بھی فتویٰ پر دستخط کئے تھے۔ اس لیے کئی دن حوالات میں رہے مقدمہ چلا، بعد میں جان بخشی تو ہوگئی لیکن نوکری موقوف اور جائیداد ضبط ہوگئی۔

مفتی صاحب کی طرح نواب مصطفےٰ خان شیفتہؔ بھی علم و فضل اور ذوق شعر و ادب سے مالا مال تھے۔ مرزا غالبؔ کی قدر دانی اور دوستی کا فخر انہیں بھی حاصل تھا۔ ان پر بھی باغیوں کی اعانت کا الزام تھا اور اس جرم میں نہ صرف جائیداد ضبط ہوئی بلکہ سات سال قید کا بھی حکم ہوا۔

انقلاب کے ہنگامہ گیر و دار میں مولانا فضل حق خیر آبادی تو ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔ لیکن مفتی صدر الدین اور نواب مصطفےٰ خان شیفتہ کا دم غنیمت تھا۔ بعد میں یہ بھی افتاد سے دو چار ہو گئے۔ مرزا غالبؔ میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''دہلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔ اہل اسلام میں صرف تین آدمی باقی

ہیں۔ میرٹھ میں مصطفےٰ خان، سلطان جی میں مولوی صدرالدین، بلی ماروں میں سگِ دنیا موسوم بہ اسد تینوں مزدود، مطرود، محروم و مغموم۔''

بایں ہمہ کہ مرزا صاحب نے فتنہ و فساد میں کوئی دخل نہیں دیا بلکہ مکہ معظمہ کا قصیدہ لکھ کر وہ خود کو نمک خواران حکومت انگلشیہ میں شامل کرانے کے لیے کوشش کرتے رہے۔ لیکن انگریز کے دل میں ان کے لیے کوئی جگہ پیدا نہ ہوسکی۔ حتیٰ کہ ان کی پنشن تو بہ ہزار دقت بحال ہوگئی۔ لیکن خلعت و دربار کے اعزاز سے محروم رہے۔ ظاہر ہے کہ مرزا صاحب کے ساتھ انگریزوں کی یہ سرد مہری صرف اس وجہ سے نہ تھی کہ وہ ملازمانِ قلعہ میں شمار ہوتے تھے لیکن بقول ان کے یہ تعلق تو مزدوری کا تھا۔ وہ شعر کی اصلاح دیتے تھے یا تاریخ لکھنے کا فرض انجام دیتے تھے۔

ایام غدر میں ان کے محفوظ و مامون رہنے کو بھی انگریز کی طرفداری پر منطبق نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر انگریز ان کو اپنا طرفدار یا حامی سمجھتا تو مرزا صاحب کو ان ایام میں مالی بحران کا شکار نہ ہونا پڑتا جس سے وہ دوچار رہے۔ اس سلسلے میں ان کی اپنی وضاحت، جو انہوں نے ایک خط میں کی ہے، بالکل درست معلوم ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اب پوچھو تو کیونکر مسکنِ قدیم میں بیٹھا رہا۔ صاحب بندہ میں حکیم محمد حسن خان مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا دیوار بہ دیوار ہیں۔ گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کے۔ راجہ صاحب نے صاحبان عالی شان سے عہد کیا تھا کہ بروقت غارت دہلی یہ لوگ بچ رہیں گے۔ چنانچہ بعد فتح راجا کے سپاہی آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں۔ مبالغہ نہ جاننا امیر غریب سب نکل گئے جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے۔ جاگیردار پنشن دار، دولت مند، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں۔ مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں۔''

مفصل حالات لکھنے سے مرزا صاحب کی پہلوتہی اس امر کی غماز ہے کہ انہیں حالات کی نامساعدت کا اندازہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جو لوگ ابتک زندان و سلاسل کی نذر ہو چکے ہیں ان میں

اکثر ان کے مربی اور قدر دان ہیں۔ اگر کھل کر انہوں نے ان کے متعلق کوئی بات لکھ دی تو ممکن ہے کہ یہی غداری کا سبب قرار پا جائے۔ لیکن جہاں تک دہلی کے اُجڑنے اور شرفاء و امراء کی تباہی کا تعلق ہے، یہ غم ایسا تھا کہ گونا گوں مصلحتیں بھی اس کے اظہار سے انہیں نہ روک سکیں۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

''غرض اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آئے، شہر میں ہے کون۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست سزا پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال معلوم نہیں۔''

مرزا غالبؔ طبعاً صلح کل اور رند مشرب تھے۔ انہوں نے نہ ملکی سیاسیات میں کبھی حصہ لیا اور نہ اس سے غرض رکھی کہ کون ان کا حکمران ہے۔ ان کی ضروریات زندگی بہادر شاہ ظفر کی قصیدہ خوانی سے پوری ہو جاتیں یا انگریز کی مدح سرائی سے، وہ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ انگریز ان کا اس وجہ سے ممدوح نہ تھا کہ اسے وہ مدح و ستائش کے لائق سمجھتے تھے یا بہادر شاہ ظفر میں کوئی ایسی خوبی ان کے نزدیک تھی جو انہیں اس کی تعریف و مدح پر مجبور کرتی۔ حقیقت میں اگر کوئی مجبوری ہر دو فریق کی قصیدہ خوانی کی تھی تو وہ ان کے معاش کا مسئلہ تھا۔ بہادر شاہ ظفرؔ سے اپنے تعلق کو انہوں نے یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ:

''میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہ اس کو نوکری سمجھو۔ خواہ اس کو مزدوری جانو۔''

اگر انگریزی حکومت کا خوف اور اپنی روزی کی ضبطی کا ڈر نہ ہوتا تو یقیناً مرزا غالبؔ سلطنت انگلشیہ سے بھی اپنی وابستگی کی قلعی اسی طرح کھول کر رکھ دیتے لیکن وہاں تو پیٹ کا دوزخ ایسا تھا کہ اسے بھرنے کے لیے انہیں انگارے بھی نگلنے پڑتے تو وہ تامل نہ کرتے۔

مرزا صاحب پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے حریت پسندی کے اس دور میں، جب کہ بڑے بڑوں نے اعلائے کلمۃ الحق کہنے میں اپنی وجاہت منصبی اور جاگیر و منصب کا خیال نہ کیا۔ یہاں تک کہ خود ان کے رفیق و ہمدم بزم حق گوئی میں محبوس زنداں کر دیئے گئے تھے، مرزا

صاحب اپنی بے گناہی کا اعلان کرتے نظر آتے ہیں۔ گویا انہیں اس تحریک سے قطعی ہمدردی نہ تھی جو برطانوی استعمار کے خلاف ۱۸۵۷ء میں شروع ہوئی تھی۔

یہ صحیح ہے کہ مرزا صاحب نے بلاواسطہ یا بالواسطہ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں حصہ نہیں لیا اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس دور میں نہ صرف یہ کہ انہوں نے انگریزوں سے قطع تعلق نہیں کیا بلکہ انہیں خوش کرنے کی بھی کوشش کرتے رہے۔ اس سے دو نتیجے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کے حامی تھے اور یہ نہیں چاہتے تھے کہ غلامی کا جوطوق ان کی گردن میں پڑا ہوا ہے اسے اتار پھینکیں۔ دوسرے یہ کہ ذاتی وجاہت ومنصب اور جاگیر وپنشن کو وہ ملک وقوم کے مفاد سے زیادہ عزیز سمجھتے تھے اور اس بات کے ہرگز روادار نہ تھے کہ وہ کسی قومی تحریک کے لیے اپنی آسائشوں کو داؤ پر لگائیں۔

پہلی بات اس لیے محل نظر ہے کہ ان کی تحریروں میں کہیں بھی یہ سراغ نہیں ملتا کہ انہوں نے ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط وقیام کے لیے کوئی سعی وکوشش کی ہو یا تحریر وتقریر سے لوگوں کو اس امر پر آمادہ کیا ہو کہ وہ انگریزوں کی حمایت کریں۔ ان کی نثر کے مضامین ومکاتیب اور نظم کے دواوین ہمارے سامنے ہیں لیکن ان میں نثر کی کوئی سطر یا نظم کا ایک بھی شعر ایسا نہیں ملتا جسے مذکورہ الصدر الزام کی تائید میں پیش کیا جا سکے۔ مرزا غالبؔ کا رسالہ دستنبو، جو غدر کے حالات پر مشتمل ہے، حقیقت حال کی وضاحت میں کافی مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے جو باتیں ذہن میں آتی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ مرزا صاحب ''غدر'' کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے۔ انہوں نے اس کی تاریخ ہی (رستخیز بے جا) سے نکالی ہے۔

۲۔ مغلیہ سلطنت کے احیاء کے لیے جو ہنگامہ برپا کیا گیا وہ غیر منظم تھا۔

۳۔ مسلمان ناحق انگریزوں کے مظالم کا نشانہ بنے۔

۴۔ مسلمان اکابر کے قتل کے ساتھ انگریز مردوں عورتوں اور بچوں کا قتل بھی انسانیت دوستی کی عینک سے دیکھا گیا۔

۵۔ ان کی طبعی امن پسندی اور عافیت کوشی ہنگامہ آرائی کے منافی تھی۔

قطع نظر اس کے کہ مرزا غالبؔ انقلاب ہند کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں خود بہادر شاہ ظفر

کی رائے اس سلسلے میں قابلِ ملاحظہ ہے۔ انہوں نے اپنے مصاحبین کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

''میرے بگڑنے کا کوئی سامان نہ تھا۔ یعنی بنا فساد مال و دولت خزانہ، ملک و سلطنت ہوا کرتے ہیں، میرے پاس ان میں سے کچھ بھی نہ تھا۔ میں تو پہلے ہی فقیر ہوا بیٹھا تھا۔ اب جو منجانب اللہ غیب سے میرٹھ میں آگ لگی اور دلی میں آ کر بھڑکی تو فلک غدار کو میرے گھر کی تباہی منظور ہے۔ آج تک سلاطین چغتائیہ کا نام چلا آتا تھا۔ اب وہ بھی یک قلم نابود ہو جائے گا۔ نمک حرام ہوا ہو جائیں گے اور انگریز میرا اور میری اولاد کا سر کاٹ کر قلعہ کے کنگرے پر چڑھا دیں گے۔''

غدر کے متعلق مرزا غالب کا تاثر بہادر شاہ ظفر کے بیان سے مختلف نہیں۔ یعنی انہیں غدر اس لیے پسند نہیں تھا کہ وہ اسے ایک ہلڑ بازی پر منطبق کرتے تھے اور ان کی چشم بصیرت یہ دیکھ سکتی تھی کہ جس بے سروسامانی اور افراتفری کے عالم میں علم بغاوت بلند کیا گیا ہے وہ حصول مقصد کے لیے مفید ثابت نہ ہوگا۔ رسالہ دستنبو کا یہ اقتباس قابل ملاحظہ ہے۔

''۱۵ مئی ۱۸۵۷ء کو اچانک ہنگامہ غدر برپا ہوا۔ انگریز ایجنٹ اور انگریز قلعہ دار مارے گئے۔ ہر طرف سواروں کے دوڑنے اور پیادوں کے پہنچنے کا شور پڑ گیا۔ باغیوں نے شہر میں جا بجا ڈیرے ڈال دیئے۔ قلعہ میں باغ سلطانی کو گھوڑوں کا اصطبل بنا لیا اور رفتہ رفتہ مختلف مقامات سے خبریں آنے لگیں کہ سپاہیوں نے اپنے سپہ سالاروں کو قتل کر ڈالا۔ اس طرح سپاہیوں اور کسانوں کے جتھے یکدل ہو گئے۔ دہلی میں عام بے نظمی شروع ہو گئی تھی۔ لشکر موجود تھے لیکن لشکر آرا نہ تھے۔ سپاہ حاضر تھی لیکن سپاہ سالار ناپید تھے۔ چور لوٹ مار سے امیر بن گئے۔ روشن گھروں کے چراغ بجھ گئے۔ ڈاک کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا۔ سارے قاعدے الٹ گئے۔ دلیر اپنے سایہ سے ڈرنے لگے۔ سپاہی شاہ و درویش پر حکم چلانے لگے۔''

اس سے آگے سنیئے۔

''باغی شروع میں جو روپیہ اپنے ہمراہ لائے تھے شاہی خزانہ میں داخل کر دیا۔ آہستہ آہستہ ہر طرف سے سپاہی جمع ہونے لگے۔ یہاں تک کہ سوار و پیادہ کی تعداد پچاس ہزار تک پہنچ گئی۔ بادشاہ نہ اتنے بڑے لشکر کو قابو میں رکھ سکتا تھا نہ اس کا انتظام کر سکتا تھا لہذا خود لشکر کے قابو میں آ گیا۔''

ظاہر ہے کہ جس تحریک آزادی کو مرزا صاحب ''رستخیز بے جا'' سے تعبیر کرتے تھے، اس میں وہ کسی صورت حصہ نہیں لے سکتے تھے اور اس افراتفری اور پکڑ دھکڑ کے دور میں جب ذرا سے شبہ میں بڑے بڑوں کو دار پر کھینچا جا رہا تھا، ان کے لیے گوشہ گیر درخانہ نشیں ہونے کے علاوہ اور چارہ ہی کیا تھا۔ جہاں تک اس رائے کا تعلق ہے کہ وہ ذاتی آسائشوں کو قومی تحریک کے لیے داؤ پر لگانے کے روادار نہیں تھے، اس میں بھی مورخ کو بہر حال تامل کرنا پڑے گا اور ان پر خود غرضی کا الزام لگانے سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ جس شخص سے ہم جہاد بالقلم یا جہاد بالسیف کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ کہاں تک اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے قابل ہے۔ اس سلسلے میں طبعی میلانات، ذاتی معتقدات اور شخصی حالات کو بھی یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مرزا غالبؔ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو پشت ہا پشت سے دربار سرکار کے ساتھ وابستہ چلا آ رہا تھا۔ اگرچہ مرزا صاحب طفلی میں ہی یتیم ہو گئے تھے لیکن جب انہوں نے ہوش کی آنکھ کھولی تو انہیں اپنے گرد و پیش امارت و ثروت کے آثار نظر آئے۔ ان کے والد کی شادی خواجہ غلام حسین کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ ان کے چچا کو گرانقدر مشاہرے کے علاوہ ڈیڑھ لاکھ کی جاگیر ملی تھی اور وہ نواب احمد بخش خان والی فیروز پور جھرکہ ورئیس لوہارو کی ہمشیرہ سے منسوب تھے۔ خود مرزا صاحب کی شادی نواب الٰہی بخش خان معروف کی چھوٹی صاحبزادی سے ہوئی جو والی فیروز جھرکہ ورئیس لوہارو کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان سب حضرات کے تعلقات انگریزوں سے مخلصانہ رہے۔ اس کے بعد جب باہم خاندان میں جاگیر وغیرہ کا قضیہ پیش آیا تو مرزا کے بعض انگریز دوست ہی ان کے کام آئے۔

خاندانی وجاہت کے اس پس منظر میں ضروری تھا کہ مرزا غالبؔ اپنی آن بان قائم رکھیں اور دربار سرکار سے جو تعلق ان کے بزرگوں کا چلا آتا تھا اسے بھی برقرار رکھیں۔ اس غرض کے لیے

انہیں اچھی خاصی پریشانی بھی اٹھانی پڑتی تھی اور بظاہر اس سعی و جہد میں مالی مفاد زیادہ نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن محض وجاہت واقتدار کی خاطر وہ سب پاپڑ بیلتے تھے۔ انہوں نے خاندانی پنشن کے مقدمہ کے سلسلے میں کلکتہ تک سفر برداشت کیا اور جب کامیابی کی صورت وہاں بھی نہ دکھائی دی تو ملکہ وکٹوریہ کے نام ایک عرض داشت پیش کی۔ اس میں خطاب، خلعت اور پنشن کی درخواست کی گئی تھی۔ اس درخواست کا جواب امید افزا آیا تھا لیکن ابھی عملی طور پر اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا کہ غدر پڑ گیا اور ان کی امیدیں دل کی دل میں ہی رہ گئیں۔ خاندانی پنشن میں سے اگرچہ مرزا صاحب کے حصے میں صرف ساڑھے باسٹھ روپے ماہوار آتے تھے تاہم اس کے ساتھ دربار خلعت کی جو کشش تھی وہ انہیں مایوس کن حالات کے باوجود مسلسل کوشش پر مجبور کرتی رہی۔

خاندانی وجاہت و منصب کے جویا مرزا غالبؔ رند مشرب بھی تھے۔ خود اپنے قول کے مطابق وہ آدھے مسلمان تھے۔ شراب پیتے تھے اور نماز روزہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے چنانچہ بہ روایت یادگار غالب

> ''غدر کے بعد جب پنشن بند تھی اور دربار میں شریک ہونے کی اجازت نہ ہوتی تھی، پنڈت موتی لال منشی لیفٹیننٹی پنجاب مرزا صاحب سے ملنے کو آئے۔ کچھ پنشن کا ذکر چلا۔ مرزا صاحب نے کہا تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار۔ پھر میں نہیں جانتا کہ سرکار نے کس طرح مجھے باغی مسلمانوں میں شمار کیا۔''

مرزا صاحب اعزاز واکرام کے مقابلے میں مالی منفعت کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ''آبحیات'' میں لکھا ہے کہ

> ''۱۸۱۳ء میں جبکہ دہلی کالج نئے اصول پر قائم کیا گیا، مسٹر ٹامس سیکرٹری گورنمنٹ ہند جو آخر کو اضلاع شمال و مغرب میں لیفٹیننٹ گورنر ہو گئے، مدرسین کے امتحان کے لیے دلی میں آئے تو چاہا کہ جس طرح سو روپے ماہوار کا ایک عربی مدرس کالج میں مقرر ہے اسی طرح ایک فارسی کا مدرس مقرر کیا جائے۔ لوگوں نے مرزا اور مومن خان اور مولوی امام بخش کا ذکر کیا۔ سب سے پہلے مرزا صاحب کو بلایا گیا۔ مرزا پالکی میں سوار ہو کر

صاحب سیکرٹری کے ڈیرے پر پہنچے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی انہوں نے فوراً بلالیا مگر پالکی سے اُتر کر اس انتظار میں ٹھہرے رہے کہ دستور کے موافق صاحب سیکرٹری ان کو لینے آئیں گے۔ جب بہت دیر ہوگئی اور صاحب کو معلوم ہوا کہ اس سبب سے نہیں آئے، خود باہر چلے آئے اور مرزا سے کہا کہ جب آپ دربار گورنری میں تشریف لائیں گے تو آپ کا اس طرح استقبال کیا جائے گا لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں۔ اس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہوسکتا، مرزا صاحب نے کہا گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لیے کیا کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو، نہ اس لیے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے۔ صاحب نے کہا ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔ مرزا صاحب نے کہا مجھ کو اس خدمت سے معاف رکھا جائے اور یہ کہہ کر چلے آئے۔''

ان واقعات سے مرزا صاحب کے میلان طبع کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور یہ بھی بہ آسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے دوستوں کے برعکس حکومت انگلشیہ سے بغاوت کیوں نہیں کی لیکن اگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی فتویٰ صادر کردیا جائے کہ مرزا صاحب کو غلامی مرغوب تھی اور وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے خواہاں نہ تھے تو یہ قرین انصاف نہ ہوگا۔ وہ جہاں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کو ''رستخیز بے جا'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہاں انہیں یہ غم بھی خون کے آنسو رلاتا ہے کہ ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہوگیا۔ لاکھوں مر گئے جو زندہ ہیں ان میں سینکڑوں گرفتار بند بلا ہیں۔

یہ اقتباس ملاحظہ ہو

'' کہتے ہیں دلی بڑا شہر ہے۔ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ مگر اب یہ وہ دلی نہیں ہے بلکہ ایک کیمپ ہے۔ مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنوز و معزول بادشاہ کے ذکور۔ جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیرزن ہیں وہ کٹنیاں اور جوان کسبیاں۔ تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو چلتے پھرتے

دیکھتے۔صورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائنچے لیر لیر جوتی ٹوٹی۔''

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''بڑے ورپہ کا دروازہ ڈھایا گیا قابل عطار کے کوچہ کا بقیہ مٹایا گیا، کشمیری کٹرہ کی مسجد زمین کا پیوند ہوگئی، سڑک کی وسعت دو چند ہوگئی۔ اللہ اللہ گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں اور ہنود کی ڈیوڑھیوں کی جھنڈیوں کے پرچم لہراتے ہیں۔''

مرزا کے متعدد خطوط اپنے شاگردوں اور دوستوں کے نام ایسے ملتے ہیں جن میں انہوں نے دلی کے اُجڑنے اور شرفائے دلی کا ماتم کیا ہے۔ بعض خطوں میں انگریزوں کی زیادتی اور ظلم رانی کا بھی شکوہ کیا گیا ہے۔ خاص طور پر وہ خط جس میں وہ لکھتے ہیں۔

پانچ لشکروں کا حملہ پے در پے اس شہر پر ہوا۔

1- پہلا لشکر باغیوں کا جس میں اہلِ شہر کا اعتبار لٹا۔

2- دوسرا لشکر خاکیوں (انگریزوں) کا جس میں جان و مال، ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لُٹ گئے۔

3- تیسرا لشکر مال کا اس میں ہزاروں آدمی بھوکے مرے۔

4- چوتھا لشکر ہیضے کا اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔

5- پانچواں لشکر تپ کا، اس میں تاب و طاقت نہ پائی۔ اب تک اس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا۔

صرف یہی نہیں مرزا صاحب نے ایک غیر جانبدار مورخ کی طرح، جہاں باغیوں کی قتل و غارت گری کو نظر استحسان سے نہیں دیکھا، وہاں انگریزوں کی زیادتی کے خلاف بھی قلم اُٹھایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''فتح مند لشکر شہر میں داخل ہوا تو بے امتیاز لوگ قتل ہونے لگے۔ معزز اصحاب نے گھروں کے دروازے بند کر لیے۔''

نواب علاؤالدین خان کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''کل تمہارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے۔ ہر قسم

کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو۔ وہ دلی نہیں جس میں تم نے علم تحصیل کیا۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ دلی نہیں جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں۔ وہ دلی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے جس میں مسلمان اہلِ حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود۔ بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں۔ امرائے اہلِ اسلام میں تو حسن علی خان بہت بڑے باپ کا بیٹا سو روپے روز کا پنشن دار سو روپے مہینے کا روزینہ دار بن کر نامرادانہ مرگیا۔ میر ناصر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ، نانا نانی کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان بخشی محمد علی خان کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے بیمار پڑا، دوا نہ غذا، انجام کار مرگیا۔ تمہارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احباء کو پوچھو تو ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا اس کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ ٹکے کی آمدنی نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے مگر دیکھئے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڈھے صاحب ساری املاک بیچ کر اور نوش جان کر کے بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کی پانچ سو روپے کرایہ کی املاک واگذاشت ہو کر پھر قرق ہوگئی۔ تباہ و خراب لاہور گیا۔ وہاں پڑا ہوا ہے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجھر اور بہادر گڑھ اور بلبھ گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی امارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جائے جو حکماء کا حال کل لکھا ہے وہ بیان واقع ہے۔ صلحاء اور زہاد کے باب میں جو حرفِ مختصر میں نے لکھا ہے اس کو بھی سچ جانو۔''

اس تحریر سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مرزا غالب کو دلی کے اجڑنے، امرائے اہلِ اسلام کے تباہ ہونے اور صلحاء و زہاد کے اسیرِ بلا ہونے کا کتنا غم تھا۔ پھر جب وہ دیکھتے ہیں کہ انگلستان کا

مسلح شوردلی کو تہہ و بالا کرنے پر تلا ہوا ہے اور اس نے انسانیت و شرافت کا دامن تار تار کرنا شروع کر دیا ہے تو اپنی تمام مصلحت بینی کے باوجود بے ساختہ ان کی زبان پر یہ اشعار آ جاتے ہیں۔

جس کہ فعال مایرید ہے آج ہر سلحشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک آدمی واں نہ جاسکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر گیا وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کئے شکوہ سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کئے باہم ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب کیا مٹے داغ دل سے ہجراں کا

حقیقت میں مرزا غالبؔ فکری طور پر سرسید کے خیالات سے متفق تھے۔ جس طرح سرسید نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی حمایت نہیں کی اور انہیں اس بات کا دُکھ رہا کہ من حیث القوم مسلمانوں کو اس جنگ میں شدید نقصان پہنچا۔ اسی طرح مرزا غالبؔ بھی اس تحریک آزادی کو مسلمانوں کی نادانی پر محمول کرتے تھے اور انہیں یہ رنج تھا کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں جو وقار و احترام اور عزت و صمولت میسر تھی وہ ان کی بے تدبیری کی وجہ سے آن کی آن میں ختم ہوگئی۔ اگرچہ سرسید ظاہری طور پر انگریزوں کے خلاف بغاوت کرتے نظر نہیں آتے لیکن مسلمانوں میں شعور و بیداری کی جو لہر انہوں نے پیدا کی تھی وہ بذاتہ ایک انقلابی تحریک تھی اور یہ اس تحریک کا نتیجہ تھا کہ مسلمان ۱۹۴۷ء میں ایک علیحدہ مملکت کی بنیاد ڈالنے میں کامیاب ہوئے۔

مرزا غالبؔ غدر کے بعد تقریباً ۱۲ سال زندہ رہے۔ یہ زمانہ مسلمانوں کے حق میں بڑا پُر آشوب تھا۔ جنگِ آزادی کی ناکامی نے انہیں کہیں کا نہ رکھا تھا۔ انہیں قعرِ مذلت سے نکالنے کے لیے بڑی صبر آزما کوششوں کی ضرورت تھی جس کے لیے سرسید کی تعلیمی تحریک نہایت مفید ثابت ہوئی۔ مرزا غالبؔ عملی آدمی تو تھے نہیں جن سے یہ توقع کی جاتی کہ وہ بھی سرسید کی طرح کوئی کام کریں البتہ ان کے وہ احساسات جو ان کے خطوں میں بکھرے ہوئے ہیں، اس امر کی ضرور

نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ مجموعی طور پر مسلمانوں کی ترقی کے خواہاں اور ان کی تہذیبی وثقافتی اقدار کو زندہ کرنے کے متمنی تھے۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے یہ صحیح ہے کہ کلام غالبؔ میں کسی انقلابی تحریک کے اثرات کا سراغ نہیں ملتا اور نہ واضح طور پر ایسے اشارات دکھائی دیتے ہیں جنہیں انقلاب کے ردعمل سے تعبیر کیا جا سکے۔ اس کا ایک سبب تو وہ خوف تھا جس نے عموماً لوگوں کو گنگ کر دیا تھا۔ غالبؔ کیا کسی اور کو بھی اظہار واقعہ کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ دوسرے جنگ آزادی چونکہ ناکامی سے دوچار ہوئی تھی اور اس میں مسلمانوں کو خاص طور پر نقصانِ عظیم اٹھانا پڑا تھا، اس لیے دباؤ شعرا اس سانحہ پر مرثیہ خوانی تو کر سکتے تھے لیکن فاتحین کے خلاف غم وغصہ کا اظہار کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔

مرزا غالبؔ نے ۱۸۵۷ء کے بعد جو اشعار کہے ہیں ان پر اب تک کسی نے باقاعدہ تحقیق نہیں کی تاہم ان کے دیوان کے مطالعہ سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ جنگ آزادی کے انجام نے ان کو بے حد متاثر کیا تھا۔ انہوں نے اپنے احباب کے نام خطوط میں بعض جگہ اپنے اشعار بھی درج کیے ہیں جو موقع ومحل کے اعتبار سے بڑے تاثراتی ہیں۔ مثلاً ایک خط میں نواب مصطفےٰ خان کے قید ہونے، رہائی پانے اور جاگیر واملاک کے باب میں کسی حکم کے نہ ملنے کا بیان کرتے ہوئے یہ شعر لکھا ہے۔

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

یا ایک خط میں اپنی پنشن کے بند ہونے اور اپنے بھائی کے مرنے کا حال لکھتے لکھتے یہ شعر بھی لکھ جاتے ہیں۔

ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

ایسے بہت سے اشعار خطوط میں ملتے ہیں جن کے متعلق وثوق سے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ انہوں نے انہی دنوں میں کہے تھے البتہ اتنا پتہ بہرحال چل جاتا ہے کہ جس غم نہانی نے طوفان کی صورت اختیار کر لی تھی وہ مرزا غالبؔ کے نہاں خانۂ دل میں بھی موجود تھا۔ اور پھر جب یہ طوفان منزل آشنا نہ ہو سکا تو مرزا کے غم کا رنگ اور نکھر گیا۔ دیکھیے ان شعروں میں درد وکرب کتنا کوٹ

کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں　　نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلک نا انصاف　　آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے　　نبضِ بیمار وفا دودِ چراغِ کشتہ ہے
زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالبؔ　　ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم　　تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے
کس روز تہمتیں نہ تراشا کئے عدو　　کس دن ہمارے سر پہ نہ آرا چلا کئے

پھر کھلا ہے درِ عدالت ناز　　گرم بازار موج داری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر　　زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

اے تازہ واردان بساطِ ہوائے دل　　زنہار اگر تمہیں ہوس ناؤ نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو　　میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے
ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی　　مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط　　دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرام ساقی و ذوقِ صدائے چنگ　　یہ جنتِ نگاہ وہ فردوس گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں　　نے وہ سرود و شور نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

مولوی علاء الدین

سید داؤد اشرف

حیدرآباد کے بارے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انگریزوں کے دباؤ اور ان سے گہرے تعلقات کی وجہ سے یہاں انگریزوں کے خلاف آزادی کے میلانات کا زور پکڑنا ممکن نہ تھا۔ یہ بات ایک حد تک درست ہے لیکن پہلی جنگ آزادی 1857 اور اس سے قبل کی جو تحریکیں انگریزوں کے خلاف ہندوستان کے مختلف حصوں میں چل رہی تھیں ان کا حیدرآباد سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور رہا۔ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ جدوجہد آزادی 1857 کی تحریک میں حیدرآباد نے صرف ایک تماشائی کا رول ادا نہیں کیا تھا۔ اس موقع پر یہاں کے نازک حالات میں عوام نے انگریزوں کے اقتدار کے خلاف جس غم و غصہ کا اظہار کیا تھا اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

افضل الدولہ (1857 تا 1869) اپنے والد ناصر الدولہ آصف رابع (چہارم) کے انتقال پر 1857 کی جنگ آزادی کے دوران تخت نشیں ہوئے۔ اس لئے انہیں نازک اور پیچیدہ صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ صحیح ہے کہ حیدرآباد میں بڑے پیمانے پر بغاوت رونما نہیں ہوئی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ملک کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں عوام انگریز مخالف جذبات رکھتے تھے اور شمالی ہندوستان میں ہونے والے واقعات کی تفصیلات سن کر وہ چاہتے تھے کہ افضل الدولہ آصف خان (پنجم) اور مدار المہام (وزیر اعظم) سالار جنگ اول بیرونی تسلط کے خاتمے کے لئے جدوجہد میں شامل ہو جائیں۔ افضل الدولہ کے تخت نشیں ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد یہاں یہ اطلاع پہنچی کہ دہلی میں جنگ آزادی کا آغاز ہو چکا ہے تو دار الخلافہ شہر حیدرآباد میں عوام کی انگریز مخالف سرگرمیاں ظاہر ہونے لگیں۔ شہر حیدرآباد میں چند چھوٹے موٹے واقعات ہوئے لیکن 17 جولائی 1857 کو ریزیڈنسی پر حملہ پہلا اور آخری بڑا واقعہ تھا جو شہر حیدرآباد میں پیش آیا۔ ریزیڈنسی پر حملہ آوروں کے لیڈر طرہ باز خاں گرفتار کر لیے گئے۔ ان پر مقدمہ چلایا گیا اور انہیں عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ طرہ باز خاں جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئے لیکن توپران دیہات کے قریب پکڑے گئے اور فرار ہونے کی کوشش پر نائب توپران نے انہیں گولی ماردی۔ مولوی علاء الدین جو ریزیڈنسی پر حملہ کرنے میں طرہ باز خاں کے ساتھ حملہ آوروں کی قیادت

کررہے تھے، حملے کی ناکامی کے بعد بنگلور فرار ہوگئے۔انہیں بنگلور کے ایک دیہات منگلا پلی میں گرفتار کیا گیا اور وہاں سے انہیں حیدرآباد لایا گیا۔ان پر مقدمہ چلا اور انہیں جزیرہ انڈومان میں حبس دوام کاٹنے کی سزا دی گئی جو اس زمانے میں سزائے موت کے بعد سب سے سخت سزا سمجھی جاتی تھی۔تمام تحقیقی کتابوں Freedom Struggle in Hyderabad جلد دوم، Who is who in Andhra pradesh جلد اول اور Nizam British Relations میں مولوی علاءالدین کا سنہ وفات 1884 لکھا گیا ہے۔مزید برآں ان کتابوں سے مولوی علاءالدین کی زندگی کے اس طویل عرصے کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہیں ہوتیں جو مولوی صاحب نے جزائر انڈومان میں گزارا تھا۔

آندھراپردیش اسٹیٹ آرکائیوز اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے آصف جاہی ریکارڈ میں راقم الحروف کو ریاست حیدرآباد کی متعدی عدالت کی ایک مسل (مسل نشان 445 بابت 1298ص،عدالت ومتفرق) دستیاب ہوئی ہے جو مولوی صاحب کی زندگی کے ان پہلوؤں سے پردہ ہٹاتی ہے جو اب تک تاریکی میں تھے۔اس مسل سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ مولوی علاءالدین 1889 تک حیات تھے۔علاوہ ازیں اس بارے میں بھی معلومات حاصل ہوتی ہیں کہ مولوی صاحب نے اپنی رہائی کے سلسلے میں کیا کوششیں کی تھیں،ان کی رہائی کے بارے میں حکومت ہند اور حکومت ریاست حیدرآباد کی جانب سے کیا اقدامات کیے گئے تھے،پورٹ بلیر میں 1860 تا 1889 یعنی تقریباً تیس سال مولوی علاءالدین کی کیا مصروفیات رہیں اور اس دوران ان کی صحت کیسی رہی؟ اس مسل میں حکومت حیدرآباد کے نام مولوی علاءالدین کی پیش کردہ اصل فارسی درخواست، درخواست کے ساتھ منسلک کردہ ڈاکٹروں کے طبی تصدیق نامے اور عہدیداروں کی توصیفی اسناد موجود ہیں۔مولوی صاحب کی اس درخواست پر حکومت حیدرآباد کی جانب سے کیا کارروائی کی گئی تھی،اس سے متعلق کاغذات بھی اس مسل میں موجود ہیں۔اس مسل کی تمام کارروائی کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

مولوی علاءالدین اپنی فارسی درخواست مورخہ 29 جمادی الاول 1306ھ بمطابق یکم فروری 1889 میں لکھتے ہیں کہ 1857 میں حیدرآباد ریزیڈنسی پر حملہ کرنے کے جرم میں عمر قید کی سزا دے کر انہیں پورٹ بلیر بھیج دیا گیا جہاں وہ تقریباً تیس سال کا عرصہ گزار چکے ہیں اور یہاں

اپنی آمد سے لے کر اب تک وہ کسی قصور کے مرتکب نہیں ہوئے ہیں۔ تمام حکام ان سے رضامند رہے اور اکثر نے خوشنودی کے تصدیق نامے بھی عطا کیے ہیں۔ چونکہ یہاں قیدیوں کی رہائی مطلق کے لیے بیس سال کی مدت مقرر ہے اس لیے ہزار ہا قیدی جو مختلف جرموں کی پاداش میں یہاں سزا بھگت رہے تھے مدت معینہ کی تکمیل کے بعد رہا ہو کر اپنے وطن لوٹ چکے ہیں یا لوٹ رہے ہیں لیکن وہ اپنے حُسنِ سلوک اور تقریباً تیس سال کی مدت گزارنے کے باوجود یہیں پر موجود ہیں۔ سابق میں ان کی رہائی کے سلسلے میں جو کارروائیاں ہوئی تھیں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ 1877 میں حکومت ہند نے ان کی رہائی مطلق کے لیے حکومت حیدر آباد کو لکھا تھا لیکن بدقسمتی سے اس وقت ریاست کے مدارالمہام سالار جنگ اول نے جو ایک عرصے سے مولوی صاحب سے ناخوش تھے، اس تجویز کو نامنظور کر دیا۔ چنانچہ حکومت ہند نے انہیں اس جزیرے کی حد تک رہائی عطا کی۔ ان کی رہائی کے لیے حکومت ہند کی جانب سے کی جانے والی سرکاری کارروائی کے بارے میں مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ تقریباً تیس سال قبل حکومت ہند کے معتمد داخلہ مسٹر میکنزی دورے کی غرض سے پورٹ بلیر آئے تھے اور اتفاقاً مولوی صاحب کی ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ چیف کمشنر نے ان کی تمام سرگزشت معتمد داخلہ کو سنائی اور معتمد داخلہ نے مولوی صاحب سے بھی استفسارات کیے اور وعدہ کیا کہ وہ کلکتہ پہنچ کر مولوی صاحب کی رہائی مطلق کے بارے میں حکومت ہند کو رپورٹ پیش کریں گے۔ چنانچہ معتمد داخلہ نے حسب وعدہ رپورٹ پیش کی جسے گورنر جنرل نے غور وخوض کے لیے کونسل میں پیش کیا۔ جب یہ معاملہ کونسل میں پیش ہوا تو کونسل نے طے کیا کہ مولوی صاحب کو آزادیِ مطلق دی جانی چاہیے۔ گورنر جنرل نے ان کی رہائی مطلق کی اجازت کے حصول کے لیے کونسل کی تجویز حکومت ریاست حیدر آباد کو روانہ کی۔ لیکن ریاست کے مدارالمہام سالار جنگ دوم نے اس تجویز کو نامنظور کر دیا اور تجویز حکومت ہند کو واپس کر دی۔ اس طرح حکومت ہند کی دونوں تجاویز حکومت حیدر آباد کی جانب سے نامنظور کر دی گئیں۔ اس کے بعد مولوی صاحب نے چیف کمشنر اور ڈاکٹروں کی سفارشات کے ساتھ حکومتِ ہند کو درخواست پیش کی تھی جس میں انہوں نے استدعا کی تھی کہ انہیں ہندوستان واپس آنے کی اجازت مرحمت کی جائے لیکن حکومت ہند نے یہ کہتے ہوئے ان کی درخواست نامنظور کر دی کہ حکومت ریاست حیدر آباد کی اجازت کے بغیر ان کی رہائی مطلق ممکن نہیں۔ حکومت

ہند کے اس موقف کے پیشِ نظر مولوی صاحب کو اپنی رہائی کے لیے براہِ راست حکومت حیدر آباد سے رجوع ہونا پڑا۔ چنانچہ اوپر بیان کردہ تفصیل کے بعد وہ اپنی درخواست میں لکھتے ہیں کہ وہ اس جزیرے میں تقریباً تیس سال کی مدت گزار چکے ہیں۔ جب وہ اس جزیرے پر پہنچے تھے اس وقت وہ جوان، تندرست اور قوی ہیکل تھے لیکن اب وہ کافی ضعیف ہو چکے ہیں اور کئی امراض میں مبتلا ہیں۔ ان کی کمزوری کا یہ عالم ہے کہ پانچ وقت کی نماز بیٹھ کر اشاروں سے پڑھتے ہیں اور کسی کی مدد کے بغیر ان کا حرکت کرنا مشکل ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی درخواست کے ساتھ جو طبی تصدیق نامے منسلک کیے ہیں ان سے ان کی طبی حالت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنی درخواست کے آخر میں رہائی مطلق کی منظوری عطا کرنے کی استدعا کی تا کہ وہ اپنی عمر کی بقیہ قلیل مدت گوشۂ گمنامی میں خدائے تعالیٰ کی عبادت اور دعائے خیر میں صرف کر سکیں۔

مولوی صاحب نے درخواست کے ساتھ 8 طبی تصدیق نامے منسلک کیے تھے۔ یہ تصدیق نامے جونیئر اور سینئر میڈیکل آفیسروں کی جانب سے 1886 اور 1889 کے دوران جاری کیے گئے تھے۔ ان تصدیق ناموں سے پتہ چلتا ہے کہ مولوی علاء الدین کئی امراض میں مبتلا تھے مثلاً گٹھیا double inginal hernia وغیرہ۔ ضعیفی کی وجہ سے ان کی بصارت بہت کمزور ہو گئی تھی۔ بہت پہلے بندوق کی گولی لگنے کی وجہ سے وہ سیدھے بازو سے معذور ہو گئے تھے۔ ان کی پیشانی پر زخم کا نشان تھا اور کندھے پر تلوار کا گہرا زخم تھا۔ تقریباً سبھی ڈاکٹروں کی یہ رائے تھی کہ مولوی صاحب اس مقام سے واپس ہونے کے لیے بے چین ہیں اس لیے انہیں تبدیلیٔ مقام کی اجازت دی جانی چاہیے تا کہ ان کی صحت بہتر ہو سکے، ان کے مصائب میں کمی اور عمر میں اضافہ ہو سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورٹ بلیر کے تمام عہدیدار مولوی علاء الدین سے بے حد خوش تھے اور ان سے ہمدردی رکھتے تھے۔ مولوی صاحب نے اپنی درخواست کے ساتھ 44 توصیفی اسناد بھی منسلک کی تھیں جو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ، اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ، ایگزیکٹو انجینئر اور پولیس ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ کی جانب سے جاری کی گئی تھیں۔ یہ تصدیق نامے مولوی علاء الدین کے بارے میں اہم اور بالکل نئی معلومات مہیا کرتے ہیں۔ ان کے مطابق مولوی صاحب 22 جنوری 1860 کو پورٹ بلیر پہنچے تھے اور بحیثیت قیدی ان کا نمبر 3708 تھا۔ چونکہ وہاں فارسی جاننے والوں کی کمی تھی اس لیے انہوں نے اپنی خدمات پیش کیں اور تین مختلف ڈیوٹیوں میں محرر کے طور

پر خدمات انجام دیں۔ اس علاقے میں بڑے پیمانے پر کاشت کاری کے لیے بھی ان کا تعاون حاصل رہا۔ انہوں نے وہاں آٹے کی گرنی کھولی تھی اور دودھ کی فراہمی کے لیے گتہ حاصل کیا تھا۔ مولوی صاحب نے ساجھے داری میں ایک دکان بھی کھولی تھی۔ انگریز عہدیداروں نے اپنے تصدیق ناموں میں ان کی دیانت داری کی اچھے الفاظ میں تعریف کرتے ہوئے ضرورت کی اشیاء ان کی دکان سے خریدنے کی سفارش بھی کی تھی۔ بعض انگریز عہدیداروں نے فارسی سیکھنے کے لیے انہیں اپنا استاد مقرر کیا تھا۔ جن عہدیداروں نے تصدیق نامے جاری کیے تھے وہ سب اس بارے میں متفق الرائے تھے کہ مولوی علاء الدین ایک بے حد با اخلاق، نہایت شائستہ، خاصے پڑھے لکھے اور ذہین شخص تھے۔ بہت سے تصدیق ناموں میں ان کی رہائی مطلق کے بارے میں بھی سفارش کی گئی تھی۔

مولوی علاء الدین کی اس درخواست پر حکومت حیدرآباد کی جانب سے جو کارروائی کی گئی تھی اس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

عماد جنگ معتمد عدالت حکومت ریاست حیدرآباد نے اپنے نوٹ میں مولوی صاحب کی درخواست کا خلاصہ اور ان کی استدعا بیان کرتے ہوئے لکھا کہ مولوی صاحب نے اپنی درخواست کے ساتھ جو کاغذات روانہ کیے ہیں ان سے ان کی بیماری کی تصدیق ہوتی ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس مدت میں ان کا رویہ اچھا رہا ہے۔ اگرچہ یہ حکم جاری ہو چکا ہے کہ عمر قید کی سزا بھگتنے والے قیدی بیس سال تک چال چلن نیک رہنے کی صورت میں رہا کر دیئے جائیں، مولوی علاء الدین نے تیس سال تک نیک چلنی کا ثبوت دیا ہے لیکن اس مقدمے کا انگریزی حکومت سے تعلق ہے۔ اگر اجازت ہو تو صاحب عالی نشان کو لکھا جائے کہ اگر گورنمنٹ آف انڈیا کو ان کی رہائی میں اعتراض نہ ہو تو ان کی رہائی کا حکم صادر کیا جائے۔ معین المہام (وزیر) عدالت فخر الملک نے معتمد عدالت کی تجویز سے اتفاق کیا۔ مدار المہام سر آسمان جاہ نے اس نوٹ پر استفسار کیا ''مولوی علاء الدین کی عمر اب کس قدر ہوگی؟'' اس استفسار کے جواب میں عماد جنگ نے لکھا کہ مولوی صاحب کی درخواست میں ان کی عمر نہیں لکھی گئی ہے لیکن بعض ڈاکٹروں کے سرٹیفکیٹ سے جو ان کی درخواست کے ساتھ منسلک ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عمر تقریباً 67 برس کی ہے اور اکثر ڈاکٹروں نے لکھا کہ اب وہ بہت ضعیف ہو گئے ہیں اور ان کی بصارت

میں فرق آ گیا ہے۔ جن کاغذات پر نشان لگائے گئے ہیں اگر وہ ملاحظہ کیے جائیں تو ثابت ہوگا کہ وہ قابلِ رحم ہیں۔ آسمان جاہ نے ان پر رحم کھانے کی بجائے یہ حکم تحریر کر دیا کہ مولوی صاحب کو جواب دیا جائے کہ جس علاقے میں وہ رہتے ہیں وہاں درخواست پیش کریں۔ اگر وہاں سے کارروائی پیش ہوگی تب لحاظ کیا جائے گا۔ مولوی صاحب کو ایک مراسلہ مورخہ 17 شوال 1306 ہجری بمطابق جون 1889 کے ذریعے اس حکم سے آگاہ کر دیا گیا۔ اس طرح مولوی صاحب آخری کوشش میں بھی رہائی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

آرکائیوز کی مسل سے جو نئی معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کی روشنی میں اب وثوق اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مولوی علاء الدین کا انتقال 1884 میں نہیں ہوا تھا جیسا کہ مذکورہ بالا چند تحقیقی کتابوں میں لکھا گیا ہے بلکہ وہ 1889 تک حیات تھے۔ وہ رہائی مطلق اور اپنے وطن آنے کے لیے بہت بے چین تھے۔ انہوں نے ابتدائی کوششوں میں ناکامی کے بعد حکومت ریاست حیدرآباد کو ایک درخواست روانہ کی تھی جس کے ساتھ طبی صداقت نامے اور توصیفی اسناد منسلک تھے لیکن اس بار بھی ان کی کوشش رائیگاں گئی۔ مولوی صاحب نے اپنی درخواست کے ساتھ جو منسلکات روانہ کیے تھے ان سے نہ صرف ان کی صحت کے بارے میں علم ہوتا ہے بلکہ پورٹ بلیر کی ان کی 30 سالہ زندگی کی مصروفیات اور سرگرمیوں کا ایک خاکہ بھی سامنے آتا ہے۔

مولوی لیاقت علی

لئیق رضوی

1857 کی پہلی جنگ آزادی کا جب بھی ذکر چھڑے گا، مولوی لیاقت علی کا نام بھی لیا جائے گا۔ الٰہ آباد کے اس جیالے مولوی نے نہ صرف لوگوں کو فرنگیوں کے خلاف متحدہ اور صف آرا کیا بلکہ خود بھی تلوار لے کر میدان میں آ گئے۔ 6 جون کو الٰہ آباد آزاد کرالیا گیا۔ 17 جون کو کرنل نیل نے یہاں دوبارہ قبضہ کرلیا، لیکن مولوی صاحب نے ہمت نہیں ہاری اور قریب 12 برس تک وہ ملک کے مختلف علاقوں میں فرنگیوں سے نبرد آزما رہے۔

لیاقت علی 17 جولائی 1823 کو الٰہ آباد کے پاس مہنگاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مہر علی کاشتکار تھے۔ لیاقت علی کو دین و حکمت کی اعلیٰ تعلیم دی گئی۔ ان کے چچا دائم علی کمپنی کی فوج میں صوبے دار تھے۔ بعد میں دائم علی بھتیجے کو بھی فوج میں لے گئے۔ مولوی لیاقت علی فیروز پور رجمنٹ میں گھوڑ سوار پلٹن میں سپاہی رکھے گئے۔ قریب تین برس تک وہ فوج میں رہے اور پھر سرکار مخالف مزاج کی وجہ سے یا تو انہوں نے نوکری چھوڑ دی یا انہیں فوج سے برطرف کر دیا گیا۔ مولوی لیاقت علی گاؤں لوٹ آئے اور یہاں کی مسجد میں امامت اور بچوں کو تعلیم دینے کی ذمہ داری سنبھالی۔ مولوی لیاقت علی شروع سے انگریزوں کے مخالف تھے۔ وہ اپنی تقریروں میں انگریزوں کے خلاف جہاد کی تلقین کرتے رہتے۔ وہ علما کے اس گروپ میں بھی شامل تھے، جو اپنے طور پر ملک کی آزادی کے لیے مہم چھیڑے ہوئے تھا۔ انقلاب کے خدوخال ترتیب دینے کے لیے جو خفیہ میٹنگ ہوئی تھی اس میں لیاقت علی بھی شامل تھے۔ انقلاب کی مقررہ تاریخ (31 مئی) کی اطلاع انقلابیوں تک پہنچانے اور انگریزوں کے خلاف جہاد کا ماحول بنانے کے لیے انہوں نے اپنے زیر اثر علاقوں میں متواتر دورے کیے۔(1)

6 جون کی شب جب الٰہ آباد میں بغاوت بھڑکی تو مجاہدین نے مولوی لیاقت علی کو اپنا امیر منتخب کرلیا۔ وہ مہنگاؤں سے الٰہ آباد آ گئے اور خسرو باغ کو اپنا مرکز بنایا۔ یہاں دربار لگا جس میں مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے نام کا خطبہ اور ایک فرمان پڑھا گیا، جس میں لیاقت علی کو الٰہ آباد کا گورنر نامزد کیا گیا تھا۔ اس موقع پر مغل بادشاہ کو 101 اور لیاقت علی کو 21 توپوں کی سلامی دی

گئی۔(2) اس کے بعد تقریباً پورا الٰہ آباد مولوی لیاقت علی کی سربراہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ جیل کا پھاٹک توڑ کر قریب تین ہزار قیدیوں کو آزاد کرایا گیا۔ اس مہم میں بہت سے انگریز مارے گئے۔ 30 لاکھ روپے کا سرکاری خزانہ لوٹ لیا گیا۔ پولیس بھی انقلابیوں سے مل گئی۔ کلکٹریٹ اور کوتوالی سمیت شہر کی سبھی اہم عمارتوں اور دفتروں پر باغیوں کا قبضہ ہوگیا۔ جون کو شہر میں جشن کا سماں تھا۔ جمنا پار کے کچھ علاقوں کو چھوڑ کر، پورا الٰہ آباد انقلابیوں کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ مولوی لیاقت علی نے اپنے حوصلے اور جنگی تجربے کی بنا پر انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ قلعے کے سوا بقیہ تمام اہم عمارتوں پر باغیوں کا ہرا جھنڈا لہرانے لگا۔ اس دوران انگریزوں کی مدد کے لیے باہر سے کمک آئی مگر انقلابیوں کی کامیاب مورچہ بندی کی وجہ سے ان کی ایک نہ چل سکی۔ انگریز قلعے میں قید ہو کر رہ گئے۔ قلعے پر قبضے کے لیے مولوی لیاقت نے مجاہدوں کے ساتھ قلعے کے مغربی حصے کی پشت سے حملہ کیا۔ زبردست جنگ ہوئی۔ دونوں طرف کے بہت سے سپاہی مارے گئے، آخر کار جیت انگریزوں کی ہوئی اور مجاہدوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ مولوی لیاقت علی کو امید تھی کہ جب مجاہد قلعے پر حملہ کریں گے تو وہاں تعینات فیروز پور رجمنٹ کے سکھ فوجی بھی ان سے آملیں گے مگر ایسا نہ ہوا۔(3) شہر کے ساتھ، دوآبہ اور گنگا پار کے علاقوں میں بھی مجاہدین نے انگریزوں کو اقتدار سے بے دخل کر دیا۔ مولوی لیاقت علی نے بہادر شاہ ظفر کو خط بھیج کر الٰہ آباد میں مجاہدین کی کامیابی کی اطلاع دی۔ انہوں نے لکھا کہ تمام ہندو اور مسلمان ساتھ ہیں اور اللہ نے چاہا تو الٰہ آباد سے فتح پور تک انگریزوں کو دانا پانی نصیب نہیں ہوگا۔ برج موہن یادو نے لکھا ہے کہ دارالحکومت کی حفاظت کے لیے انہوں نے ایک ہزار گھوڑ سوار فوجی، پانچ توپیں اور چھ ہزار روپے دہلی بھیجنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ ڈاکٹر سید عباس رضوی کی کتاب ''سوتر دلی'' میں 17 جون کو الٰہ آباد سے سو گھڑ سواروں کے دلی پہنچنے کا ذکر ہے۔ جذبۂ جہاد کو عام کرنے کے لیے جون 1857 میں انہوں نے دو اعلان، ایک نظم اور ایک نثر میں، شائع کر کے تقسیم بھی کرائے۔ پہلے اشتہار میں جو نظم ہے وہ مولوی خرم علی بلہوری کے رسالے ''جہادیہ'' سے لی گئی تھی۔ رسالہ جہادیہ 57 اشعار پر مشتمل تھا۔ مولوی لیاقت علی نے نظم کے شروع کے 27 شعر لیے اور ان میں سے تین اشعار میں انہوں نے ضرورت کے مطابق ترمیم بھی کی۔(4)

بارہ سو سال کے بعد آئی یہ دولت آگے
حیف اس دولتِ بیدار سے مومن بھاگے
تھے مسلمان پریشان بغیر از اسباب
شکر سب تو نے دیا اے میرے رب الارباب
یعنی اسباب لڑائی کا جو کچھ تھا درکار
سب دیا تو نے ہمیں اور کیا پھر سردار
بات ہم کام کی کہتے ہیں سنو اے یارو
وقت آیا ہے کہ تلوار کو بڑھ بڑھ مارو

اپنے دوسرے اشتہار میں بھی مولوی لیاقت علی نے انگریزوں کے خلاف شروع کی گئی جنگ کو جہاد قرار دیتے ہوئے لوگوں کو اس میں شامل ہونے کی دعوت دی:

''الٰہ آباد تشریف لائیں اور قلعہ بند کفار نابکار کا قلع قمع کر کے بزور تیغ خاک میں ملا دیں اور بقیہ ماندوں کو اس ملک سے بھگا دیں۔'' (5) آزاد حکومت کے قیام کے بعد سب سے بڑا چیلنج بے راہ روی کو ختم کرنا اور قانون و انتظام کی حالت کو درست بنانا تھا۔ مولوی لیاقت علی نے اس مرحلے کو آسانی سے سر کر لیا۔ اپنے ساتھیوں کی مدد سے انہوں نے شہر میں مکمل امن امان قائم کیا۔ اپنی کارکردگی اور فیصلوں سے وہ بہادر شاہ ظفر کو برابر مطلع کرتے رہے۔(6)

الٰہ آباد ایک بڑا محاذ تھا۔ یہاں قلعے میں تقریباً سو برس سے انگریزوں کی چھاؤنی قائم تھی۔ یہاں گولہ بارود کا بڑا ذخیرہ تھا۔ اگر یہاں کا قلعہ ہاتھ سے نکل جاتا تو پورے شمالی ہند کی سپلائی منقطع ہو جاتی۔ اس لیے الٰہ آباد کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے انگریزوں نے پوری طاقت صرف کر دی۔ 9 جون کو کمپنی سرکار نے الٰہ آباد میں مارشل لا کا اعلان کر دیا۔ 11 جون کو کرنل نیل گورے سپاہیوں کا لشکر لے کر بنارس سے الٰہ آباد پہنچا۔ 12 سے 15 جون تک انگریز فوجیوں نے حملہ کر کے شہر کے کئی علاقوں کو پھر قبضے میں لے لیا۔ 15 جون کو انگریزوں کا حملہ اور تیز ہو گیا۔ 17 جون کو کرنل نیل نے بھاری لاؤ لشکر کے ساتھ خسرو باغ اور سرائے خلد آباد کو گھیر لیا۔ دن بھر جنگ ہوئی۔ انقلابیوں نے بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ خسرو باغ کی دیواریں خون سے لال ہو گئیں، سینکڑوں مجاہد شہید ہوئے۔ مولوی لیاقت علی نے جب دیکھا کہ انگریزوں کی اس بڑی فوج

سے مقابلہ ممکن نہیں ہے تو وہ رات میں کچھ ساتھیوں کے ہمراہ انگریزوں سے لوٹا ہوا خزانہ لے کر کانپور روانہ ہو گئے۔ انگریزوں نے خسرو باغ اور سرائے خلد آباد پر قبضہ کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی الٰہ آباد پر دوبارہ کمپنی کا اقتدار بحال ہو گیا۔ اس کے بعد انگریز فوجیوں نے مارشل لا کی آڑ میں الٰہ آباد میں زبردست فساد مچایا۔ بستیاں جلا دی گئیں۔ سینکڑوں لوگوں کو سرعام قتل کیا گیا۔ بزرگوں، عورتوں اور معصوم بچوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ صرف چوک میں جی ٹی روڈ کے کنارے سات سو لوگوں کو پھانسی دی تھی۔ سر جان، جان کیمبل اور ولیم رسل جیسے کئی انگریزوں نے بھی اس ظلم کو بیان کیا ہے۔ کانپور میں مولوی لیاقت علی نے بخشی زین العابدین کے گھر قیام کیا۔ (7) نانا صاحب کی فوج میں مولوی لیاقت علی کا اتنا اثر تھا کہ پکڑے گئے ہر انگریز کے مستقبل کا فیصلہ وہی کیا کرتے۔ ایک انگریز خاتون مسز بینٹ کے حوالے سے ڈاکٹر وشوا مترا پادھیائے نے لکھا ہے کہ ان کے حکم کے بغیر کسی انگریز کو چھوڑا نہیں جا سکتا تھا۔ (8) 15 جولائی 1857 کو جب جنرل ہیولاک بھاری لشکر کے ساتھ کانپور کی سمت بڑھ رہا تھا تب انقلابیوں نے فتح پور کے اونگ گاؤں کے قریب مورچہ بند ہو کر اسے روکنے کی کوشش کی۔ تاہم بعد میں انہیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس لڑائی میں بھی مولوی لیاقت علی نے حصہ لیا تھا۔ (9)

میلسن لکھتا ہے۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ الٰہ آباد کا مولوی بھی نانا صاحب کے ساتھیوں میں شامل تھا۔'' کرنل ولیمز نے ایک گواہ کے بیانا - تحریر کیے ہیں۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ فتح پور کی لڑائی میں مجاہدین آزادی کا کمانڈر کون تھا، اس نے کہا کہ میں نے ٹیکا سنگھ جرنل، الٰہ آباد کے مولوی اور جوالا پرساد کو کمانداری کے لیے جاتے دیکھا تھا۔ رانی لکشمی بائی کی مدد کے لیے وہ جھانسی بھی گئے۔ ہر جگہ جیت انگریزوں کی ہی ہوئی لیکن لیاقت علی نے ہمت نہیں ہاری۔ انہیں جہاں کہیں بھی مقابلے کی صورت نظر آئی وہ انگریزوں کے خلاف سرگرم جنگ رہے۔ سال بھر بعد وہ پھر الٰہ آباد کے گنگا پار علاقہ میں آئے۔ ہندو پیٹریاٹ نے 22 جولائی 1858 میں لکھا تھا کہ جولائی 1858 میں مولوی لیاقت علی، الٰہ آباد میں ندی کے کنارے اپنے دوسرے کچھ ساتھیوں کے ساتھ رکے تھے۔ ان کا ہیڈ آفس سوراؤں میں تھا۔ (10) مگر کرنل نیل کے لوٹے اور جلائے جا چکے الٰہ آباد میں انہیں انگریزوں سے مقابلے کی ضرورت نہیں آئی۔ بعد میں وہ مولوی احمد اللہ سے جا ملے اور اودھ اور روہیل کھنڈ میں انگریز مخالف سرگرمیوں میں شریک رہے۔

مولوی احمد اللہ کی قیادت میں انقلابیوں نے جب لکھیم پور کھیر کے محمدی قصبہ کو آزاد کرالیا تو حکومت کے بندوبست کے لیے جو کونسل بنائی گئی، لیاقت علی اس میں بھی شامل تھے۔(11) جب یہاں دوبارہ انگریزوں کی حکومت آئی، تو وہ نیپال چلے گئے لیکن وہاں ٹھہرے نہیں۔ زمانہ جلاوطنی میں وہ بھیس بدل کر، گھوم گھوم کر انگریزوں کے خلاف ماحول بناتے رہے۔ انگریزوں نے انہیں پکڑنے کی تمام کوششیں کیں مگر ناکام رہے۔ ان کے سر پر 5 ہزار روپے کے انعام کا اعلان رکھا گیا۔ جگہ جگہ اشتہار لگائے گئے مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ جلاوطنی کے اسی زمانے میں ٹونک کے کسی مولوی کی بیٹی سے انہوں نے دوسری شادی کی جس سے ایک بیٹی بھی ہوئی۔ بعد میں اپنی بیوی اور بچی کو بڑودہ میں اپنے ایک مرید کے یہاں چھوڑ کر وہ پھر انقلابیوں کو متحد کرنے نکل پڑے۔ اس دوران انہوں نے کئی جگہ کا دورہ کیا۔ 1859 میں وہ سورت ضلع کی سیاچین اسٹیٹ چلے گئے اور ایک خفیہ انقلابی مرکز بنا کر مجاہدین کو پھر اکٹھا کرنے لگے۔ یہاں ایک ٹیلے کے نیچے انہوں نے توپوں کا کارخانہ بھی بنالیا۔(12)

سورت میں مولوی لیاقت علی قریب 10 برس تک رہے۔ 1869 میں نواب ابراہیم خاں کی مخبری پر انہیں سچاپی اسٹیشن پر گرفتار کرلیا گیا۔ انگریزی فوج مولوی لیاقت علی کو الہ آباد لے آئی۔ یہاں اسٹیشن جج اے آر پولک کی عدالت میں ان پر سرکار کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا۔ ان کے خلاف 266 گواہ پیش کیے گئے۔ مولوی لیاقت علی نے بلا کسی خوف کے عدالت میں قبول کیا کہ انہوں نے مجاہدین کی قیادت کی تھی۔ انگریز جج نے کہا کہ آپ مسلمانوں کے مذہبی رہنما ہیں اگر آپ ان غلطیوں پر شرمندگی ظاہر کریں تو آپ کو معافی مل سکتی ہے، لیکن مولوی لیاقت علی نے معافی مانگنے سے انکار کردیا۔ انہوں نے کہا کہ ''اگر میں چوہا بھی ہوتا تو انگریزوں کی نسیں کاٹ کر رکھ دیتا۔''(13)

اس مقدمے کا فیصلہ 24 جولائی 1872 کو سنایا گیا۔ عدالت نے انہیں 1857 کے ایکٹ کی دفعہ (1) 11 کے تحت مجرم قرار دیا اور تاعمر قید کی سزا سنائی۔ سیلولر جیل بھیجے جانے سے قبل انہیں سخت پہرے میں مہنگاؤں لایا گیا۔ انہیں دیکھنے اور ملنے کے لیے مجمع لگ گیا۔ لیاقت علی نے لوگوں کو ہمت نہ ہارنے اور اللہ پر بھروسہ رکھنے کی تلقین کی پھر انہیں کالا پانی کی سیلولر جیل میں بھیج دیا گیا، جہاں 17 مئی 1892 کو مولوی لیاقت علی کا انتقال ہوگیا۔ انہیں وہیں دفن کیا گیا۔

حواشی:

1- عبدالباری آسی، الجمعیۃ، دہلی 2 ستمبر 1957

2- اجیت کمار، روزنامہ بھارت، الٰہ آباد 21 جنوری 1956

3- سندرلال، بھارت میں انگریزی راج، حصہ دوم۔ص 329

4- درخشاں تاجور، ہندوستان کی جدوجہد میں اردو شاعری کا حصہ۔ص 189

5- غلام رسول مہر، مجاہدین 1857۔ص 218

6- سندرلال، بھارت میں انگریزی راج، حصہ دوم۔ص 330

7- غلام رسول مہر مجاہدین 1857۔ص 219

8- وشوامترا پادھیائے، سنہ 57 کے بھولے بسرے شہید، حصہ دوم، ص 7

9- خورشید مصطفیٰ رضوی، جنگ آزادی 1857، ص 253

10- خورشید مصطفیٰ رضوی، جنگ آزادی 1857، ص 344

11- خورشید مصطفیٰ رضوی، جنگ آزادی 1857، ص 344

12- وشوامترا پادھیائے، سنہ 57 کے بھولے بسرے شہید۔ص 8, 7

طرّہ باز خاں

سید امتیاز الدین

عام طور پر جب ہمارے ملک کی جنگِ آزادی کی تاریخ بیان کی جاتی ہے تو سب سے پہلے 1857 کی وہ خونیں داستاں یاد آتی ہے جسے عرفِ عام میں غدر کا نام دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ 1857 سے بھی بہت پہلے انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کے جذبات مشتعل ہو چکے تھے۔ نہ صرف شمالی ہند بلکہ دکن کے عوام بھی انگریزوں سے شدید نفرت کرنے لگے تھے۔ ریاست حیدر آباد میں بھی بے چینی کی لہر دوڑی ہوئی تھی۔ نظامِ حیدر آباد اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے مابین 1853 میں ایک معاہدہ طے پایا تھا جس کی رو سے ریاستِ حیدر آباد کے اضلاع برار، عثمان آباد اور رائچور نظام حیدر آباد کی حفاظت پر مامور فوجوں کے خرچ کی پابجائی کے لیے انگریزوں کو دے دیئے گئے تھے۔ انہی دنوں ریاست کے وزیر اعظم سراج الملک کی وفات واقع ہوئی اور سالار جنگ اول ان کی جگہ ریاست کے دیوان مقرر ہوئے۔ نظام چہارم ناصر الدولہ کا انتقال بھی اُسی زمانے میں ہوا۔ عوام میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ ناصر الدولہ طبعی موت نہیں مرے بلکہ ان کو سازش کے تحت مارا گیا ہے۔ برار کی انگریزوں کو حوالگی سے بھی عوام میں سخت بے چینی تھی۔ شمالی ہند سے بھی ایسی خبریں مل رہی تھیں کہ انگریزی فوجیں شکست کھا رہی ہیں اور ہندوستانی مجاہدینِ آزادی پیش قدمی کر رہے ہیں۔ حیدر آباد کی مساجد میں مولویوں کی جوشیلی تقاریر ہونے لگی تھیں اور ولولہ انگیز اعلامیے (پوسٹر) دیواروں پر چسپاں کیے جا رہے تھے جن میں عوام کے ساتھ ساتھ فرماں روائے وقت نظامِ پنجم افضل الدولہ سے بھی کہا گیا تھا کہ اُن کو انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا چاہیے۔ اللہ و رسول ﷺ کی مدد ان کے ساتھ ہے۔ اس لیے اُن کو انگریزوں سے ڈرنا یا خائف ہونا نہیں چاہیے۔ اگر انہیں ڈر ہے تو پھر انہیں چوڑیاں پہن کر گھر بیٹھ جانا چاہیے۔

انہی دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو حیدر آباد میں ریزیڈنٹ کی قیام گاہ ریزیڈنسی پر حملے کا باعث ہوا۔ جس میں مجاہدِ آزادی طرہ باز خاں اور اُن کے ساتھیوں نے دادِ شجاعت دی اور تاریخ کے صفحات پر ان کا نام ہمیشہ کے لیے رقم ہو گیا۔ ریزیڈنسی پر حملے کا پسِ منظر یوں ہے کہ اورنگ آباد کی انگریزی چھاؤنی میں بھی انگریزوں کے خلاف سخت نفرت آمیز جذبات پائے جاتے تھے۔

سپاہیوں میں یہ بات پھیل گئی تھی کہ انہیں شمالی ہند میں پھیلی ہوئی بغاوت کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا جانے والا ہے۔ ان فوجیوں نے باقاعدہ اعلان کر دیا کہ ہم کو یہیں خدمات انجام دینے کے لیے رکھا گیا ہے اور ہم اپنے بادشاہ (بہادر شاہ ظفر) کے خلاف انگریزوں کی مدد کے لیے شمالی ہند نہیں جائیں گے۔ اورنگ آباد کی بغاوت کا ایک اہم رہنما چیدہ خاں تھا جو انگریزوں کے چنگل سے نکل کر اس امید میں اپنے تیرہ ساتھیوں کے ساتھ حیدرآباد پہنچا کہ شاید یہاں اسے پناہ مل جائے۔ چیدہ خاں کی گرفتاری پر پہلے سے ہی تین ہزار روپے انعام کا اعلان ہو چکا تھا۔ جونہی چیدہ خاں اور اس کے ساتھی حیدرآباد پہنچے وزیراعظم سالار جنگ نے انہیں گرفتار کر کے انگریز ریزیڈنٹ کرنل ڈیوڈسن کے حوالے کر دیا۔ اس واقعے سے شہر حیدرآباد میں سخت تناؤ اور بے چینی پھیل گئی۔

17 جولائی 1857 کو جمعہ کے دن زبردست احتجاجی جلسہ مکہ مسجد میں منعقد ہوا جس میں طے کیا گیا کہ چار مولویوں کو لے کر نظام دکن کی خدمت میں جائیں اور ان سے کہا جائے کہ وہ چیدہ خاں اور اس کے ساتھیوں کو رہا کر دیں۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر ریزیڈنسی پر حملہ کر دیا جائے۔ جونہی یہ خبر سالار جنگ کو پہنچی انہوں نے عرب جمعیت کا ایک جتھا ریزیڈنسی کی حفاظت کے لیے بھیج دیا۔ مکہ مسجد سے یہ جلوس مولوی علاء الدین کی قیادت میں روانہ ہوا۔ جب یہ جلوس بیگم بازار کے محلے کی طرف پہنچا تو طرہ باز خاں اور ان کے ساتھی بھی اس جلوس میں شامل ہو گئے۔

طرّہ باز خاں کے والد کا نام رستم خاں تھا۔ وہ ایک بہادر پٹھان اور ذی حیثیت آدمی تھے۔ کئی روہیلے اور پٹھان ان کے ملازم تھے۔ قریب ساڑھے پانچ بجے یہ جلوس ریزیڈنسی پر حملہ آور ہوا۔ چونکہ ریزیڈنٹ حالات سے پوری طرح باخبر ہو چکا تھا اس لیے اس نے میجر برگس اور میجر برایس کی سرکردگی میں اپنی فوج اور اسلحہ کی بہترین صف آرائی کر لی تھی۔ ریزیڈنسی کے سامنے دو مکانات تھے۔ ایک مکان این صاحب (نواب فیاض یار جنگ) کا تھا اور دوسرا جئے گوپال داس کا۔ ریزیڈنسی پر حملے سے پہلے ان مجاہدین نے ان دونوں مکانات پر قبضہ کر لیا تاکہ وہاں سے ریزیڈنسی کے اندرونی حصوں اور اہم مقامات پر حملہ کر سکیں۔ طرہ باز خاں کی سرکردگی میں روہیلوں نے ریزیڈنسی کا دروازہ توڑ دیا اور حملہ کر دیا۔ شام چھ بجے سے دوسری صبح کے چار بجے تک حملے جاری رہے۔ انگریزوں کی فوج تربیت یافتہ تھی اور گولہ بارود کا ذخیرہ بھی ان کا زیادہ تھا۔ کئی مجاہدین ہلاک یا زخمی ہوئے۔ دوسری صبح فجر کے بعد طرہ باز خاں اپنے ساتھیوں اور زخمیوں کو لے

کر بیگم بازار لوٹ گئے۔عرب جمعیت نے اس موقع پر چشم پوشی سے کام لیا جس کی وجہ سے مجاہدین فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔اس حملے کے بعد انگریزوں نے این صاحب اور جئے گوپال داس کے مکانوں کو مسمار کر دیا اور ریزیڈنسی کو فوجی لحاظ سے اور مضبوط کر دیا۔

18 جولائی 1857 کو ریزیڈنٹ ڈیوڈسن نے نظام حیدر آباد کو لکھا کہ باغیوں کو جلد از جلد گرفتار کر لیا جائے۔ریاستِ حیدر آباد کی پولیس اور فوج کو اس سلسلے میں چوکس کر دیا گیا۔طرہ باز خاں کو محمد بڈھن خاں نامی شخص کے سواروں نے گرفتار کر لیا اور ان کی جائیداد کو ضبط کر لیا گیا۔

22 جولائی 1857 کو سالار جنگ نے ریزیڈنٹ کو مطلع کیا کہ طرہ باز خاں کو گرفتار کر لیا گیا ہے لیکن وہ ابھی شدید زخمی ہیں۔کرامت علی مجسٹریٹ فوجداری، فضل اللہ مجسٹریٹ دیوانی اور غالب جنگ نے ان کا بیان قلم بند کیا۔طرہ باز خاں نے بڑی دلیری سے اس بات کا اعتراف کیا کہ انہوں نے اس بغاوت میں حصہ لیا تھا۔جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ دوسرے باغیوں کو جانتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ وہ اپنے گھر پر تھے۔جلوس وہاں سے گزرا، جہاد کا علم بلند تھا اور وہ اس علم کو دیکھ کر جہاد کی نیت سے اس میں کود پڑے تھے۔ان سے پوچھا گیا کہ کیا انہیں اس بغاوت میں شامل ہونے کے لیے کسی نے ورغلایا تھا تو انہوں نے کہا کہ وہ اپنی مرضی سے اس حملے میں شریک ہوئے تھے۔اس مجاہدِ آزادی نے شدید زخمی حالت میں بھی بڑی دلیری اور حق گوئی کے ساتھ اپنا بیان قلم بند کروایا اور اپنا جرم قبول کیا۔طرہ باز خاں کو عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ریزیڈنٹ نے گورنمنٹ آف انڈیا کو لکھا کہ طرہ باز خاں کا جرم اتنا سنگین ہے کہ ان کو سزائے موت دی جانی چاہیے لیکن گورنر جنرل نے سزا کو تبدیل کرنے سے انکار کر دیا۔

18 جنوری 1859 کو طرہ باز خاں حراست سے فرار ہو گئے اور ان کے ساتھ ہی جیل کے دو سپاہی بھی، جنہوں نے طرہ باز خاں کے فرار میں مدد دی تھی، جیل سے فرار ہو گئے۔19 جنوری 1859 کو طرہ باز خاں کی گرفتاری پر پانچ ہزار روپئے کے انعام کا اعلان کیا گیا۔ایک ہفتے کے اندر قربان علی نامی ایک شخص نے طرّہ باز خاں کو شہید کر دیا۔قربان علی، محمد خاں جمعدار اور چند لوگوں کو لے کر اس مقام پر پہنچ گیا جہاں طرّہ باز خاں چھپے ہوئے تھے۔قربان علی نے اپنے بیان میں کہا کہ اس نے طرہ باز خاں کو اُن کی آنکھ کے نیچے زخم کے نشان سے پہچانا۔قربان علی اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ کر طرہ باز خاں اور ان کے جاں نثاروں نے تلواریں سونت لیں جس پر قربان علی

اور اس کے ساتھیوں نے گولیاں چلا دیں۔ طرہ باز خاں اور ان کے ساتھی ہلاک ہو گئے۔ طرہ باز خاں کے تین ساتھی جنگل میں فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ قربان علی نے طرہ باز خاں کی لاش غلام حیدر، بابو لعل اور ان کے ساتھیوں کے ذریعے حیدر آباد بھیج دی۔ طرہ باز خاں کی لاش کو زنجیروں سے باندھ کر شہر حیدر آباد میں برسرِ عام لٹکایا گیا۔

آندھرا پردیش کے سابق گورنر بھیم سین سچر نے ریزیڈنسی (جہاں آج کل ویمینس کالج قائم ہے) سے متصل سڑک کا نام طرہ باز خاں روڈ رکھا۔ یہیں اس شہیدِ آزادی کا مجسمہ بھی نصب ہے۔

شہزادہ فیروز شاہ

لطیف حسین ادیب

جنگ آزادی 1857 کے مجاہدین کی طویل فہرست میں ایک اہم نام شہزادہ فیروز شاہ کا بھی ہے جو شمالی ہندوستان کے جنگی میدان میں ہر محاذ پر نظر آتے ہیں۔ ان کا اپنا جاسوسی نظام تھا، اپنی فوج تھی اور وہ دشمن پر اچانک حملہ کر کے اس کو نقصان پہنچاتے اور کسی خطرے میں پھنسنے سے قبل میدان کارزار سے فرار ہو جاتے تھے۔ وہ گوریلا جنگ کے ماہر تھے۔ گوریلا جنگ کے علاوہ بھی انہوں نے مجاہدین آزادی کا جگہ جگہ ساتھ دیا اور انگریزی فوج کو نقصان پہنچایا۔ وہ 1857 کی جنگ آزادی میں آخری لمحات تک انگریزوں سے لڑتے رہے اور انگریزوں کے بہترین جاسوسی نظام کے باوجود ان کے ہاتھ نہیں آئے۔ 1857 کی جنگ آزادی کے اوراق میں ان کے واقعات بکھرے ہوئے ہیں۔ اس مختصر مضمون میں ان کو منضبط کر کے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

فیروز شاہ مغل شاہزادے تھے۔ انگریزوں نے ان کو غلطی سے شاہ ظفر کا بیٹا تحریر کیا ہے۔ (فریڈم اسٹرگل 5/381)۔ فیروز شاہ، شاہ عالم ثانی (م 1706) کے پوتے مرزا کاظم کے بیٹے تھے (قادری۔ 274)۔ اس طرح وہ شاہ ظفر کے چچازاد تھے۔ شہزادہ فیروز شاہ آگرہ میں مقیم تھے اور آگرہ میں ہی ان کی جائیداد تھی۔ وہ 1857 کی جنگ آزادی سے قبل حج بیت اللہ کو گئے تھے اور واپس آ کر جنگ آزادی میں شریک ہو گئے۔ (فریڈم اسٹرگل 5/378)۔ وہ جب حج بیت اللہ شریف سے فارغ ہو کر ممبئی سے آگرے کے لیے روانہ ہوئے، اثنائے راہ لوگوں کو بغاوت پر اکساتے رہے۔ انہوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے اور ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے تقاریر کیں۔ اس کوشش کے نتیجے میں انہوں نے گوالیار میں ایک فوجی دستہ تیار کر لیا جو اس قدر جوش میں بھرا ہوا تھا کہ اس نے جنگی مصلحتوں کی پروا نہ کرتے ہوئے آگرے میں 10 اکتوبر 1857 کو انگریزوں پر دھاوا بول دیا۔ انہیں شکست ہوئی لیکن دشمن کا بھی بھاری جانی نقصان ہوا۔ شہزادہ فیروز شاہ کی جائیداد برباد ہو گئی اور ان کے افراد خاندان منتشر ہو گئے (فریڈم اسٹرگل 5/378)۔ شہزادہ فیروز شاہ اس شکست کو بھلا نہیں سکے۔ انہوں نے سقوط روہیل کھنڈ کے بعد نواح آگرہ میں

چندن پور (اٹاوہ) کے قلعے پر حملہ کیا تھا لیکن ان کے ساتھی سیف اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر آگرہ کی فوج کے مقابلے میں پسپا ہو کر میدان کارزار سے فرار ہو گئے تھے۔ (قادری۔ 274)

20 ستمبر 1857 کو انگریزوں نے دہلی پر مکمل قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد مجاہدین نے مغربی یوپی کے اضلاع میں انگریزوں سے جنگ شروع کر دی تھی۔ بریلی میں نواب حافظ رحمت خاں روہیلہ (م 1774) کے پوتے نواب خان بہادر خاں انگریزوں کے خلاف مجاہدین کی قیادت کر رہے تھے۔ شاہ ظفر نے ان کو کیتھ یعنی روہیل کھنڈ کی نظامت کا فرمان بھیجا تھا۔ روہیل کھنڈ کے انقلابی رہنماؤں کی آمد و رفت بریلی میں جاری تھی اور ان کا نواب خان بہادر سے رابطہ قائم تھا۔ نواب خان بہادر خاں نہایت بیدار مغزی سے انقلابی حکومت چلا رہے تھے۔ انہوں نے فوج بھرتی کی، ٹکسال قائم کی، اسلحہ سازی کی فیکٹری قائم کی، مالداروں کی آمدنی پر 10 فیصدی ویلتھ ٹیکس لگایا تا کہ انقلابی حکومت کی مالی کمزوری رفع ہو، شہر میں امن و امان قائم کیا۔ انقلابی حکومت کے مقاصد اور عزائم کو مشتہر کرنے کے لیے، مولوی قطب شاہ استاد فارسی بریلی کالج بریلی نے مطبع بہادری قائم کیا جس میں انقلابی حکومت کے اشتہار طبع کر کے شائع کیے جاتے تھے۔ شہزادہ فیروز شاہ نے ایک تاریخی اہمیت کا اشتہار تحریر کر کے مطبع بہادری سے شائع کرایا تھا جس کے آخر میں یہ عبارت درج تھی۔ ''مطبع بہادری۔ بحکم ناظم کھیڑ۔ زیر نگرانی مولوی قطب شاہ۔ طابع شیخ نیاز علی۔ مورخہ 3 رجب 1274 ہجری مطابق 18 فروری 1858''۔ اس اشتہار کا انگریزی میں ترجمہ ایف بی اوٹرم۔ اسسٹنٹ سکریٹری (F.B. Ontram, Assitant Secretary) نے کیا تھا (فریڈم اسٹرگل 381 to 5/376)۔ اس ترجمے کی وجہ سے یہ اشتہار محفوظ ہو گیا۔ اس اشتہار کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عوام انگریزوں سے کس قدر متنفر اور بیزار تھے اور بوجوہ ان کو ہندوستان سے نکالنا چاہتے تھے۔ نواب خان بہادر خاں کی انقلابی حکومت کی پالیسی قطعاً غیر جانبدارانہ تھی اور وہ ملک کے ہر فرد کے دین، عزت اور ناموس کے لیے انگریزوں کی حکومت کو خطرہ سمجھتے تھے۔ اس اشتہار میں 15 ایسے نکات بیان کیے گئے ہیں جو انگریزوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے دین و مذہب، روزمرہ کی زندگی، رسوم، روایات اور مالی حالت کو تباہ کرنے کے لیے تیار کیے تھے۔ انگریزوں کے اس منصوبے کا ذکر کر کے، اس اشتہار کے ذریعے، اہل وطن سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اپنا اپنا دین بچانے اور اپنی اپنی جان و عزت و

ناموس کی حفاظت کے لیے یورپیوں کو قتل کریں۔اس اشتہار میں انگریزوں کے خلاف لڑائی کو جہاد اور بلاتفریق و مذہب انگریزوں سے جنگ کرنے والوں کو مجاہد سے موسوم کیا گیا تھا۔انگریزوں کے خلاف لڑنے والوں کو حوصلہ بلند رکھنے اور پایان کار کامیابی کی امید دلائی گئی تھی۔انگریزوں کے لیے عیسائی اور کافر کے الفاظ استعمال کیے گئے تھے۔یہ اشتہار عام لوگوں کے مذہبی جذبات کو ابھار کر ان کو انگریزوں کے خلاف صف آرا کرنے کے لیے تحریر کیا گیا تھا۔اس اشتہار سے شہزادہ فیروز شاہ کی ذہنی کیفیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انگریز دشمنی میں کس حد تک بڑھے ہوئے تھے۔ وہ تلوار کے ساتھ اپنے قلم سے بھی انگریزوں کے خلاف مورچہ بند تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سقوط دہلی سے پہلے ہی شہزادہ فیروز شاہ کا دہلی سے قطع تعلق ہو گیا تھا۔ شاہ ظفر کی اولاد اور پھر اولاد کی اولاد کی تعداد اتنی کثیر تھی کہ اس ہجوم میں شاہ ظفر کے چچا کی اولاد کی قلعے میں سمائی اور ان کی پہچان ممکن نہیں تھی۔شہزادہ فیروز شاہ اپنے عیال کے ساتھ آگرے میں مقیم ہوئے تھے۔10 اکتوبر 1857 کی جنگ کے بعد وہ جائیداد سے محروم ہو گئے اور بے گھر اور بے وطن ہونے کے بعد جنگِ آزادی میں ہمہ وقتی شریک ہو گئے۔ان کی بیٹی ریاست رامپور میں تھیں، جن کے بیٹے خارج فانتوم تھے۔وہ برنارڈ فانتوم کے پسر تھے۔برنارڈ فانتوم ایک فرانسیسی فوجی افسر اور ڈاکٹر تھا جو نواب احمد علی خاں (م 1840) کے علاج کے لیے حیدرآباد سے رامپور آیا تھا۔اس کی وفات رامپور میں 1845 کو ہوئی تھی۔(انتخاب یادگار 189)۔جارج فانتوم نے علمائے وقت سے کسب علم کیا۔فارسی و اردو زبانوں میں شعر کہتے تھے۔انہوں نے ایک مختصر تذکرۂ شعرائے رامپور بھی تالیف کیا تھا جس کا مخطوطہ رامپور رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ان کی بیوی کا نام حاجیہ بیگم تھا۔مدرسہ اشاعت العلوم سرائے فام بریلی کے مینجر قاری عبدالعزیز، حاجیہ بیگم کے نواسے تھے۔جارج فانتوم اور حاجیہ بیگم کی قبور بریلی کالج بریلی میں ہیں۔فانتوم گنج کی جائیداد، اکبر شاہ ثانی (م 1837) نے کپتان برنارڈ فانتوم کو عطا کی تھی (تاریخ شعرائے روہیل کھنڈ 3/2132)۔اس طرح شہزادہ فیروز شاہ کی بریلی سے نسبت بہت قریبی تھی اور ان کا بریلی میں آنا، اشتہار شائع کرانا اور نواب خان بہادر خاں کے ساتھ انگریزوں کے خلاف صف آرا ہونا اس نسبت کا ثبوت ہیں۔

شہزادہ فیروز شاہ نے اپنی زندگی انگریزوں سے جنگ کرنے اور ان کو زک پہنچانے کے لیے

وقف کردی تھی۔ ان کا گھر میدان جنگ، ان کا بستر گھوڑے کی زین اور ان کی رفیق و دمساز تیغ خوں آشام تھی۔ انہوں نے صرف مغربی یوپی کے اضلاع روہیل کھنڈ میں انگریزوں کے خلاف درجنوں محاربات کیے۔ خاص طور پر مراد آباد، سنبھل، شاہ جہاں پور، بدایوں اور بریلی میں ان کی انگریزوں سے لڑائیاں 1857 کی تاریخ کے یادگار واقعات میں سے ہیں۔ ان کی جنگی حالت یہ تھی کہ جب انگریز کسی مقام پر قبضہ کر کے پیش قدمی کرتے، وہ اسی مقام پر حملہ کر کے انگریزوں کو نقصان پہنچاتے تھے۔ ان کے حملے میں انگریزی فوج کو بھاری نقصان ہوتا اور قبل اس کے انگریزی فوج سنبھل کر ان پر حملہ کرے، وہ میدان کارزار سے فرار ہو جاتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی دو لڑائیوں کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

مراد آباد پر ریاست رامپور کی فوج کے سربراہ عبدالعلی خاں نے قبضہ کر لیا تھا۔ مراد آباد کے انتظام کا اختیار انگریزوں نے نواب یوسف علی خاں کو دے دیا تھا۔ انگریز حکام نینی تال میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ 22 اپریل 1858 کو فیروز شاہ نے مراد آباد پر اچانک حملہ کیا۔ عبدالعلی خاں کی فوج کو شکست ہوئی اور وہ رامپور بھاگ گئے۔ شہزادہ فیروز شاہ نے سرکاری دفاتر اور بنگلوں کو لوٹا، خزانے پر قبضہ کیا، سرکاری املاک کو آگ لگا دی اور قبل اس کے کہ انگریزی فوج تادیبی کارروائی کرے، جو وہاں سے دو منزل کے فاصلے پر تھی، انہوں نے شاہ جہان پور اور اودھ کی جانب روانگی اختیار کی۔ (فریڈم اسٹرگل 444، 427، 407)۔

شہزادہ فیروز شاہ کی دوسری یادگار جنگ ککرالہ ضلع بدایوں میں ہوئی تھی۔ بریگیڈیر پینی نے 20 اپریل 1858 کو اُسہیت (تحصیل داتا گنج، ضلع بدایوں) پر قبضہ کر لیا۔ ککرالہ پرگنہ اُسہیت میں واقع ہے۔ بریگیڈیر پینی کو طے شدہ پلان کے مطابق ککرالہ سے شاہ جہان پور جا کر جنرل کیمبل کمانڈر ان چیف کی سربراہی میں بریلی پر حملہ کرنا تھا لیکن شہزادہ فیروز شاہ اور وزیر محمد خاں صبح کی ہلکی روشنی میں ان پر حملہ آور ہوئے۔ بریگیڈیر پینی مارا گیا۔ شہزادہ فیروز شاہ اور وزیر محمد خاں کی فوج کا بھاری نقصان ہوا لیکن دونوں اپنی فوج کو لے کر میدان کارزار سے ہٹ گئے۔ (فریڈم اسٹرگل۔ 455)۔

5 مئی 1858 کو جنگ ککرالہ کے بعد، موضع ستی پور شہر کہنہ بریلی میں نکیا ندی کے کنارے نواب خان بہادر خاں، ناظم روہیل کھنڈ کی فوج کا مقابلہ انگریزی فوج سے ہوا تھا۔ انگریزی فوج کا

سربراہ جنرل کیمپبیل تھا۔نواب خان بہادر خاں کی فوج میں شہزادہ فیروز شاہ اور وزیر محمد خاں شامل ہو گئے۔ان کے علاوہ تحریک آزادی کے دیگر رہنما، مالاگڈھ کے نواب ولی داد خاں، ان کے فرزند اسمٰعیل خاں، بالاجی، نواب محمود خاں وغیرہ بھی نواب خاں بہادر خان کی مدد کے لیے آ گئے تھے۔ یہ لڑائی دوپہر سے شام تک جاری رہی۔اس جنگ میں شہزادہ فیروز شاہ نے ایسی شجاعت کا مظاہرہ کیا تھا کہ اس کا چرچا ایک مدت تک بریلی میں ہوتا رہا اور بڑے بوڑھے ان کی بہادری کے قصے سناتے رہے۔ساداتِ نو محلّہ بریلی کے ایک معروف بزرگ سید فیروز شاہ کا نام شہزادہ فیروز شاہ کے نام پر رکھا گیا تھا۔(خان بہادر خاں شہید 188-187)

5 مئی 1858 کو ستی پور اور بریلی کی جنگ کے بعد، طے شدہ پلان کے مطابق نواب خان بہادر خاں، شہزادہ فیروز شاہ اور دیگر قائدین آزادی، بریلی چھوڑ کر براہ پیلی بھیت، شاہ جہاں پور میں داخل ہو گئے۔جنرل جونس بریلی کی جنگ میں کامیاب ہونے کے بعد شاہ جہاں پور پہنچا تھا۔8 مئی 1858 کو اس نے مجاہدین پر حملہ کر کے ان کو منتشر کر دیا اور شہر میں آگ لگا دی۔شہر میں لوٹ مار اور قتل عام کا بازار گرم ہوا۔اس کے بعد بھی 12 مئی 1858 سے 24 مئی 1858 تک انگریزوں اور مجاہدین کے درمیان جھڑپیں جاری رہیں۔24 مئی 1858 کو جنرل کیمپبل نے شاہ جہاں پور پر حملہ کیا اور قبضہ کر لیا۔مجاہدین محمدی لکھیم پور میں جمع ہوئے۔مولوی احمد اللہ شاہ نے پلٹ کر شاہ جہاں پور میں راجہ پوایاں کی گڈھی کا محاصرہ کیا۔ان کے سر پر 50 ہزار روپے کا انعام تھا۔وہ سازش کا شکار ہو کر شہید ہو گئے۔یہ واقعہ 15 جون 1858 کا ہے۔احمد اللہ شاہ کا سر کوتوالی پر لٹکایا گیا اور نعش کو دفن کرنے کی بجائے جلوا دیا گیا۔(فریڈم اسٹرگل 5/538)۔ انگریزوں نے مجاہدین کو محمدی سے بھی دھکیل دیا اور وہ لڑتے ہوئے بالآخر بٹول نیپال میں پناہ گزیں ہو گئے۔انگریزوں نے نواب خان بہادر خاں کو نیپال میں ہی گرفتار کر کے 24 مارچ 1860 کو بریلی میں پھانسی کی سزا دی تھی۔ان کی قبر ڈسٹرکٹ جیل بریلی میں ہے۔شہزادہ فیروز شاہ نیپال نہیں گئے۔انہوں نے کانپور اور اٹاوہ کی راہ سے راجستھان میں قدم رکھا اور وہاں سے صوبۂ سرحد میں دریائے اٹک کو پار کر کے افغانستان میں داخل ہوئے۔اس کے بعد ایران سے گزر کر حجاز پہنچے۔ان کی وفات حجاز میں ہوئی (قادری۔551) اس طرح جنگ آزادی 1857 کا ایک شہزادہ طویل جدوجہد کے بعد سرزمین حجاز میں آسودۂ خواب ہو گیا۔

حواشی:

1- سید اطہر عباس رضوی، فریڈم اسٹرگل ان اتر پردیش، جلد 5 شعبۂ اطلاعات لکھنؤ۔ 1960

2- ایوب قادری، جنگ آزادی 1857، معارف پریس لاہور۔ 1976

3- امیر مینائی، انتخاب یادگار، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ایڈیشن۔ 1982

4- سید تعظیم علی نقوی، بریلوی، تاریخ شعرائے روہیل کھنڈ، جلد۔ 3، مسودے کی عکسی نقل۔

5- سید مصطفیٰ علی، بریلوی، خان بہادر خاں شہیدؒ، ایجوکیشنل پریس کراچی۔ 1966

فتویٰ جہاد ۱۸۵۷ء

شاہد حسین خاں

دہلی میں جنگ آزادی کا آغاز تو ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے ہوگیا تھا لیکن اس تحریک میں جوش و خروش اس وقت پیدا ہوا جب ۲ جولائی کو جنرل بخت خاں دہلی پہنچے۔ انہوں نے دہلی پہنچتے ہی ایک کام تو یہ کیا کہ مجاہدین کے انتشار کو دور کیا اور ان میں نظم وضبط پیدا کیا اور دوسرا کام انہوں نے یہ کیا کہ علمائے دہلی اور دیگر مقامات کے علماء کو جو اس وقت دہلی میں موجود تھے، جمع کیا اور صورتِ حال کی وضاحت کے بعد ان کے سامنے ایک استفتاء پیش کیا اور درخواست کی کہ وہ موجودہ حالات میں جہاد کی فرضیت یا عدم فرضیت کے بارے میں حکم شرعی سے مسلمانوں کی رہنمائی فرمائیں۔ چنانچہ علماء نے جہاد کی فرضیت کے باب میں فتویٰ دیا۔ یہ فتویٰ اسی زمانے میں ظفر الاخبار اور صادق الاخبار میں شائع ہوا اور اس کی اشاعت سے نہ صرف مسلمانوں کا انتشار ذہنی ختم ہوا بلکہ مجاہدین اور تحریک آزادی کو ملک کے عوام خصوصاً مسلمانوں کی کامل پشت پناہی اور تعاون حاصل ہوگیا۔

لیکن ایک زمانے تک فتوے کی عدم دستیابی کی وجہ سے، اس کے مفتیانِ کرام کے بارے میں کئی غلط فہمیاں کارفرما رہیں۔ اکابر علمائے وقت میں سے حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی کے بارے میں کہا گیا کہ وہ نہ صرف اس پر دستخط کرنے اور تائید کرنے والے ایک مفتی ہیں۔ بلکہ فتوے کے اصل محرک وہی ہیں۔ حضرت مولانا نذیر حسین محدّث دہلوی کے بارے میں روایت تھی کہ فتوے پر ان کے دستخط نہیں ہیں۔ مولوی محمد محبوب علی کے بارے میں مشہور ہوا کہ انہوں نے فتوے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا اور حضرت مفتی صدرالدین آزردہ کے بارے میں تحریر ہوا کہ انہوں نے فتوے پر اپنے دستخط کے ساتھ کتبت بالخیر لکھا تھا لیکن خ کا نقطہ چھوڑ دیا تھا۔ سقوط دہلی کے بعد جب انگریزوں نے ان کی گرفت کی تو انہوں نے کہہ دیا کہ دستخط مجھ سے بالجبر کرائے گئے تھے چنانچہ میں نے دستخط کے ساتھ کتبت بالجبر لکھ دیا تھا، دیکھا گیا تو واقعی ایسا تھا اور اس طرح انہوں نے اپنی گلو خلاصی کرائی۔ لیکن اب فتویٰ دستیاب ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ سب افسانے ہیں۔ مولانا فضل حق اس کے محرک نہیں ہو سکتے اس لیے کہ وہ دہلی پہنچے ہی وسط اگست میں تھے جب کہ فتویٰ مرتب ہو کر شائع ہو چکا تھا۔ حضرت محدّث دہلوی، مولوی سید محبوب علی، دونوں کے دستخط اس پر موجود ہیں اور حضرت

مفتی صاحب کے نام کے ساتھ کتبت بالجبر یا اس قسم کا کوئی جملہ موجود نہیں ہے۔

یہ فتویٰ سب سے پہلے اخبار الظفر، دہلی میں شائع ہوا تھا۔ اس سے صادق الاخبار، دہلی نے ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء کی اشاعت میں نقل کیا۔ صادق الاخبار کے مدیر نے اس کی سرخی یہ دی تھی ''نقل استفتاء از اخبار الظفر دہلی، اردو'' لیکن اخبار الظفر کا متعلقہ شمارہ ابھی تک دستیاب نہیں ہوا۔ صادق الاخبار سے یہ فتویٰ عتیق صدیقی، مولانا سید محمد میاں، خورشید مصطفیٰ رضوی، عبد الرزاق قریشی، امداد صابری، ڈاکٹر محمد ایوب قادری کی تالیفات اور دیگر متعدد کتب اور بے شمار رسائل میں نقل کیا جا چکا ہے۔ بعض نے اس کا عکس شائع کیا ہے۔ ہمارے سامنے مولانا سید محمد میاں کی تالیف ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' اور ڈاکٹر محمد ایوب قادری کی بے مثال تحقیق ''جنگ آزادی ۱۸۵۷ء'' (واقعات و شخصیات) ہے۔ لیکن یہاں ''دستخط و مواہیر'' کو عتیق صدیقی کی تالیف ''۱۸۵۷ء کے اخبار و دستاویزات'' سے صادق الاخبار کے عکس کے مطابق پیش کیا جا رہا ہے۔

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ اب جو انگریز دلی پر چڑھ آئے اور اہلِ اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس صورت میں اب اس شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں اور اگر وہ فرض ہے تو فرض عین ہے یا نہیں اور لوگ جو شہروں اور بستیوں کے رہنے والے ہیں ان کو بھی جہاد چاہیے یا نہیں۔ بیان کرو اللہ تم کو جزا دے۔

جواب

درصورت مرقومہ فرض عین ہے اور پر تمام اس شہر کے لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے۔ چنانچہ اب اس شہر والوں کو طاقت مقابلہ اور لڑائی کی ہے۔ بہ سبب کثرت اجتماع افواج کے اور مہیا اور موجودہ ہونے والے آلات حرب کے تو فرض عین ہونے میں کیا شک رہا اور اطراف و حوالی کے لوگوں پر جو دور ہیں باوجود خبر کے فرض کفایہ ہے۔ ہاں اگر اس شہر کے لوگ باہر ہو جائیں مقابلہ سے یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان پر بھی فرض عین ہو جائے گا۔ اور اسی طرح ادر اسی ترتیب سے سارے اہل زمین پر شرقاً اور غرباً فرض عین ہوگا۔ اور جو عدو ادر بستیوں پر ہجوم اور قتل اور غارت کا ارادہ کریں تو اس بستی والوں پر بھی فرض

ہوجائے گا بشرطیکہ ان کی طاقت کے۔

دستخط اور مواہیر

المجیب المصیب احقر العباد نور جمال عفی عنہ	العبد محمد عبدالکریم
العبد فقیر سکندر علی	سید محمد نذیر حسین
رحمت اللہ	مفتی محمد صدرالدین
مفتی اکرام الدین معروف سید رحمت علی	محمد ضیاالدین
صح ہذا الجواب عبدالقادر	فقیر احمد سعید احمدی
العبد محمد میر خاں	محمد مصطفےٰ خاں ولد حیدر شاہ نقشبندی
محمد کریم اللہ	العبد مولوی عبدالغنی
خادم العلما محمد علی	فریدالدین
محمد سرفراز علی	سید محبوب علی جعفری
حامی الدین، محمد ابواحمد	العبد سید احمد علی
الٰہی بخش	مولوی سعدالدین
محمد انصار علی	سراج العلماء ضیاء الفقہا مفتی عدالت المالیہ
	محمد رحمت علی خاں
حیدر علی	حفیظ اللہ خاں
محمد نورالحق چشتی	واللہ الغنی واشم الفقرا
سید عبدالحمید عفا اللہ عنہ	العبد سیف الرحمٰن محمد ہاشم
سید محمد	محمد امداد علی عفی عنہ
خادم شرع شریف رسول الثقلین قاضی	
القفات محمد علی حسین	

مشمولہ: تحریکاتِ ملی، (تحریکات کے آئینے میں مسلمانانِ پاک و ہند کی سیاسی جدوجہد کی سرگذشت)

مجلّہ گورنمنٹ نیشنل کالج ۸۳-۱۹۸۲ کراچی۔

خصوصی مقالہ

نوآبادیاتی ہندوستان میں جنگ، ہجرت اور بیگانگی

مظفر احمد کی تشکیل نو

سوچیتا چٹوپادھیا
ترجمہ: ڈاکٹر صولت ناگی

تعارف

مظفر احمد (1889 تا 1973) 1913 میں کلکتہ آیا۔ اس کی خواہش ایک مصنف بننے کی تھی۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد اُس نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرتے ہوئے ایک ''سرگرم سیاسی کارکن'' بننے کے بارے میں غور و فکر شروع کر دیا۔ 1922 تک اس کی سیاسی سرگرمیاں، اسے سماج کے مارکسی تناظر کی جانب لے گئیں اور وہ شہر کے پہلے سوشلسٹ مرکز ے میں بنیادی شخصیت کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔ بعد ازاں اسے ہندوستان کے اس شہر کلکتہ کا، جہاں کمیونسٹ تحریک سب سے زیادہ مزاحمتی انداز کی تھی، سب سے زیادہ نمایاں کمیونسٹ بننا تھا۔

اس مضمون میں جنگ کے سالوں کا تجزیہ کیا گیا ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ یہ عرصہ شہر کے اُن سماجی اجزا کی ترتیب نو کے لیے انتہائی اہم تھا جو تبدیل شدہ سیاسی آگاہی و شعور کی تشکیل کا باعث بنے۔ اس مضمون میں مظفر احمد کے اس شہری سماجی ماحول، سیاسی رجحانات اور ان راستوں کا، جن کے اثرات، 1910 میں کلکتہ کے دانشوروں پر نمایاں تھے اور جنہوں نے ان کے نظریاتی تغیر و تبدیل کی تشکیل کی، تجزیہ کیا گیا ہے۔

دیہات سے شہر کے سفر کو عموماً ''ہجرت'' کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے۔ سوانح عمری کی خود نوشتیں، افسانے اور تاریخی بیانات اجتماعی اور انفرادی تبدیلیوں کے تجربات سے اٹے ہوئے ہوتے۔ تاہم اس مضمون میں، نہ صرف یہ کہ ہجرت کے عمل پر توجہ مرکوز کی گئی ہے بلکہ شخصی و ذاتی

تبدیلی کے شہری ماخذوں پر بھی گہری نظر ڈالی گئی ہے۔

مشرقی بنگال (آج کا بنگلہ دیش) کے مفلوک الحال درمیانے طبقے کے ایک مسلمان دانشور کو شہری زندگی کی ابتدا کرنے میں جو مشکلات پیش آئیں، ان کو مدنظر رکھتے ہوئے اس مضمون میں، ایک ہجرت شدہ فرد کی بیگانگی اور اسے کنارے تک دھکیلے جانے کے دوران اس کے مسلسل بدلتے ہوئے حالات و تجربات پر روشنی ڈالی گئی ہے نیز اسی مضمون میں پہلی عالمی جنگ کے دوران ایک نوآبادیاتی شہر میں مخالف اور مزاحمتی قوتوں کے درمیان تعلق کی تحقیق بھی شامل ہے۔

دورانِ جنگ کلکتہ میں نظر آنے والے سیاسی رجحانات کی تشکیل میں ایک وسیع سلیقہ و قرینہ کارفرما رہا۔ آبادکاروں کے باعث سرمائے، انسان اور مادی وسائل کے غیر معمولی بہاؤ نے عام انسان کے حالات زندگی میں تیزی سے انحطاط پیدا کیا۔ بڑے دھارے کے قوم پرست سیاستدانوں کی باہمی جنگ کے بعد انہوں نے، نوآبادکاروں کو اپنی حمایت پر آمادہ کرنے کے لئے اعلیٰ مراعات کی امید دلائی۔ علاوہ ازیں عارضی طور پر محصور سامراجی طاقت کے نظام کو مزید کمزور کرنے اور اسے اپنے سر پر سے اتار پھینکنے کے لیے مختلف انقلابی گروپوں کے عزم، بڑھتے ہوئے جبر کے ذریعے برصغیر پر قبضہ برقرار رکھنے کی برطانوی کوششوں اور شہری سماجی ماحول پر ان کی حکمتِ عملیوں کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ مظفر احمد پر ان حالات و واقعات کا کیا اثر ہوا اور اس کی سوچ میں کیا تغیر و تبدیلی واقع ہوئی، اس مضمون میں اس کا بغور جائزہ لیا گیا ہے۔

نامعلوم سڑکیں

وہ شہر کیوں آیا؟ 1913 میں غریب نچلے درمیانی طبقے کے مہاجرین نے، بہتر زندگی کی تلاش میں، جو اکثر فریب دہی ثابت ہوئی، کلکتہ کے شہری خلا کو ہجوم سے بھر دیا۔ مظفر احمد اسی ہجوم میں محض ایک اور فرد تھا۔ جوں جوں اس شہر میں اس کے قیام کا عرصہ بڑھتا گیا، اسی تناسب سے مظفر کا اپنی دیہی جڑوں سے قائم مضبوط رشتہ کمزور ہوتا گیا۔ اس کی وقتی و موسمی غیر حاضریوں کے باوجود، اس شہر نے مظفر کی سماجی و سیاسی تنصیب کا مرکز بننا تھا۔ مظفر کے دیہی ماحول نے اسے بڑے شہر کی جانب دھکیلا تھا۔ اب دارالسلطنت کے ہیجان انگیز گرداب میں اس کی زندگی، مکمل طور پر نئے رخ اور مختلف پہلو میں ڈھلنے والی تھی، ایک بالکل نیا پہلو، جو کہ پہلے اپنا وجود نہیں رکھتا تھا

ابھرنے والا تھا۔

ان لوگوں کے لیے شہر، جو 1880 میں بنگال کے دیہی علاقوں کے مہذب وشائستہ لیکن غربت زدہ ماحول میں پیدا ہوئے تھے، مادی مواقع اور سماجی پیش قدمی کا کشادہ راستہ تھا۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں دیہی بنگال میں درمیانے اور نچلے طبقے کے مالکانِ اراضی کے لیے زرعی آمدنی کے سہارے اپنا بوجھ اٹھانا مسلسل دشوار ہوتا چلا جارہا تھا۔ اس طبقے کی بقا اور روزمرہ اخراجات کے حصول کا واحد راستہ محض سول پیشوں کی جانب رخ کرنا ہی تھا۔ مغربی تعلیم اور بالخصوص انگریزی کا واجبی علم ایک ایسا پل تھا جسے عبور کرنے کے بعد ہی کوئی، نوآبادیاتی سماج میں اپنا رشتہ قائم کرسکتا تھا۔

سینڈوپ (Sandwip) میں، جو خلیج بنگال میں ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا اور اس وقت مشرقی بنگال میں نواکھلی ضلع کا حصہ تھا، مادی وسائل کی کمی نے مظفر کو کلکتہ ہجرت کرنے پر مجبور کردیا۔ جانے پہچانے ماحول، تاریک وسنسان گلی کوچوں اور مٹی گارے کی چھوٹی موٹی تعمیرات پر مشتمل گاؤں اور ضلعی قصبوں سے نکل کر اچانک ایک اجنبی، روشن، گنجان آباد اور فلک بوس تعمیرات کے حامل ایک بڑے شہر میں آنا بذات خود ایک حیرت انگیز اور پرجوش تجربہ تھا۔ مادی محلِ وقوع کی جسمانی ماہیت میں یہ فوری اور اچانک تبدیلی حیران کن، بصیرت انگیز اور اضطرابی نوعیت کی تھی۔

شہری زیریں ساخت نے کلکتہ کو یوں بھی جداگانہ دارالسلطنت کے خدوخال دے دیئے تھے۔ 1913 تک اسے ایک مرتبہ پھر سے، دوبارہ متحد ہونے والے بنگال کے، دارالحکومت کا درجہ دے دیا گیا۔ تاہم اس نے برطانوی عہد کے ہندوستان میں انتظامی مرکز کے طور پر اپنا مقام کھو دیا تھا۔ نوآبادیاتی حکمرانی کے مرکز کی حیثیت سے اگرچہ کلکتہ کی بہت اونچی دورخی فوقیت کھو چکی تھی تاہم متبادل طور پر اس میں بہت سے نئے منصوبوں پر عمل درآمد شروع ہوگیا تاکہ اس کے تمثالی تصور کو نوآبادیاتی دارالحکومت کے راہنما مرکز کی حیثیت سے آراستہ کیا جاسکے۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد یہ مقام بھی کلکتہ سے واپس لے لیا گیا۔ کلکتہ ابھی بھی نوآبادیاتی شہری ترقی کا ایک ''قابل دید نمونہ'' تھا۔ نئی تخلیق شدہ، بنگال کی پریذیڈنسی کے دارالحکومت میں 13-1912 کے دوران، نوآبادیاتی میونسپل منصوبہ سازوں نے اپنے تفاخر اور بلند توقعات کا مندرجہ ذیل فیصلوں کی شکل میں اظہار کیا۔

(1) کلکتہ کی تجارت وصنعت اور اس کی شہری شرافت ان سالوں کے درمیان پھلی پھولی ہے اور اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ اس کی خوشحالی جاری رہے گی۔ اس بات کا بھی کوئی خوف نہیں کہ یہ ہندوستان کے پہلے شہر کی حیثیت سے اپنے دعوے کو کھو دے۔

(2) یہ رپورٹ، 13-1912 کے عرصے میں فراہم کی گئی شہری سہولتوں میں سے شہر کی روشنی کے نظام پر اپنی توجہ مرکوز رکھتی ہے۔ سب سے زیادہ تفاخر سے اعلان کرنے والی سہولت، 443 نئی گیس لائٹوں کی ''روشن کر دینے والی قوت'' ہے جس کے بعد گلیوں میں گیس سے روشن لیمپوں کی مجموعی تعداد 10,502 تک پہنچ گئی ہے۔ کچھ منتخب گلیوں میں بجلی کی روشنی نصب کرنے کی تجویز پر بھی غور کیا گیا ہے۔

اگرچہ شہر کی روشنیاں ترقی کی جانب اشارہ کرتی تھیں تاہم ان کی چمک شہری زندگی کے تضادات کو نہیں چھپا سکتی تھی۔ مفلوک الحال مہاجروں کو یہاں پہنچتے ہی، غیر یقینی کی کیفیت نے فوراً نگل لیا۔ 1912 میں دارالحکومت کی کلکتہ سے دہلی منتقلی نے حکومتی نوکریوں کے بڑے ماخذوں اور دیگر سہولتوں کا فقدان پیدا کر دیا تھا۔ نوآبادیاتی شہر کی نسلی پرولتاریت نے نئے تضادات کو جنم دے دیا تھا۔

شہری آبادی کے مختلف طبقات شہر کے الگ الگ جغرافیائی حصوں میں مجتمع تھے۔ شہر کی شمالی اور مشرقی اطراف میں ''مقامی'' کوارٹرز تھے۔ ''انتہائی گنجان آبادی'' کا یہ علاقہ، تنگ گلیوں اور سڑکوں کا ایک گورکھ دھندہ تھا۔ شہر کی جنوبی اور مغربی اطراف میں اعلیٰ طبقات کے ملکیتی علاقے واقع تھے۔ یہ علاقے کشادہ سڑکوں پر مشتمل اور عمدہ منصوبہ بندی سے تعمیر شدہ تھے۔ ان علاقوں میں یورپین ملکیتی بینک، گورنمنٹ اور پبلک کے دفاتر، بڑے بڑے ہوٹل، کاروباری مراکز اور اعلیٰ عہدیداروں کے کشادہ بنگلے واقع تھے۔ گنجان آباد شمالی علاقہ بیشتر انڈین لوگوں پر مشتمل تھا۔ چھدری، منتشر آبادی والا جنوبی حصہ، اکثر یورپین لوگوں پر مشتمل تھا۔ شہری انتظامیہ کی جانب سے ترقی کے دعوے، وسائل کی تقسیم میں مخفی ناہمواری و ناانصافی کو عیاں کرتے تھے۔ 13-1912 کی میونسپل رپورٹ میں روشنی کے جس نظام کو تفاخر کے طور پر بیان کیا گیا تھا، وہ ایک ایسی خلائی پرولتاریت کا مظہر تھا جس کی تشکیل براہِ راست نوآبادیاتی دارالحکومت کی ترجیحات کے مطابق کی گئی ہو۔ شمالی علاقے کی انڈین آبادی کو شکایت تھی کہ وہاں یہ نصب شدہ گیس لیمپ قابلِ اعتبار

نہیں تھے۔ جبکہ دوسری طرف ''بیلی گنج'' کو، جو جنوبی کلکتہ کی ایک فیشن ایبل یورپین آبادی تھی، بجلی سے متعارف کروانے کے لیے منتخب کرلیا گیا۔ اس علاقے میں سٹورروڈ کو تجرباتی طور پر تین ماہ کے لیے بجلی کی مفت روشنیوں سے آراستہ کردیا گیا۔

شہری زیریں ساخت اس لائق بھی نہیں تھی کہ پھیلتی ہوئی بیماریوں کے باعث کثیر تعداد میں ہونے والی اموات سے نمٹ سکے۔ طاعون، ڈینگو، ملیریا، چیچک، ڈائتھیریا، ہیضہ، ٹی بی اور سانس کے امراض کثرت سے پھیل چکے تھے۔ تاہم صاحبان اختیار نے اس سال تدفین کے انتظامات متعارف کروانے کی کوشش کی۔ مردوں کو بالترتیب رکھا گیا اور یہ احتیاط مدنظر رکھی گئی کہ ان کی لاشوں کو ان کے مذہب کے مطابق نبٹایا جائے۔ قبرستان اور مرگھٹ کے لیے مختص زمین کے سلسلے میں بہت سی تبدیلیاں اور بہتریاں عمل میں لائی گئیں۔ ''ہارک سرکس'' کے علاقے میں قبرستان کی پرانی چاردیواری کو لوہے کی سلاخوں سے بدل دیا گیا اور زمین کے ناہموار حصوں کو ہموار کیا گیا۔ نئی قبروں کے لیے اضافی جگہ فراہم کی گئی۔ یہ وہ قبرستان تھا جہاں ساٹھ سال بعد مظفر احمد کو دفن ہونا تھا۔

شہر کو، سر پہ چھا جانے والے سماجی تباہی کے تمثالی پیکروں سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ اخبارات کی رپورٹیں، موٹر کاروں کی تعداد میں بے انتہا اضافے کے باعث، ٹریفک کے بڑھتے ہوئے حادثات کا پتہ دینے لگیں۔ گلیوں کے کونوں میں دیگر خطرات بھی گھات لگانے لگے۔ پہلی عالمی جنگ کے موقع پر اور اس کے ابتدائی سالوں میں، مے میں غرق یورپین سپاہیوں کے پیدل چلنے والوں پر حملوں اور منظم چوری کی وارداتوں کی خبریں، ہندوستانی اخباروں میں تسلسل سے ملنے لگیں۔ 1914 میں کالج کے طلباء اور یورپین فوجیوں کے درمیان ریلوے سٹیشن پر صف آرائی کے باعث سرکاری تفتیش کا مطالبہ زور پکڑنے لگا۔ غرض کہ جنگ کے آغاز ہی سے ابھرنے والے معاشی اور سیاسی مسائل نے بنگالی دانشوروں کو تیزی سے گرفت میں لے لیا۔ نوآبادیات جوں جوں سامراجی جنگی کوششوں میں زیادہ سے زیادہ شریک ہوتی گئیں، قیمتوں اور بے روزگاری تیزی سے بڑھتی گئی۔ ان سب حالات کے پیش نظر علاقے میں قحط کی پیشن گوئیاں ہونے لگیں۔

درمیانے طبقے کی اندیشوں سے بھرپور آوازوں اور مجرمانہ ذہنیت کے حامل غرباء کے سڑکوں پر قابض ہوجانے کے اندیشوں نے اس مطالبے کا انداز اختیار کرلیا کہ پولیس ان کو مکمل تحفظ دے۔ اس وقت نوآبادیاتی ریاست، انصاف کو قائم رکھنے میں، بہت زیادہ پر اعتماد نظر نہیں

آ رہی تھی۔ دانشوروں کے باغی اراکین کو سرعام دبانے کے لیے پولیس کی قوت کو استعمال کرنا، حکومت کی مذمت کا سبب بن گیا تھا۔ نسلی دہشت گردی پر بھی عوام میں شدید غم وغصہ تھا۔ اس دہشت گردی میں یورپین سرکاری عہدے داروں کا وہ جان لیوا تشدد بھی شامل تھا جو گھریلو ملازمین، مزدوروں اور کاریگروں پر روا رکھا گیا تھا۔ ایسے تشدد کے باعث ہونے والی اموات کو سرکاری طور پر ''تلی پھٹنے'' کے باعث ہونے والی حادثاتی موت کہا جاتا تھا۔

نوآبادیاتی حلقوں کی جانب سے مخالف جذبات کا اظہار، ہندو بنگالیوں کے نچلے درمیانے طبقے سے تعلق رکھنے والے قوم پرست انقلابیوں اور اسلام کی بین الاقوامی تبلیغ کرنے والے حلقوں کی جانب سے زیادہ شدید تھا۔ جنگ کے دوران نافذ ہونے والے حفاظتی قانون کے تحت ظالمانہ گرفتاریوں پر بھی شدید ردعمل ظاہر ہو رہا تھا۔ 1916 کے آخر میں پولیس نے مولوی امام الدین کو نواکھلی مسجد کے باہر سے گرفتار کرلیا۔ مولوی امام الدین سچے مسلمان مبلغ اور بین الاقوامی شہرت کے حامل تھے۔ انہیں، عقیدے کی بنیاد پر جنگ پسند اور جہادی کا الزام لگا کر گرفتار کیا گیا تھا۔ مسلمان حلقوں کا دعویٰ تھا کہ مولوی امام الدین کسی طور پر بھی سیاسی عزائم نہیں رکھتے تھے اور ان کی غیر متعینہ نظر بندی، عوامی ذہن پر نقصان دہ اثرات مرتب کرے گی۔ برطانوی حکومت پر ایک الزام یہ بھی تھا کہ وہ مصنوعی اور جعلی طور پر لوگوں کو عوام کے سامنے دہشت گرد اور حکومت مخالف کہہ کر گرفتار کرتی تھی تاکہ ان کی آڑ میں سیاسی مخالفین پر انتہا پسند، باغی اور دہشت گرد ہونے کا الزام لگا کر کیا جانے والا جبر وتشدد جائز قرار دیا جاسکے۔

پریس سنسر شپ، ایک ایسی حکمتِ عملی تھی جس سے نوآبادیاتی مخالف آراء کو پھیلنے سے روکا جاسکتا تھا۔ اسے بھی شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگ کے عرصے میں پیدا ہونے والے غیر معمولی سماجی و سیاسی اندیشے مدغم ہو کر، جنگ کے بعد کے ہندوستانی سماج کے درمیانی اور بالائی طبقات پر، عارضی لیکن عظیم سالمیت واتحاد کی طرف گامزن ہونے والے تھے۔ باوجود اس کے کہ بنگال کے نوآبادیاتی راج تلے طبقاتی شناخت ابھر چکی تھی، سماجی پرولتاریت اور جانبداری رویہ کے مابین پیچیدہ تعلقاتی مظاہر نے، جنہیں نوآبادیاتی حالات نے مزید تیز فہم بنا دیا تھا، کلکتہ میں تہہ در تہہ ثقافت کو منشکل کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ مقبول اور ہر دل عزیز سیاست کے باعث، قومیت پرستی، محنت کش طبقات میں بے چینی اور طبقاتی مخالفتوں کے باہمی سیماب صفت تعلق نے واضح شکل اختیار کی۔

شعلے اور اسلام کا جھنڈا

ایسے ماحول میں سیاسی سرگرمیوں کی مقبولیت کی پشت پر سماجی تحریک تھی جو سرکاری پالیسیوں کے باہمی تعلقات کے باعث ابھری۔ سرکاری پالیسیوں میں سے ایک خاص طور پر سیاسی مقاصد کے تحت کی جانے والی نوآبادیاتی مردم شماری تھی۔ اس کے علاوہ بڑے دھارے کی قوم پرستی کی پیچیدگیاں بھی شامل تھیں جنہوں نے ہندو احیائے نو کی کوششوں میں شامل سیاسی نظریاتی علالتوں کو آزادانہ طور پر مستعار لیا تھا۔ ایک نوآبادیاتی سماجی ماحول میں میسر محدود وسائل کے سلسلے میں ہندوستانیوں اور ہندو برادری کے مختلف طبقوں کے مابین مقابلے کا رجحان بھی سیاسی سرگرمیوں کی مقبولیت کی بڑی وجوہات میں سے ایک تھا۔

گزشتہ صدی کے دوسرے عشرے میں مسلمانوں کی شناختی سیاست کے باعث متضاد سماجی سمتوں کا اظہار سامنے آیا۔ نظریاتی تضاد کے باعث دو مختلف جذباتی میلانات سامنے آئے جو خصوصیت کے اعتبار سے درحقیقت سامراج مخالف تھے۔ تاہم جنگ کے دوران اور فوری بعد، نوآبادیاتی حکومت کے خلاف دور دور تک پھیلی ہوئی عداوت، شناختی فکر کے مختلف النوع اجزا سے بہت آگے نکل گئی۔ صدی کی دوسری دہائی میں ہونے والے بین الاقوامی اسلامی سیاسی احیاء کا براہِ راست تعلق ترکی کی حدود میں بڑھتی ہوئی مغربی یورش سے تھا۔ اس نے نوآبادیاتی دنیا میں بڑھتے ہوئے نوآبادیاتی مخالف احساسات کو متاثر کیا۔ برادریوں کی قیادت میں تبدیلی اور اس قیادت کی جدوجہد کے باعث پیدا ہونے والی سیاسی تبدیلی، جنگ کے فوری پہلے کے عرصے کی نسبت، جنگ کے بعد کے زمانے میں واقعات کو زیادہ متاثر کرتی نظر آتی ہے۔

1912 میں بنگال کو ایک انتظامی یونٹ کی حیثیت سے دوبارہ متحد کرنے کا مقصد، مسلمان ملکیتی طبقات کو ان کی سماجی قوت اور انہیں حاصل مراعات کو واپس کرنا تھا جو انہیں 1905 میں مشرقی بنگال میں عارضی طور پر حاصل تھیں۔ اس کے بعد نہ صرف نوآبادیاتی حکومت کے خلاف بلکہ اس کے وفاداروں کے خلاف بھی، جو زیادہ تر اردو بولنے والے امراء قائدین تھے، تیز فہم سیاسی عداوت کا آغاز ہو گیا۔

1912 میں آل ہندوستان مسلم لیگ کی قیادت پر بین الاقوامی اسلام پسندوں اور حکومت

کی غیر وفادار قوتوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ 1916 میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان ہونے والے لکھنؤ پیکٹ نے، جس میں منتخب جماعتوں کے مابین نشستوں کی تقسیم اور جنگ کے بعد ہندوستانیوں کو زیادہ سے زیادہ قوت منتقل کرنے کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالنے پر اتفاق کیا گیا تھا، شہری مسلمانوں کے بڑے حصوں کے درمیان بغاوت پہ مبنی حکومت مخالف سیاست کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔

اے۔ کے۔ فضل الرحمٰن اور ابو الکلام آزاد جو کہ بالترتیب بنگالی اور اردو بولنے والے دانشوروں کے نئے قائدین تھے، ان تبدیلیوں سے قریبی طور پر وابستہ تھے۔ اسلامی سیاست کی جن مختلف پرچھائیوں کی نمائندگی یہ لوگ کرتے تھے اس کا سلسلہ حزب مخالف سے حکومت تک پھیلا ہوا تھا۔ جیسا کہ آزاد کے اقدامات سے واضح ہوتا ہے، جنگجو قسم کی نوآبادیاتی مخالف جدوجہد کا آغاز ہو چکا تھا۔ شہری آزادی کے حصول کے لیے، طویل متحدہ رزم کا آغاز، ہندوستانی انقلاب پسندوں کی گرفتاریوں کے باعث ہوا جس میں زیادہ تر درمیانے طبقے کے بنگالی ہندو شامل تھے۔ اس کا باعث بین الاقوامی اسلام پسند بھی تھے جنہوں نے نہ صرف عملی طور پر بغاوت کی بلکہ برطانیہ کی جنگی کوششوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش بھی کی۔ جنگ کے بعد خلافت اور عدم تعاون کی تحریکیں اس اتحاد کا وسیلہ بن گئیں۔ ایک چھوٹی لیکن اہم اقلیت کا ان نوآبادیاتی مخالف عوامی تحریکوں میں شمولیت، دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کا اظہار بھی تھا کہ اس اقلیت نے سیاسی قوت، بین الاقوامی اسلام پسند نظریات اور قوم پرست قائدین کو مسترد کر دیا ہے۔

قوت مخالف طبقاتی نظام سے انہیں کمیونزم کی جانب حرکت کرنا تھا۔ جنگ کے دوران انہوں نے خود کو دوبارہ سے منظم کیا اور جنگ کے بعد عوامی اشتعال اور بغاوت کے دوران ''نیا روپ'' بدلا۔ ان کی سیاست تبدیلی کے عمل میں داخل ہوئی۔

کالج کی گلیوں کے اندر اور گرد

جب مظفر شہر میں پہنچا تو مسلم دانشوروں پر نوآبادیاتی مخالف رجحان غالب تھا۔ 1912 سے 1913 کے دوران کلکتہ میں اس کا سماجی ماحول، آغاز میں طلباء کے طبقے پر مشتمل تھا۔ درمیانے طبقے کے مسلمان حلقوں سے اس کے قریبی اور گہرے مراسم استوار ہوئے۔ بعد

میں طلباء کے ان طبقات کی بجائے ادبی انجمنوں نے شہر میں اس کی سماجی سرگرمیوں کا مرکز بننا تھا۔

اگر چہ مظفر کی شہر میں طالب علمی کی زندگی مقابلتاً مختصر تھی تاہم طلبا نے مضبوط سیاسی دلچسپیوں کا اظہار کیا۔ اس عرصے میں وہ نوجوان دانشوروں سے وابستہ سماجی تعلق اور ان کی سیاسی وابستگی کا راز داں ہو چکا تھا۔ 1905 سے درمیانے طبقے کے ہندو قوم پرست سیاست میں دکھائی دینے لگے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ درمیانے طبقے کے بنگالی ہندو نوجوانوں، بالخصوص طلبا میں قوم پرست انقلابی عمل تیز ہو چکا تھا۔ ان کی انفرادی سرگرمیوں کا نشانہ، یورپی منتظمین اور ان کے ہندوستانی مددگار تھے۔ مظفر کا تعلق اسی طرز کی سیاسی سرگرمیوں سے جڑ گیا تھا۔ نواکھلی ڈسٹرکٹ سکول میں اس کا سب سے زیادہ قریبی ہم جماعت انقلابی قوم پرستی کی تحریک میں شامل ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اسے جیل بھی کاٹنا پڑی۔ طلباء کے درمیان توصیف کی فضا اور مناسب حد تک حمایت کی وجہ سے قوم پرست انقلابیوں کو اپنے کام میں سہولت حاصل ہو گئی تھی۔ طلبا کے حلقوں نے انہیں نہ صرف تحفظ فراہم کیا بلکہ نئے رضا کار بھی مہیا کیے۔

کالج کو جانے والی گلیاں، ان سے متصل کوچے اور اردگرد کے علاقے، شمالی کلکتہ کی مرکزی شارع عام، سب نے مل کر انقلابیوں کو اعصابی راستے مہیا کیے۔ ان ہی راستوں سے مختلف قومیتوں میں نوآبادیاتی مخالف تحریک ابھری جو مسلسل جاری رہی۔ طلباء کی رہائشی گلیاں، کالج کے ہوسٹل، ہندوستان کے اعلیٰ ترین نوآبادیاتی ادارے مثلاً پریذیڈنسی کالج اور کلکتہ یونیورسٹی، دانشوروں کی عوامی سرگرمیوں سے متعلق بہت سے ادارے اور ان کے ساتھ ساتھ کالج سکوائر، سوئمنگ پول، پارک تمام کے تمام، انقلابیوں کی باہمی ملاقاتوں اور مشورہ گاہوں کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔

ادب سے متعلقہ لوگوں کے اجتماع کے باعث یہ علاقہ کتابوں کی تجارت کا پھلتا پھولتا مرکز بھی بن گیا تھا۔ دیکھا دیکھی کلکتہ کے کتب فروش اور ناشرین (جن میں مظفر احمد کا روزنامہ بھی شامل تھا) بھی ان سے منسلک ہو گئے۔ مزید یہ کہ مستحکم کتب فروشوں اور اشاعتی اداروں نے، جن کا تعلق بنگالی ہندوؤں کے درمیانی اور بالائی طبقے سے تھا، نیز مفلوک الحال مسلمانوں نے، استعمال شدہ کتب کی تجارت پہ اجارہ داری قائم کر لی تھی۔ وہ ''کالج سٹریٹ'' پر اپنے سامان کو سڑک کے کنارے، پٹ سن کے کپڑوں اور تھیلوں پہ پھیلا دیتے۔ درمیانے طبقے کے گاہک وہاں آتے

اور گھنٹوں صفحات کا مطالعہ کرتے۔ سوداگروں اور پیشہ ور جلد سازوں نے، جو زیادہ تر مسلمان تھے، شہری محنت کش طبقے اور کلکتہ کے دانشوروں کے درمیان روزمرہ کا سماجی تعلق پیدا کر دیا۔

زیر زمین دنیا کی آبادی میں بھی اضافہ ہوا۔ اس آبادی بیشتر حصہ بدمعاشوں اور جیب کتروں پر مشتمل تھا جن میں ان مسلمان محنت کش لوگوں کا بڑا حصہ بھی شامل تھا جو بیروزگاری کے باعث جرم کی جانب چلے گئے تھے۔ زیر زمین دنیا کے یہ باسی بھی اس علاقے میں اپنی موجودگی سے لطف اندوز ہوتے تھے باوجود اس کے کہ یہ لوگ شدید قسم کے سیماب صفت اور جھگڑالو رجحانات کے قائل تھے۔ یہ لوگ دور دور تک پھیلی ہوئی ریاست مخالف بغاوت کے کردار بھی بنے جو جنگ کے بعد کے عرصے میں واضح ہوئی۔

بعض اوقات دولت اور سماجی تقسیم اس اجتماعی زندگی میں دراڑ ڈال دیتی تھی۔ نچلے طبقے کے طالب علم، بستے گھر کی سیڑھیوں کو کرائے پر حاصل کر لیتے تھے تاکہ رات بسر کر سکیں۔ طلبا کے درمیان مذہبی تفاوت اور اقلیتی بنگال کے دیہاتوں اور دوسرے صوبوں سے آئے ہوئے مسلمانوں کے لیے، موزوں رہائشی جگہ کی عدم دستیابی ان کو مشکل میں ڈال دیتی تھی اور بعض اوقات مسلمان طلباء، کلکتہ میں اپنی تعلیم کو خیرآباد کہنے اور واپس جانے پہ مجبور ہو جاتے۔ مظفر کے شہر آنے سے ایک سال قبل 1912 میں مسلمان طلبا کے کلکتہ کے کالجوں اور ہوسٹلوں میں داخلے پر پابندی نے تضادات کو جنم دیا۔ قیام وطعام کا انتظام کرنے والے ہندو، مسلمان طلباء کو، جو وسیع اور مسلسل سماجی حصہ تھے، جگہ دینے سے انکار کر دیتے تھے جو ہندو مالکانِ جائیداد کے تعصبات کا واضح اظہار تھا۔ تاہم کچھ کم متعصب اور معاشی طور کمزور بنگالی ہندو مالکان، مسلمانوں کو اپنی جائیداد کرائے پر دینے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ 1918 میں بنگال لٹریری (ادبی) سوسائٹی نے، جس سے مظفر احمد کا بھی تعلق تھا، ایک بنگالی ہندو میڈیکل پریکٹیشنر کے گھر کا ایک حصہ کرائے پر لیا تھا۔

طلباء کی خاصی نمایاں تعداد پرائیویٹ ٹیوٹر کے طور پر کام کرتی تھی۔ اس طرح انہیں ان مسلمان گھرانوں میں، جہاں وہ بطور ٹیوٹر کام کرتے تھے، قیام وطعام کی سہولت حاصل ہو جاتی تھی۔ مظفر ایک ایسے ہی خاندان کے ساتھ، جو ''کالج سٹریٹ'' کے قریب ایک مکان کی بالائی منزل پر رہائش پذیر تھا، جنگ کے دوران چار برس مقیم رہا۔ یہی مظفر احمد کا ابتدائی ماحول تھا جب وہ کلکتہ پہنچا اور اس نے گریجویشن سے پہلے، بانگاباشی کالج میں داخلہ لیا۔

بانگاباشی کالج، کلکتہ یونیورسٹی سے ملحق تھا جسے بنگالی ہندو دانشوروں کے ایما پر شروع کیا گیا تھا تاکہ درمیانے طبقے کے بنگالیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو تعلیمی مواقع مہیا کیے جائیں۔ یہ اپنی مدد آپ کے تحت بننے والے ادارے تھے جن کا انحصار ٹیوشن فیس پر تھا۔ بانگاباشی ایسے ہی بڑے تعلیمی اداروں میں سے ایک تھا۔ دوسرے اداروں کے برعکس اس میں مسلمانوں کو بھی داخلہ مل جاتا تھا۔ مسلمانوں کے نچلے درمیانے طبقے کے طالب علم کم فیس کے باعث، ان اداروں کی جانب کھنچے چلے آتے تھے۔ تاہم طلباء کی برادری میں مسلمان ایک قلیل سی اقلیت پر مشتمل تھے۔ 1914 میں جو ایک ہزار طلباء داخل ہوئے ان میں سے محض 27 مسلمان تھے۔ مظفر ان میں سے ایک تھا۔ پری گریجویشن امتحان میں ناکام ہونے کے باعث مظفر نے تعلیم کو خیرآباد کہہ دیا۔

مسلمانوں اور دوسرے مفلس طلباء میں تعلیم کو ترک کر دینا ہرگز کوئی غیر معمولی نہیں تھا۔ کامیاب مسلمان طلباء کا تناسب بھی کم تھا اور ناکام ہونے والے طلباء مفلسی کے باعث تعلیم جاری بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔ مظفر کلکتہ میں محض دو سال کے لیے طالب علم رہا لیکن کالج سٹریٹ اور اس کے گردونواح اس کا مسلسل ٹھکانہ رہے۔

1919-20 کے دوران اس کا ٹھکانہ کالج سٹریٹ پر واقع ادبی سوسائٹی کا دفتر تھا۔ وہ ''بک کمپنی'' میں باقاعدگی سے جاتا۔ یہ دوکان کالج سکوائر میں 1917 میں کھلی تھی اور اس نے اپنی حکمت عملی کے ذریعے تیزی سے، ادبی کتابوں کی دوسری پرانی اور مستحکم یورپی کمپنیوں پر سبقت حاصل کر لی تھی۔ مالک دکان گرنندرا ناتھ حترا ہمیشہ سب کا خیر مقدم کرتا دکھائی دیتا۔ تاہم یہ دوکان خفیہ طور پر بغاوت پر مبنی مواد اور مظفر جیسے ابتدائی کمیونسٹوں اور قوم پرست انقلابیوں سے تعلق رکھنے کے باعث پولیس کی نظر میں آ چکی تھی۔ کچھ انقلابی تو یہاں باقاعدہ ملازم بھی تھے۔ علاوہ ازیں یہ دکان گوناگوں نظریات رکھنے والے بنگالی مصنفین اور دانشوروں کی آماجگاہ کے طور پر بھی مشہور تھی۔

انقلابی قوم پرست تحریک سے قوم پرست ذہن کے لوگ منسلک تھے۔ مظفر اپنے حلقہ احباب کے اثرات سے اس تحریک میں شامل ہوا۔ اس میں پولیس کا تشدد اور ریاستی جبر کا سامنا کرنے کی ہمت تھی جس نے اسے اپنے ہم عصر درمیانے طبقے کے نوجوانوں کے لیے مثال بنا دیا۔ ہندو اپنی تنگ نظری کے باعث مسلمانوں کو شامل نہیں کرتے تھے۔ ''انوز ہلان سمیتا'' کھلے عام مسلمانوں کی مخالف تھی۔ مظفر نے ان کے بارے میں اپنی وابستگی اور علیحدگی کے بارے میں لکھا۔

''اس صدی کی دوسری دہائی میں اپنی ذہنی کیفیت اور رومانیت کے باعث میرے لیے دہشت گرد تحریک میں شامل ہونا ناممکن نہیں تھا۔ لیکن اس میں کچھ رکاوٹیں تھیں۔ دہشت گرد انقلابی اپنی تخلیقی یا روحانی قوت کا منبع، بنکم چندر چٹوپادھیا کی آنند ماتھ کو سمجھتا تھا۔ یہ کتاب ہندو کے ازلی تعصب سے بھری ہوئی تھی۔ کتاب کا بنیادی پیغام ''بنکم چندرا'' کا ترانہ ''وندے ماترم'' تھا جو ان سطور پر مشتمل ہے۔

''تم جو قوت بن کر انسان کے بازوؤں میں رہتی ہو
تم جو عقیدہ بن کر دلوں پر حکومت کرتی ہو
تمہارے پاس ''درگا'' کی قوت کے دس ہاتھ ہیں''

کوئی بھی وحدانیت پرست مسلمان نوجوان ان مشرکانہ الفاظ کو کیسے دہرا سکتا تھا۔ قومیت پرست سیاسی ثقافت میں ملک دیوی ماں کا ہم معنی تھا۔ بت پرستی اور ہندوؤں کی پرتشدد وطن پرستی کی علامات دوسرے تمام جذبوں پر غالب تھیں۔ ان ہی وجوہات نے مظفر اور دوسرے مسلمانوں کو ان سے علیحدہ کر دیا۔ نوآبادیاتی مخالف سیاست کی اس ماہیت سے مظفر خود کو وابستہ نہ رکھ سکا تاہم وسیع سامراج مخالف حلقے اور تحریکیں اس کے لیے کشش کا باعث رہیں۔ وہ طالب علمی کے زمانے ہی میں آہستہ آہستہ باہمی ثقافتی سرگرمیوں کی جانب متوجہ ہوتا گیا۔

یوں اس نے ایک اجنبی ماحول میں، بہت سے دوسرے تنہا مہاجروں کی طرح، رہتے ہوئے، ایسی وابستگی کی تلاش شروع کر دی جو اسے اجتماعیت کی حس عطا کر سکے۔ وہ شروع ہی سے ایک تسلیم شدہ مصنف تھا چنانچہ اس نے دوبارہ ادبی حلقوں سے رجوع کر لیا۔ ابتدائی طور پر 1911 میں اس نے ہم ذوق طلباء پر مشتمل ایک تنظیم ''بنگال مسلم ادبی سوسائٹی'' کی بنیاد رکھی۔ اس سوسائٹی نے بنگالی مسلمانوں میں بنگالی ادب کی مقبولیت اور استحکام کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ کلکتہ میں انتہائی مختصر سی تعداد پر مشتمل دانشوروں نے، ہندوؤں کے درمیانی اور بالائی طبقے کے سماجی تعصبات سے خود کو محفوظ رکھتے ہوئے، کمیونٹی کی بنیاد پر خود اپنی تنظیم قائم کی۔

ایسی تنظیم، تجرد پسندی کے ساتھ ساتھ مذہبی اتحاد کی بھی خواہاں ہوتی ہے۔ ایسی ہی تنظیمیں مسلم محنت کشوں پر بھی اثر انداز ہوتی تھیں۔ مہاجروں، اقلیتوں اور مسترد کردہ لوگوں کے لیے

تشکیل پانے والی ایسی تنظیمیں، جدلیاتی شناخت، پیچیدہ معاشرے اور شہر کے سماجی جال کی بنیادوں میں موجود اختلافات کی نمائندہ ہوتی تھیں۔ مختلف قومیتوں کی طبقاتی کشمکش کے نتیجے میں، متعدد جماعتیں مسلسل تشکیل پاتی اور ختم ہوتی رہیں۔ جس سماجی ضرورت نے مظفر کو بنگال کی مسلم ادبی سوسائٹی کی جانب مائل کیا تھا، اسی نے اسے دوسری غیر تجرد پسند، کمیونزم سے بالا تنظیموں سے بھی منسلک کر دیا۔

بنگال مسلم ادبی سوسائٹی کے قیام نے اقلیت در اقلیت سے آگاہی بخشی اور غالب اردو ادبی ثقافت کو علیحدہ شناخت فراہم کرنے کی ضرورت کو جنم دیا۔ ایک طعام گاہ کو، جو شمالی ''چوک خانساماں لین'' میں، مسلمانوں کے ایک گروپ کے زیر اہتمام تھی، دفتر کی حیثیت سے استعمال کیا گیا۔ بعد ازاں سوسائٹی کا دفتر 32 کالج سٹریٹ پر منتقل ہو گیا۔ مظفر نے یہاں 1919 میں رہنا شروع کیا اور سوسائٹی ہی اس کی ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی۔ بنگال کی مسلم ادبی سوسائٹی کا مقصد تعلیم یافتہ مسلمان بنگالی قومیت میں ادبی شعور پیدا کرنا تھا تاہم اس نے کثرت الوجود خصوصیت کو بالیدگی دی۔ تنظیم نے ان بنگالی ہندو دانشوروں کو رکنیت کی دعوت دی جو ایک ایسے صوبے کے مسلمانوں میں بنگالی زبان کی ترقی کے خواہاں تھے جہاں بنگالی بولنے والوں کی اکثریت، اسلام کے پیروکاروں کے طور پر جانی جاتی تھی۔ یہ ابھرتے ہوئے بنگالی مسلمان مصنفین کے لیے نقطۂ آغاز بنا۔ اس سماج کی فرقہ وارانہ لسانی تہذیبی سیاست نے موجودہ بنگالی ادبی منظر نامے کو اجاگر کیا جس پر بنگالی ہندو مصنفین غالب تھے۔

مظفر نے 1913 میں سوسائٹی میں اس وقت شمولیت اختیار کی جب وہ مکمل طور پر منتشر تھی۔ دوسرے نمایاں بنگالی مسلمان مصنفین اور سرگرم سیاسی کارکنوں کے ساتھ مل کر، جو کلکتہ کے ادبی حلقوں میں بخوبی پہچانے جاتے تھے، مظفر سوسائٹی کے احیا میں شامل تھا۔ بہت جلد مظفر ایک ہمہ وقت ادبی سرگرم کارکن بن گیا۔ ہندو بنگالی پس منظر رکھنے والے بہت سے نمایاں مصنفین نے، جن میں ایسی شخصیت بھی شامل تھی جس نے اصولوں کی بنیاد پر اپنے ناولوں کا معاوضہ کبھی نہیں لیا تھا، اپنی تصانیف، سوسائٹی کے ریڈنگ روم کے لیے بطور عطیہ فراہم کیں۔ ادبی سوسائٹی میں کام کرنے کی وجہ سے مظفر کو مسلمان مصنفین، صحافیوں اور سیاسی سرگرم کارکنوں کے ساتھ ساتھ بنگالی ہندو دانشوروں سے بھی تعلق قائم کرنے کا موقع بھی ملا۔ عبدالرزاق خان نام کی ایک عام شخصیت

بھی اس سوسائٹی سے منسلک تھی جو 1920 کے آغاز میں مظفر کے پہلے سوشلسٹ ساتھی کی حیثیت سے سامنے آئی۔

مظفر نے جنگ کے پورے عرصے کے دوران میں مختلف عارضی نوکریاں کیں۔ اس نے بحیثیت استاد، کلرک، ترجمان اور بالآخر ایک ہمہ وقت صحافی کے طور پر کام کیا۔ اس نے ایک پرائیویٹ ٹیوٹر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ وہ مسلمان خاندانوں کے نوجوان بچوں کو پڑھاتا تھا۔ کلکتہ میں ٹیوٹر (استاد) کی حیثیت سے کام کرنے کے دوران اس کا قیام، کالج سٹریٹ کے قریب، زندہ دل اور خوش طبع مسلم تجارتی علاقے میں، انیسویں صدی کے مشہور اردو مصنف منشی علیم الدین کے خاندان کے ساتھ رہا۔ مظفر نے مختصر عرصے کے لیے انسپکٹر آف سکولز کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ سب سے طویل عرصے کے لیے مظفر کو بنگالی سرکاری چھاپہ خانے میں نوکری ملی۔ اس کا کام مشرقی ہندوستان کے عہد کی رائٹرز بلڈنگ کے، جہاں پریس موجود تھا، تنگ سائبانوں پر مشتمل دفتر میں موجود کاغذات کے ڈھیر کی چھان بین کرنا تھا۔ اس نے مذبح خانے میں بھی کام کیا جہاں اسے جانوروں کو ذبح کرنے کا کام سونپا گیا۔ اس نے مجبوری میں اس ناپسندیدہ کام کو قبول تو کر لیا لیکن پھر اسے جلد ہی چھوڑ بھی دیا۔ نامناسب تنخواہ اور عارضی نوکری کے باوجود اس نے بنگال حکومت کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں عربی اور اردو مواد کے سرکاری مترجم کی حیثیت سے بھی کام جاری رکھا۔

پیچیدہ ثقافتی سیاست کی اقلیم

مسلمان دانشوروں کی تعداد بہت کم تھی۔ 1911 کی مردم شماری کے مطابق 6000 سے کم مسلمانوں کا تعلق سول پیشوں سے تھا۔ سفید پوش درمیانے طبقے کے مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں سے بہت کم تھی۔ ہر 7 ہندوؤں کے مقابلے میں ایک مسلمان کا تناسب تھا۔ حتیٰ کہ ان کی تعداد عیسائیوں سے بھی کم تھی۔ اس کے باوجود کلکتہ میں ان کی ادبی سرگرمیوں کو 1910 میں بہت زیادہ سرکاری توجہ (مانیٹرنگ) اور سنسر شپ کا سامنا کرنا پڑا۔ اردو اور عربی پریس نے اسلامی نظریات کو بین الاقوامی طور پر پھیلانے میں بہت کام کیا۔ برطانیہ مخالف اور اسلامی جذبات کو بین لاقوامی سطح پر اجاگر کرنے کا کام بنگالی اور انگریزی روزنامے اور اخبارات کرتے تھے۔ پریس،

حکومت کے خلاف ہندو مسلمان ایکشن کے لیے متحد ہو چکا تھا۔

ادبی سوسائٹی میں مظفر کے کام نے اسے مصنف کے طور پر نمایاں ہونے میں مدد دی اور بعد ازاں اس کے لیے سیاسی صحافی کے طور پر کام کرنے کا راستہ صاف کر دیا۔ اس نے جن موضوعات کا انتخاب کیا اور اجتماعات میں جو تقاریر کیں ان سے اس کی دانشورانہ سوچ اور سیاسی پوزیشن میں بتدریج تبدیلی کا انعکاس ہوتا ہے۔ سیاسی بالیدگی نے اس کی تحریر کی پختگی اور بالغ نظری میں نمایاں کردار ادا کیا۔ نوا کھلی میں ایک طالب علم کی حیثیت سے وہ سیاست میں دلچسپی رکھتا تھا۔ 1916 کے لکھنؤ کی فضا میں ہندو مسلم اتحاد بہت نمایاں تھا جس نے مظفر کو ہر قسم کے سیاسی اجتماعات میں شریک ہونے کا موقع دیا۔ ان میں سیاسی قیدیوں کی آزادی کے مطالبے کے لیے ''احتجاجی ریلی'' بھی شامل تھی۔ مظفر ان سامعین کا بھی ایک حصہ تھا جو کہ 1917 میں شہر میں کانگریس اور مسلم لیگی رہنماؤں کی تقاریر سننے کے لیے جمع تھے۔ وہ ان سیاسی شخصیات کو جانتا تھا جن کا ادبی سوسائٹی سے تعلق تھا اور جو مسلم لیگ اور کانگریس کے نمایاں سرگرم کارکن تھے لیکن اس نے دونوں تنظیموں میں شمولیت سے گریز کیا۔ اس عرصے میں اس کی سیاسی پوزیشن بہت پرت دار انداز میں رہی جو اس کے تذبذب کو منعکس کرتی تھی۔ اس مفہوم میں وہ کلکتہ میں مسلمان دانشور سماجی ماحول کا ایک ایسا حصہ تھا جو گونا گوں سمتوں سے شناختی سیاست کے تناؤ کا تجربہ کر رہا تھا۔

بنگال مسلم جرنل (روزنامے) میں اشاعت شدہ مظفر کی تحریروں کا ایک مختصر تجزیہ، سیاسی پوزیشن میں اس کے رقت آمیز تذبذب کو ظاہر کرتا ہے۔ مظفر کے 1910 میں لکھے گئے مضامین، جن میں سے بہت کم دستیاب ہیں، بنیادی طور پر ثقافتی حجتوں اور مناظروں کی یلغار نظر آتے ہیں۔ یہ مضامین بنگالی مسلم برادری کے ہم عصر درمیانے طبقے کے خیالات سے موافق ہیں۔ 1916 سے 1921 کے درمیان مظفر، بنگالی مسلم ادبی طبقے کے سب سے زیادہ شائع ہونے والے ادبی روزناموں سے مکمل طور پر واقف تھا۔ مظفر نے بنگال مسلم ادبی روزنامے میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کے طور پر بھی کام کیا جسے کہ بنگال کی مسلم سوسائٹی کا لازمی جزو سمجھا جاتا تھا۔ اس کی ذمہ داری، خبروں کے صفحات کو ترتیب دینے کی تھی۔ 1919 میں وہ وسیع مسلم ادبی حلقوں میں ایک ایسے ''ہنرمند (ماہر) لکھاری کے'' طور پر مقبول ہو گیا تھا جس کے مضامین ''پڑھنے کے لیے باعثِ مسرت'' سمجھے جاتے تھے۔ وہ اہم مسلم بنگالی مقالہ جات لکھنے والوں میں سرفہرست آ گیا تھا۔

روزنامے ہندو مسلمان اتحاد اور مسلم بنگالی ثقافت کے گروہی، لسانی اجزا کو اجاگر کرنے پر زور دے رہے تھے۔ انہوں نے درمیانے طبقے کے بنگالی مسلمانوں کی سماجی خواہشات کی تکمیل کے لئے ذاتی بہتری اور ثقافتی سیاست کو اجاگر کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ 1918 میں ''بنگیا مسلمان ساہتیا پتریکا'' نے اپنے اصولوں کی وضاحت کے دوران اسی ایجنڈے کو واضح طور پر شائع کیا۔ اس بہتری کی ضرورت پر ہر اجتماع میں وسیع اصرار کے طور پر مباحث ہوئے جنہوں نے مظفر کے دیہاتی سماجی ماحول کے ملکیتی طبقے کے ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کو متحرک و فعال کر دیا۔

صحافت میں، زبان کے مسئلے پر بنگالی مسلمانوں کی گروہی، لسانی اور ثقافتی بنیادوں کو طویل مباحثوں کی نظر کر دیا۔ اس پر زیادہ تر مسلمان متفق تھے کہ فارسی و عربی روایات نے مسلمانوں کو دنیا بھر میں روحانی اور ثقافتی پہچان مہیا کی ہے اور یہ کہ ہندوستان میں اردو زبان، اسلامی عظمت کی ترجمان و ذریعہ اظہار تھی۔ ان حقائق کے باوجود ان اخبارات میں دانشوروں نے اپنی تحریروں میں اس بات پر زور دیا کہ کسی بھی دوسری زبان کی نسبت، بنگالی زبان، اس علاقے کے مسلمانوں کی ثقافت کے قریب ترین ہے۔ ان تحریروں نے بنگالی کو مادری اور مقامی ثقافت کی زبان کی حیثیت سے اجاگر کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ مظفر نے اس رائے پر موثر طریقے سے صاد کیا اور دوسرے مصنفین کی طرح قومیت کی بجائے اسلامی اقدار کے احیاء پر زور دیا۔ 1917 میں شائع ہونے والے مضمون میں، جس کا عنوان اردو زبان اور بنگالی مسلمان تھا، میں مظفر نے یہ کہتے ہوئے کہ کوئی اسلامی بنیاد انہیں لوگوں کی مادری زبان سے محروم نہیں کر سکتی، ان تمام لوگوں کی مذمت کی جنہوں نے اردو کو بنگالی مسلمانوں پر مسلط کرنے کی کوشش کی۔

ان دانشوروں نے بنگالی ذخیرہ الفاظ سے ترکی، فارسی اور عربی کے الفاظ کو عمداً خارج کرنے کے خلاف بھی بحث کی۔ ساتھ ہی انہوں نے بنگالی ہندو دانشوروں کے خیالات، مباحثوں اور مکالمات کے تبادلے کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ یہ کوئی اپنے آپ تک محدود دنیا نہیں تھی۔ ہندو خواتین مصنفین نے درمیانے طبقے کی قابلِ تعظیم بنگالی خواتین کی جانفشانی کے بارے میں ان روزناموں میں مضامین لکھے اور خراجِ تحسین حاصل کیا۔ ہندو بنگالی پس منظر کے حامل کئی مصنفین نے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے درمیانے طبقے کی دلچسپی کے موضوعات پر لکھا۔

اخباروں نے ''اسلام کی گذشتہ عظمت'' کے بارے میں مضامین کی بھرمار ہو گئی۔ عربوں سے

پہلے کی تاریکی، جنوبی سپین کے بادشاہوں کی قوت اور قرونِ وسطی کے مغربی ایشیا کی ادبی اور سائنسی کامیابیوں جیسے واقعات مسلسل دوہرائے جانے لگے۔ اسلام میں عورت کی عزت و مقام پر بھی مضامین چھاپے گئے جن میں دلائل سے ثابت کیا گیا اسلام نے عورت کو بلند درجہ عطا کیا ہے۔ پردے کی اہمیت بھی اجاگر کی گئی کہ یہ عورت کے تقدس اور اس کے اعزاز کی علامت تھی۔ مظفر نے جنس پر لکھے گئے مباحثوں میں بھی حصہ لیا۔ اس نے خواتین کی تعلیم اور اس کے ساتھ ساتھ پردے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ اس مقام پر وہ اپنے آپ کو ایک راسخ العقیدہ مسلمان کے طور پر دیکھتا تھا جو نیک سیرت خواتین کی وضع داری کے مروجہ راستوں کا معاون ہوتا ہے۔ چند ہی سالوں کے اندر اس نے، سرگرم انقلابی کارکن بننے کے عمل کے دوران، خود کو درمیانے طبقے کے مسائل سے غیر وابستہ کرلیا اور اس بارے میں سوالات اٹھاتے ہوئے اپنی اس پوزیشن سے دستبردار ہوگیا۔

دوسرے زیر بحث حساس موضوعات میں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف عیسائیوں کے اصلاحی فرقے کے اقدامات اور ہندوؤں کے احیائی تعصبات تھے۔ امراء، پٹے دار مال گزاروں اور کسانوں پر بالادست ہندو جاگیرداروں کے ظلم سے جنم لینے والے بھیانک مسائل نے نظموں اور ادبی نثر پاروں میں جگہ لینا شروع کردی تھی۔ ان اخباروں کے قارئین میں سے زیادہ تر درمیانی طبقے کے مسلمان تھے جن میں ہندو ملکیتی عناصر کی سماجی، معاشی قوت کا مقابلہ کرنے اور ان کے برابر آنے کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ یہ اخبارات اس جذبے کو مزید پروان چڑھاتے۔ ان ہی اخبارات میں، ایشیائی بنیادوں کے تصور کے حامل بڑے دھارے کی طرف سے، جو درحقیقت مسلمانوں اور ہندوؤں کی احیائی علامتوں کے دشمن تھے، قوم پرستی کے پرچار کو بھی بھرپور طریقے سے پیش کیا جارہا تھا۔ چونکہ بظاہر اس پرچار کو سماجی مفادات کے پردے میں لپیٹ کر پیش کیا جارہا تھا نیز اسے علاقے کے مسلمان بنگالیوں کی شناختی فکر کو ابھارنے کے حوالے سے بیان کیا جاتا تھا چنانچہ یہ تنقیدی تناظر قوم پرستی کے ایک واضح استرداد کی شکل اختیار نہ کرسکا۔

مسلم بھارت کے ایک اخبار میں 1920 میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں سوشلسٹ خیالات کو قومیت کی ترقی، قوم پرستی اور فرد کی آزادی کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی۔ مظفر اس وقت اس اخبار کے ساتھ قریبی طور سے منسلک تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مضمون کوئی بھی مرکزی نظریاتی حیثیت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔

بانگیا مسلمان ساہتیا پتریکا میں اسی سال مظفر احمد کا ایرانی صوفی کے بارے میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں درویش کی آزادانہ فکر کی تحریک پر زور دیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ اسلامی تقلید پسندی اس پہلو کی قدر دانی نہیں کر سکی۔ یہ اصلاح پسند حیثیت، مذہب کی بورژوا انسان دوست تفریط سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی جو آزاد خیال بنگالی مسلم دانشوروں کے ایک حصے میں پروان چڑھ رہی تھی۔ فکر کا یہ مخصوص تار کمزور رہا۔ قومیت کی شعلہ رو دلچسپیوں، سیاسی سمتوں کی نشاندہی، یک محدود قومیت کی بے اطمینانی اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی شناخت کی سماجی ضرورت کے فقدان کی نشاندہی تھی۔

بنگالی مسلمان آزاد خیال اصلاح پسندوں کے ساتھ مظفر کا تعلق مختصر ثابت ہوا۔ 1918-19 میں اس کے مضامین، جنس اور کمیونٹی کے بارے میں اس فیصلے کی قدامت پسندی اور آزاد خیال پوزیشنوں کا بیک وقت اظہار کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اس کے سیاسی عمل کے لیے ایسا راستہ حاصل نہ کر سکا جو اس کے لیے قابلِ قبول ہو۔ جنگ کے بعد کے انقلابی خیالات نے مظفر کے سماجی مقام میں واضح تبدیلی پیدا کی اور وسیع طبقاتی تنازعوں کے درمیان پیچیدہ باہمی عوامل نے اس کی کئی مشکلات کو حل کر دیا۔ اصلاح پسند انفرادیت پسندی، اپنی قابض بورژوا شخصیت کے وعدے کے ساتھ، اسے مزید اپیل نہ کر سکی۔

ناطے جو پیوستہ رکھتے ہیں

اگرچہ مظفر نے بنگالی مسلم دانشوروں سے ذہنی مماثلت پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کی تاہم ان سے اس کی بیگانگی میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ وہ ادبی سوسائٹی کے اخبار کے سرنامے سے بھی خوش نہیں تھا۔ اس نے 1918 میں یہ تجویز دی کہ اسے دفعہ داری شناخت کی بجائے آزادانہ نام دیا جائے۔ لیکن سوسائٹی کے صدر کی سوچ اس کے برعکس تھی۔ اس نے مسلمان قارئین کی توجہ حاصل کرنے پر زیادہ زور دیا۔ مظفر کو اس فکر کی تائید کرنی پڑی کیونکہ، اس کے بقول، ''ہم اپنے پرانے صدر کو کھو دینے کے لیے بالکل تیار نہیں تھے''۔ تاہم دو برس کے بعد اس نے اس تجویز کی مخالفت میں، مسلم شناخت کے ساتھ واضح تعلق رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہی فیصلہ اس وقت کے نمایاں بنگالی مسلم سیاستدان اے۔ کے۔ فضل الحق نے بھی کیا تھا۔

وہ افراد جوان معاشروں کے آخری سروں پر تھے، 1917 کے روسی انقلاب کے باعث اپنے ترک کردہ انقلابی دھاروں کی جانب مائل ہو گئے۔ اغلب امکان ہے کہ یہی عمل، بالخصوص اس کی سماجی اور سیاسی قوت فیصلہ کے باعث، نمایاں قوم پرست شخصیتوں پر مظفر اعتماد کے خاتمے کا باعث بنا۔ 19-1918 میں مظفر کی قاضی نذر السلام سے خط و کتابت اور ملاقات کو بھی اسی پس منظر میں لیا جا سکتا ہے۔ نذر السلام نے رضا کارانہ طور پر نوآبادیاتی فوج میں کام کیا تھا اور وہ برطانوی ہندوستان کے شمال مغربی صوبے میں نوآبادیاتی مخالف خطوط پر چلتے ہوئے بتدریج سیاست کی طرف مائل ہوتا چلا گیا۔ یہ جغرافیائی خطہ، جو کہ نوآبادیاتی ریاست کے لیے اندیشے کا ماخذ تھا، سرکاری طور پر بالشوازم اور بین الاقوامی اسلام کے درمیان خطرناک رابطے کی حیثیت سے دیکھا جاتا تھا۔ بالشویک فتح کی اطلاع نذر السلام تک پہنچی تو اس نے اس سے متاثر ہو کر ایک کہانی ''کرب کا تحفہ'' لکھی جسے مظفر نے 1920 کے آغاز میں ادبی سوسائٹی کے اخبار میں شائع کیا۔ سنسر شپ سے محفوظ رہنے کی خاطر مظفر نے نذر السلام کے سرخ فوج سے تعلق اور توصیفی حوالہ جات کو تبدیل کر دیا تاہم وہ اس کے سرخ فوج کے تعلق سے متاثر تھا۔

پانیترا گنگو پدھیا جو کہ درمیانی درجے کے ہندو پس منظر سے متعلق تھا، 1919 میں مظفر سے ملا اور زندگی بھر کے لیے اس کا دوست بن گیا۔ وہ مظفر سے اس لیے متاثر ہوا کہ مظفر میں بااثر شخصیات کی مخالفت کا رجحان تھا۔ دونوں کی سماجی صورتحال ایک جیسی تھی۔ گنگو پدھیا مظفر کی طرح ایک نچلے طبقے کا جدوجہد میں مصروف مصنف تھا جس کا انحصار ہندو ادبی حلقوں کی معروف شخصیات پر تھا۔ جب کوئی اختلافی معاملہ سامنے آتا تو وہ خاموش رہتا یا اس کی تائید کرتا۔ ایسے ہی اختلافی امور میں سے ایک معاملہ، برطانوی جنگی کوششوں میں ہندو بنگالی دانشوروں کے ایک حصے کی شرکت کی حمایت کا تھا۔ گنگو پدھیا، کانگریس قیادت کی حکومت سے وفادارانہ پالیسیوں سے بہت مایوس تھا۔ بالشویک انقلاب کی کامیابی کے باعث یہ دونوں، نوجوان دانشوروں میں غیر رسمی سیاسی بحث کا حصہ بن گئے تھے۔ بالشویک انقلاب ایک ایسا واقعہ تھا جس کا انہوں نے بعینہ خیر مقدم کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ برطانوی حکومت اس انقلاب کے خلاف تھی۔

انقلاب کے سائے

انقلابی خیالات کے اجزا کو ان کے دانشورانہ ماحول میں دیکھا جا سکتا تھا۔ ان خیالات نے اور بالخصوص ان کے ابھرتے ہوئے انقلابی مزاج نے، بالواسطہ اور بلاواسطہ ہر دو طرح سے ان کی ان اختیارِ مطلق مخالف کیفیات کی حوصلہ افزائی کی جنہیں نظر انداز کردہ شخصیات نے بھی اپنانا شروع کر دیا، جو اپنے بزرگوں اور معاشی لحاظ سے اپنے سے بہتر لوگوں کے ساتھ متفق نہیں تھے۔

جنگ سے پہلے ہی سے، مظفر کی ثقافتی دنیا میں مارکس اور مارکس ازم سے لگاؤ موجود تھا۔ 1912 میں مظفر احمد کے مضامین کی بنگالی اور انگریزی قلب ماہیئت ''ایک کامیاب مسلمان طالبِ علم''، ہراباشی اور ''ماڈرن ریویو'' نے شائع کر دی تھی۔ اس سال ''ماڈرن ریویو'' نے قوم پرست انقلابی لالہ ہر دیال کا کارل مارکس پر لکھا ہوا مضمون شائع کیا۔ جنگ کے آخری ایام کے دوران انقلابی روس کے سنسر شدہ تمثالی پیکروں نے بھی جھانکنا شروع کر دیا جس کے باعث دانشوروں کے سوشلزم کی طرف جھکاؤ کے زیادہ سنجیدہ رجحان کے لیے زمین تیار ہو گئی۔ فروری کے انقلاب پر ایک برطانوی فلم اپریل 1917 میں عام لوگوں کے دیکھنے کے لیے ایک نمائش میں پیش کی گئی جو زار کی حکومت کے الٹنے اور آزاد خیال جمہوریت کے قیام کے جشن کے سلسلے میں منعقد کی گئی تھی۔ اکتوبر کے بعد سے یورپین اخباروں بالخصوص سٹیٹس مین نے، جو نوآبادیاتی سرمائے کی آواز تھا، انقلاب کی مذمت شروع کر دی۔ سنسنی خیز اشاعتی مواد بھی، جس کی بنیاد مغربی صحافت تھی، گردش میں تھا۔ مظفر نے خود بھی سوشلزم پر رسالہ نکالا جو 1919 میں ہندی زبان میں شائع ہوا۔ ''ہراباشی'' پہلا اخبار تھا جس نے روس کے 1917 کے انقلابی واقعات کے بارے میں پرجوش انداز میں لکھا۔ 1918 میں دوسرے انقلابی جریدوں نے بھی، جن کی ادارت ہندو دانشور کر رہے تھے، بالشویک تحریک کی جانب مثبت رجحانات کا اظہار شروع کر دیا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان خیالات نے مظفر جیسے لوگوں کو کس حد تک متاثر کیا تاہم یہ جریدے پڑھے جاتے تھے اور ان میں شائع شدہ بہت سے مضامین، بنگالی مسلم ادبی رسالوں میں دوبارہ شائع کیے گئے۔ مظفر کا ''ہارا باشی'' سے براہِ راست تعلق ریکارڈ پر موجود ہے۔

جڑ سے اکھڑی ہوئی اجتماعیت

مظفر کی، شہری ماحول میں لکھی گئی ابتدائی تحریروں میں جو دیرپا اور طویل حب الوطنی کا عکس تھا اس نے تجردپسندانہ شناخت کی وسعت کے ماخذ کا کام کیا۔ اس کا تعلق انفرادی بہتری کی بنیاد سے تھا جو دیہی دانشوروں کے ذریعے سرمایہ دارانہ جدت پسندی کی تلاش کے مفہوم میں تھی۔ ''ایک کامیاب مسلمان طالبِ علم کی تعلیمی لیاقت کی بے حد تعریف'' تب لکھی گئی جب مظفر ابھی دیہی علاقے میں رہتا تھا۔ یہ تحریر اس کی خواہشات کی آئینہ دار تھی۔

سینڈوپ اور نواکھلی میں افرادی ترقی کے راستے بہت محدود تھے۔ مقامی حب الوطنی اور انفرادی بہتری کی منطق، سرمایہ دارانہ فکر کے ظہور کے طور پر دیکھی جاسکتی تھی۔ ایک جیسے پس منظر کے لوگوں کے باہمی ربط کی ضرورت نے مظفر کو نواکھلی کے کچھ طلبا اور سینڈوپ کے نچلے طبقے کے مسلمان کشتی رانوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کا موقع دیا۔ بنگالی مسلم ادبی سوسائٹی میں اس کا ساتھی شاعر غلام مصطفےٰ تھا جو 1916 میں نواکھلی یونین کا اسسٹنٹ سیکریٹری تھا۔ اس یونین کی تشکیل بہت عرصہ پہلے 1905 میں کلکتہ میں نواکھلی کے ترکِ وطن کرنے والے لوگوں نے کی تھی۔ ''مینہ را کمار گھوش'' نامی ایک نوجوان اس تنظیم کا سکریٹری تھا جس کا تعلق ایک بڑے بنگالی ہندو جاگیردار خاندان سے تھا۔ اس نے سماجی مساوات کی اہمیت کو سمجھا اور 1916 میں ایک ماہانہ رسالے کا اجرا کیا جس کا نام ''نواکھلی'' تھا۔ رسالے نے ہندو اور مسلمان مصنفین کو، جن میں زیادہ تر دوسرے اضلاع سے تعلق رکھنے والے طالب علم اور دوسرے نوجوان لوگ شامل تھے، متعارف کرایا۔ پہلا شمارہ مظفر احمد کی تعارفی نظم سے شروع ہوا جس کا عنوان ''ابا جان'' (اہدیش، نیکی تحریک) تھا۔ اس نظم میں ضلع کی تاریخی عظمت کو بیان کیا گیا۔ مظفر نے اپنے سینڈوپ میں سکول قائم کرنے کے لیے سرکاری منظوری حاصل کرنے کی کوشش بھی کی اور اس منصوبے کے لیے فنڈز کے حصول کی سعی بھی کی۔ فوری مفہوم میں دیکھا جائے تو علاقائی تعلقات کی بنیاد پر استوار تنظیموں میں ضروریات کی کمی تھی جنہیں خاص طور پر صرف درمیانے طبقے کے مسلم بنگالی ماحول میں حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔ یہ تنظیمیں ابتدائی طور پر صنعتی تعلقات اور علاقائی وفاداری کے مفہوم میں بنائی گئیں لیکن ان میں، اپنی سماجی ترکیب کی بنا پر ایک دوسری شناختی فکر کی جڑیں بھی موجود تھیں جنہوں

نے آئندہ چند سالوں میں مظفر کو کہیں اور لے جانا تھا۔

مظفر خود ایک ایسے ماحول میں پیدا ہوا تھا جہاں زیادہ حساس طبقہ نمایاں تھا۔ اسی کے اثرات تھے کہ مظفر نے مساواتی خطوط پر سماجی اختلاف کا اظہار کیا جیسا کہ اس کی، نوا کھلی میں شائع ہونے والی ابتدائی نظم سے ظاہر ہوتا ہے، جو مقامی حب الوطنی کے موضوع پر ایک کوشش تھی۔ اس نظم کے بعد ایڈیٹر کی جانب سے ایک مضمون تھا جس میں بنارس ہندو یونیورسٹی قائم کرنے پر حکومت پر نکتہ چینی کی گئی تھی کہ یہ اقدام محض بالائی ہندو طبقے کے ظلم میں مزید مضبوطی پیدا کرے گا اور صرف انہیں فائدہ پہنچائے گا جو مذہب کو بحیثیت کاروبار استعمال کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ اس یونیورسٹی کا قیام ان تعلیمی کوششوں کو تہہ و بالا کرے گا جو نچلے طبقے کے مزدوروں اور کسانوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے انتہائی ضروری ہیں۔

اس طرح کے اظہار نے دوسرے پرولتاریت مخالف اور مطلق حکمرانی مخالف خیالات کے ساتھ مل کر، دانشوروں کے نوجون اراکین کے درمیان موجود ایک الگ ''طبقاتی جزو'' کے ظہور کی نشاندہی کی۔ یہ دانشور ایک ایسے عظیم سماجی گرداب کی جانب راغب تھے جو ان کی اپنی طبقاتی بنیاد کو چیلنج کرتا تھا۔ کچھ لوگوں کے نزدیک یہ رغبت، اس طبقاتی جزو کی، سرپرستانہ ''ہمدردانہ حفاظتی نظام'' کی جانب واپسی کی نشاندہی تھی۔ دوسروں کے لیے یہ ایک ایسی انقلابی سوچ تھی جو نظریاتی تسخیر کی منزل کی جانب تیزی سے رواں دواں تھی۔

کلکتہ کا عرشہ اور ملاقاتی

علاقائی تعلقات اور شناختیں بھی مظفر کو محنت کشوں کی سمت کھینچ رہی تھیں۔ مظفر کے تعلقات 1910 ہی سے کلکتہ کے عرشے کے محنت کش لوگوں سے تھے۔ 1915 کے موسم گرما میں اس نے کدر پور کی بندرگاہ کے علاقے میں واقع ایک مدرسے میں تعلیم دی تھی۔ چونکہ اس کا مقامی جزیرہ سینڈوپ بذات خود مچھیروں پر مشتمل تھا چنانچہ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ ان سے رابطہ رکھتا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا بنیادی مقصد اپنے گھر اور علاقے کے حالات سے باخبر رہنا ہو لیکن یہ رابطہ اس کے لئے ان حالات سے آگاہی اور دلچسپی کا سبب بنا جن میں یہ مچھیرے کام کرتے تھے۔ جنگ کے بعد، پولیس کی مرتب کردہ ایک رپورٹ سے، جو عرشے میں ٹریڈ یونین ازم

پر تھی، معلوم ہوتا تھا کہ مشرقی بنگال میں چٹا گانگ اور نواکھلی سے آئے ہوئے مچھیروں کی اکثریت مفلوک الحال مسلمانوں پر مشتمل تھی اور انہیں کام اور رہائش کے سلسلے میں استحصال کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ ان کی اجرتوں کا بڑا حصہ غصب کرلیا جاتا۔ جہازراں کمپنیاں اس استحصال پر نہ صرف خاموش رہتیں بلکہ دلالوں کی حوصلہ افزائی کرتیں۔ اس طرح ان کی قوت اور اختیار، مچھیروں کی اجتماعی سودے بازی کی طاقت کو کمزور کردیتا تھا۔ یہ استحصال بندرگاہ کے علاقے میں ٹریڈ یونین کی بیداری اور حوصلہ افزائی کا باعث بنا۔ کشتی بانوں نے 1918 میں تنظیم بنا کر جہازراں کمپنیوں اور دلالوں کے خلاف جنگ کی اور بالآخر اپنے لیے کام کے بہتر حالات اور معقول اجرت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

کلکتہ کی بندرگاہ کی آبادی کا تین چوتھائی حصہ مسلمانوں پر مشتمل تھا جنہوں نے برطانوی جنگی کوششوں میں اہم کردار ادا کیا۔ بندرگاہ شہری سرمائے کی سرگرمی کا اہم حصہ تھی۔ اٹھارہویں صدی کے آخری حصے میں قائم ہونے والی یہ بندرگاہ، نوآبادیاتی علاقوں سے اضافی سرمایہ حاصل کرنے کے لئے ایک ناگزیر حیثیت اختیار کرچکی تھی۔ ریاست کے قیام کے بعد 1892 میں کدر پور کی بندرگاہ کا منافع تیزی سے بڑھنا شروع ہوگیا۔ اسے پانی کے راستے اور ریل کے ذریعے براہِ راست ''ہوگلی'' کی گودی سے ملادیا گیا جس سے بحری جہازوں کی آمدورفت میں بہت بہتری ہوئی۔ ہوگلی ابھرتا ہوا صنعتی کمپلیکس تھا۔ بجلی کی ایک ٹرام سروس کے ذریعے اسے براہ راست تجارتی مرکز سے ملادیا گیا۔ اس کے گھاٹ اور شیڈ اس وقت بھی بجلی کی روشنی سے منور تھے جب کلکتہ کی بڑی شاہراہیں تک گیس سے روشن کی جاتی تھی۔ اپنی تعمیر کے آٹھ سال کے اندر اندر کلکتہ میں تمام نوآبادیاتی عوامی سہولتوں میں یہ سب سے زیادہ منافع بخش منصوبہ تھا۔ اس دور کا ایک مبصر اس منصوبے کی تعریف کرتا ہے اور ان عظیم جہتوں کو واضح کرتا ہے جن کی بدولت پچھلے دوسو سال میں کلکتہ، دریا کی کبھی نہ رکنے والی مکارلہروں کے باوجود، ایک فیاض، مکمل طور پر طاقت ور اور یونین جیک کی دنیا میں نفوذ کردینے والی حفاظت کے سائے میں تجارت کی اولیں منڈی کے موجودہ مقام پر پہنچ گیا ہے۔

لیکن یہ فیاض، مکمل طور پر طاقتور اور دنیا میں نفوذ کرنے والی یونین جیک کی حفاظت، بندرگاہ کے ان محنت کشوں تک نہ پہنچ پائی تھی جو اس بہت بڑے منصوبے کو رواں دواں رکھنے میں اپنا خون

پسینہ، جوانی اور طاقت جلا رہے تھے۔ کدر پور غریب ترین محلوں میں سے ایک تھا جہاں زندگی کا معیار بدترین اور خستہ ترین حالت میں تھا۔ کلکتہ میں عوام کی صحت کے اعداد و شمار بدترین سطح تک گر چکے تھے جو مایوس کن مادی حالات کا نتیجہ تھے۔ نوآبادیاتی حکمرانوں کا سب سے بڑا مسئلہ شہر کی شتر بے مہار کی طرح پھیلنے والی آبادی تھی۔ منصوبہ بندی کے فقدان نے موت کے مستقل سائے میں بستی ہوئی آبادی کو نظر انداز کر دیا تھا۔ انیسویں صدی کی دوسری دہائی کے پورے عرصے کے دوران، جس میں جنگ اور مابعد کے فوری اثرات شامل تھے، کدر پور شہر کا سب سے گندہ محلّہ رہا۔ پورے کلکتہ کی نسبت کدر پور شہر میں شرح اموات سب سے زیادہ تھی۔ کلکتہ کارپوریشن کی شائع کردہ ایک انتظامی رپورٹ میں بندرگاہ کو مضر صحت حالات کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے اسے ایک ایسی جگہ کہا ''جو مکھیوں سے بھری ہوئی تھی''۔

ان حالات میں یہ ناقابل توقع نہیں تھا کہ کدر پور کا شہر انفلوئنزا کی وبا کی زد میں آ جائے۔ طاعون اور چیچک کے ساتھ، انفلوئنزا نے 1918 میں کلکتہ پر حملہ کیا۔ پہلی عالمی جنگ کے اختتامی عرصے میں، تمام دنیا میں پھیلا ہوا انفلوئنزا، سمندر کے راستے اس شہر تک پہنچا جہاں سے اس نے کدر پور میں سرایت کی اور سب سے زیادہ شرحِ اموات بھی یہیں پر ریکارڈ کی گئیں۔

استحصال، غربت اور متعدی امراض کے پنجے میں جکڑا ہوا یہ محلّہ، 21-1920 کے دوران شہر بھر کے مزدوروں کے احتجاج کے زندہ دل مراکز میں سے ایک ثابت ہوا۔ یہ وہ عرصہ تھا جب مظفر مزدوروں کی سیاست اور سوشلزم کی جانب رواں تھا۔ مظفر پہلے سے ہی مچھیروں کی برادری، ان کے چند قائدین، ادبی اور سیاسی حلقوں کے اردو اور بنگالی دانشوروں کو، ایک دوسرے کے جزو لاینحل کی حیثیت سے جانتا تھا۔

انفلوئنزا کی عالمگیر بیماری کے متاثرین کی اکثریت، میونسپل محلے میں رہتی تھی جہاں محنت کش طبقات کی غالب اکثریت تھی۔ 1916 میں کلکتہ کے ایک عام باسی کی، یورپ کے باسیوں کی نسبت ان معنوں میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ جنگ کی پیدا کردہ اشیائے ضرورت کی شدید کمیابی نے کلکتہ کے رہائش پذیران کو انتہائی مشکلات میں دھکیل دیا اور اس مرض زدہ شہر کو بے آس و امید کر دیا۔ ضروری بلکہ لازمی اشیائے ضرورت، مثلاً چاول، گندم، نمک، خوردنی تیل اور کپڑوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ اس گرانی نے درمیانے طبقے کے کفیل افراد کے لئے بھی

حالات کو مخدوش کر دیا۔ مضطرب مسلمان آبادی کے نزدیک اہلِ ثروت ہی ذخیرہ اندوزی اور قحط کے ذمہ دار تھے۔ کپڑے کے لئے فسادات کا آغاز، اردو بولنے والے، نیم باروزگار، غریب مسلمانوں نے کیا جن کا ہدف غیر بنگالی امیر ہندوؤں کا ایک طبقہ تھا۔ یہ امرتسر کی منتشر قومیتوں کے درمیان مخاصمت کو منعکس کرتا تھا۔ اگلے سال تک یہی حصہ نوآبادیاتی نظام کے خلاف اپنی قوت کو متحد کرنے والا تھا کیونکہ اس وقت تک اس نے اپنی مشکلات کی بنیادی وجہ کی شناخت کر کے تبدیل شدہ سیاسی پسِ منظر میں قومیت پرست عوامی تحریکوں (فوجوں) کی سماجی مرکزیت کا اظہار کیا تھا۔

بے ترتیبی اور تغیر

جنگ کے دوران اور فوراً بعد محنت کشوں کے حالات اور مشکلات نے مظفر کو بلاواسطہ سیاست کے قریب کر دیا۔ نوآبادیاتی حکومت سے خاموش بدمزگی کے باعث وہ مقابلے تصادم کی سرگرمیوں کے دائرہ کار میں آ رہا تھا۔ بالآخر وہ نوآبادیاتی سرمایہ کی حکومت کی کھلم کھلا مخالفت کی جانب آ گیا۔ اس کے نتیجے میں اس نے عظیم نوآبادیاتی مخالف قوم پرست سیاست اور تجرد پسندانہ مذہبی و گروہی اور لسانی شناخت کے دعوؤں سے تند و تیز انتشار کی جانب پیش قدمی کی۔

1919 مظفر کی زندگی کا نقطۂ تغیر تھا۔ وہ جس ماحول میں رہتا تھا وہ جنگ کے بعد نوآبادیاتی مخالف بغاوت کی جانب تیزی سے مائل ہوا لیکن وہ کسی موجود سیاسی اختیاری حق کے ساتھ وابستہ ہونے سے ہچکچاتا تھا۔ یہ پورا عرصہ اس نے اس اندرونی بحث میں گزارا کہ کیا اسے ہمہ وقتی ادبی سرگرم کارکن رہنا ہے یا سیاست میں داخل ہونا ہے۔ 1920 میں اس کی سوچ نے نوآبادیاتی مخالف سیاست کی حمایت میں فیصلہ دے دیا اور یوں اس نے سیاسی صحافت کا آغاز کیا۔ اسے محنت کش طبقات کی سیاست میں شامل کر لیا گیا جو کہ کلکتہ اور اس کے گرد و نواح کی یورپین آبادی اور ہندوستانی فیکٹری مالکان کے خلاف تھی۔

ان سرگرمیوں نے اس کی دلچسپی سوشلسٹ لٹریچر میں بڑھا دی اور 1921 میں اس نے کمیونسٹ تنظیم بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے وہ سماجی تعلقات اور وابستگیاں، جو جنگ کے دنوں میں قائم ہوئی تھیں، کسی حد تک اس کے مددگار تھیں۔ قاضی امداد الحق نے گورنمنٹ ملازم ہونے کے باوجود اس کا ساتھ دیا اور ممکنہ جبر کو، جس میں پولیس کی پریشان کن دھمکیاں بھی شامل تھیں، نظر

انداز کر دیا۔ 1923 کے دوران جب، مظفر بنگال کی جیل میں واحد ''سرکاری قیدی'' کی حیثیت سے بند تھا تو امداد الحق اسے کھانے پینے کا سامان فراہم کرتا رہا۔

جانی پہچانی گلیاں، مختصر راستے اور کالج سٹریٹ میں واقع رہائشی مکانات، پولیس کی دستبرد سے بچ نکلنے کا بڑا ذریعہ تھے۔ جنگ کے زمانے میں شہر کی نگرانی پر مامور لوگ بعد ازاں مظفر کے سیاسی ساتھی بن گئے۔ ان میں سے ایک برطانوی سپاہی جے۔ ڈبسو جون سٹن بھی تھا جو جنگ کے زمانے میں کلکتہ میں تعینات تھا اور 1928 میں اسی شہر میں مقیم تھا۔

مظفر احمد اپنے پیچھے دیہی زندگی کا طویل سلسلہ چھوڑ کر آیا تھا جہاں سماجی شناخت کے کمیونل، قوم پرست اور گروہی ولسانی اجزا ابھی تک باضابطہ سیاسی مرکز نہیں بن پائے تھے۔ تاہم شہر میں مظفر کی سیاسی حیثیت نے زیرک روپ اختیار کرنا شروع کر دیا۔ اس عمل میں اس کے شہری سماجی ماحول اور اس کے ان سیاسی رجحانات نے، جو پہلی عالمی جنگ میں کلکتہ کے دانشوروں کے دل کو چھو چکے تھے، وسیلے کا کام دیا۔

ایک ایسا نظر انداز شدہ نوآبادیاتی شہر کی، جس نے جنگ کے دنوں میں مادی کمیابی، ریاستی جبر اور نسلی تشدد کا سامنا کیا ہو، ایک انتہا پسند رعیت کے طور پر ذاتی آگاہی، نوآبادیاتی نظام کے لیے ایک شدید اور مایوس سماجی دشمنی میں بدل سکتی تھی۔ چنانچہ شہر میں کیے گئے ظالمانہ تجربات کے باعث، آنے والے سالوں میں سیاسی عمل کے لیے زرخیز زمین تیار ہو گئی۔ جنگ کے عرصے میں ایک نظریاتی ما ل مہیا ہو چکا تھا جس میں نوآبادیاتی ریاست کی پالیسیوں کے باعث پیدا ہونے والی بیگانگی اور لاتعلقی نے کچھ مدت کے لیے عظیم دھارے کی قوم پرستی، جس میں ہندو ملکیتی طبقات کی برتری شامل تھی، اور مسلمان دانشوروں کے درمیان ایک پل کا کام کیا۔

اس عہد کی ثقافتی تحریروں میں مسلم دانشورانہ فکر کی بہت سی جہتیں جس قدر نمایاں تھیں اتنی کہیں اور نہیں تھیں۔ اس سے مسلسل شناختی تشکیل اور واضح بحران کی نشاندہی ہوتی تھی۔ جنگ کے بعد کے عرصے میں سامراج مخالف عوامی بغاوت اور مزدوروں کی بیداری نے اندرونی اور بیرونی طور پر جدلیاتی انفعال کو سہل بنا دیا جس سے مسلمان دانشوروں کے سامنے مختلف نظریاتی حقوق میں سے، جن میں سوشلسٹ (اشتراکی) متبادل بھی شامل تھا، پسندیدہ حق کا انتخاب آسان کر کیا۔

اختتامیہ

جنگ کے فوری بعد کے عرصے میں (1919-21) مظفر کی سیاسی صحافت سے مکمل وابستگی، اس کی بائیں بازو کی جانب مکمل سیاسی تبدیلی میں اہم کردار کی حامل تھی۔ اس کی اہم وجہ کلکتہ میں محنت کش طبقات کی بغاوت اور روسی انقلاب کی کامیابی کے باعث مظفر اور اس کے کچھ ہم عصروں پر سوشلسٹ خیالات کے مرتب شدہ اثرات تھے۔ ذات کی تبدیلی اور تغیر جنہوں نے اس نئی سیاسی شناخت کو جنم دیا، اسی پس منظر کا نتیجہ تھے۔ اس کی وجہ نوآبادیاتی مخالف سیاست کی موجودہ ساخت سے مکمل غیر وابستگی کا پیچیدہ عمل تھا اور یہ اس بات کا اظہار بھی تھا کہ مظفر اب عظیم دھارے کے قائدین کے نقطۂ نظر اور ان کے غالب نظریات سے، جن کی وہ نمائندگی کرتے تھے، کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

کلکتہ میں پہلا سوشلسٹ مرکز 1922 میں ظہور پذیر ہوا جس کا کلیدی انتظام مظفر کے پاس تھا۔ اس کے تیسری انٹرنیشنل کے ساتھ تعلقات، ممنوعہ سیاسی لٹریچر کی اشاعت اور دوسرے نوآبادیاتی مخالف انقلابیوں سے روابط، 1923 میں اس کی گرفتاری کا باعث بنے۔ اگلے سال اسے کان پور بالشویک سازش کیس میں مقدمے کا سامنا کرنا پڑا۔ مظفر کو 1925 میں رہا کیا گیا۔ وہ 1926 کے آغاز ہی میں کلکتہ چلا گیا تاکہ وہ بنگال کی پہلی سوشلسٹ تنظیم میں شامل ہو سکے اور اس کی سرگرمیوں میں حصہ لے سکے۔ 1913 سے 1929 کے درمیان مظفر احمد کی سیاسی بالیدگی، ہندوستان اور دنیا بھر کی سماجی اور سیاسی تاریخ میں ایک اہم ہیئت کے قیام کے ساتھ مطابقت کی حامل ہے۔

یہ دو سال سامراجی اور سرمایہ دارانہ تاریخ کے دو بحرانی نقاط کو ملاتے ہیں۔ پہلا بحرانی نقطہ 1913 کی پہلی عالمی جنگ ہے اور دوسرا نقطہ، 1929 میں ہونے والی خانہ جنگی ہے جس کی وجہ سے عالمی بے سکونی اور مایوسی کی کیفیت پیدا ہوئی۔ یہ اس عرصے کا احاطہ کرتے ہیں جس میں سوشلسٹ خیالات اور کمیونسٹ سرگرمی دنیا کے مختلف حصوں میں عموماً پہنچنے لگی تھی۔ بالشویک انقلاب کی کامیابی اور تیسری کمیونسٹ انٹرنیشنل کی تشکیل نے سوشلزم اور اس کی نظریاتی بنیادوں کو براہِ راست تقویت دی۔